پیپلز ہسٹری آف بلوچستان

جلد 3

قبائلی اور فیوڈل عہد

شاہ محمد مری

ضابطہ

کتاب: قبائلی اور فیوڈل عہد
مصنف: شاہ محمد مری
پہلا ایڈیشن: 1999ء
دوسرا ایڈیشن: 2010ء
تیسرا ایڈیشن: 2016ء
چوتھا ایڈیشن: 2021ء

اولاد کو تربیت دینے والی اُس حسین بلوچ روایت کے نام،
جس کے تحت معمر شخص جس بھی بچے کو دیکھتا ہے تو اُس سے اس کا نام پوچھتا ہے، پھر باپ کا نام، باپ کے باپ کا نام، اُس کے باپ کا نام۔۔۔۔
اور یوں بچے کو سات پشتوں تک اپنا سارا شجرہ زبانی بتانا ہوتا ہے۔

فہرست

پیش لفظ

بلوچ پاکستان، ایران اور افغانستان کے تکون کی تشکیل بھی کرتا ہے اور تکون کے ہر زاویہ میں شامل بھی ہے۔ اِس مخصوص جغرافیہ میں وہ ماضی میں زیادہ تر بھیڑ پالی اور خشکابے کی کھیتی باڑی کرتا رہا۔ یوں خانہ بدوشی سے اُس کی بنیاد پڑی۔ البتہ بہت بعد میں پاکستانی بلوچستان میں ڈیڑھ ڈویژن میں خالص نہری زمینداری ہونے لگی۔ اسی طرح مغربی افغانستان میں وہ صوبہ نیمروز میں ہلمند دریا کے ساتھ ساتھ زمین داری کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ تقریباً سارا پاکستانی اور ایرانی ساحلی علاقہ بلوچ کی ملکیت ہے۔ یوں وہاں سمندری حیات اُس کا ذریعہ روزگار رہی ہے۔

بلوچ اپنی شناخت کے بارے میں بہت حساس ہے۔ ہر نارمل انسان کی طرح وہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے آباؤ اجداد کا تذکرہ ہو، اور احترام کے ساتھ ہو۔

حالاں کہ انسان تو ہوتا ہی اشرف المخلوقات ہے۔ یہ نسل اور خون کا خالص، نا خالص ہونا تو بس گپ ہے جو حاکم اور زور آوروں نے قائم کر رکھی ہے۔ اصل میں تاریخ کے اندر بہت عرصہ بعد کہیں جا کر ''اصل اور نقل''، ''خاندان اور کمینہ'' کا تصور پیدا ہوا۔ بدقسمتی دیکھیے اس کا پیمانہ، فیوڈل حکمرانوں اور اُن کے دانشوروں شاعروں بھانڈوں نے ''پیشہ'' کو بنا دیا۔ عجوبہ دیکھو؛ لوہے اور سونے کا کام کرنے والا کمی کمینہ ہے، میوزی شن، لباس بُننے والا، اور زلف تراش کمینہ قرار دیے گئے۔ لیکن جو کچھ کام نہ کرے اور دوسروں کی محنت پر پلے وہ خان صاحب، میر صاحب، پیر

صاحب،اصل اور خاندان کہلائے ! لطیفے ہیں بھئی ۔ اِن غیر حقیقی باتوں کو سنجیدہ بنانے والوں کے خلاف ہی تو ساری جنگ رہی ہے سنجیدہ لوگوں کی ۔

ایک دوسری بات ! بلوچ پر لکھنے والے آج تک کے سارے مؤرخوں نے ڈنڈا لے کر بلوچ کو بھگائے رکھا ۔ اُسے سکون اور سکونت نصیب ہی نہ ہونے دی ۔ کسی نے ''بھئو'' کہہ کہ اُسے کیسپین سی سے دوڑا دیا ، کسی نے حلب سے اس کی دُڑ کی لگوادی اور کسی نے ڈنڈا لے کر اُسے فارس سے بھگا دیا......

ہم آرکیالوجی کی نئی اٹل دریافتوں اور اپنی دلیلوں کی عاجزانہ ٹوکری لے کر اُن سب سے الگ نظریہ لے آئے ہیں ۔ وہ یہ کہ ، بلوچ کی اکثریت کبھی بھی اور کہیں سے بھی مہاجرت کر کے نہ آئی ۔ بلکہ ہزاروں برسوں سے یہی اُن کا وطن رہا ہے اور یہی اُن کا وطن ہے ۔

غلط فہمی کا ایک تخم یہ ڈال دیا گیا کہ بلوچ گویا دو الگ الگ نسلوں یعنی دراوڑ اور آریا سے بنے ہوئے ہیں ۔ چنانچہ شرق و غرب کے دانش ور، مؤرخ اور پروفیسر سب اس تھیوری کو سچ ثابت کرنے دوڑ پڑے ۔ کسی نے اِس کی کھوپڑی ناپنا شروع کر دی تو کسی نے اس کی ناک کو تولنا شروع کر دیا ۔ کسی نے اس کے دانتوں کے بیچ فاصلے کو بیان کیا تو کسی نے اس کی زبان کا آریائی دراوڑی میں بٹوارہ کر دیا ۔ حتیٰ کہ ''دراوڑستان'' تک قائم ہونے لگا ۔ مگر بابرکت آرکیالوجی کی مدد سے ایک مہر گڑھ کی دریافت نے اِن سب فرسودہ ترازوؤں کو توڑ کر فرسودگی کے میوزیم میں بند کر دیا اور اُن کے فُٹہ اور ٹیپ کو تاریخ کی ردی ٹوکری میں پھینک دیا ۔

ایک اور مفروضہ یہ ہے کہ قبائل روزِ اول سے موجود تھے اور ابد تک اسی طرح قائم رہیں گے ۔ یہ غلط تصور ہے ۔ قبیلہ نہ ازل سے موجود تھا اور نہ ابد تک قائم رہے گا ۔ سچ یہ ہے کہ ہر قبیلہ کسی انسانی گروہ کے بہت سست رفتار ارتقائی سفر کے دوران صورت پذیر ہوا ۔ آج کے ہمارے سارے اہم قبائل ابھی حال ہی میں تشکیل پائے ہیں ۔ آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مری، بگٹی ، مینگل سے لے کر لُنڈ ، لیغاری ، بزدار ، بلیدی اور جکھرانڑیں تک سارے اہم قبائل کا ذکر ہمیں قدیم بلوچی شاعری میں کہیں نظر نہیں آئے گا ۔ یعنی ابھی سولہویں صدی کی رِندی عہد تک کی بلوچی شاعری میں آپ کو اِن

قبائل کا ذکر تک نہیں ملتا ۔ کیوں ؟ اس لیے کہ یہ سب قبائل بعد میں بن گئے ۔

اور پھر یہ بھی نہیں ہوتا کہ قبیلہ ایک بار بن گیا تو اب اُس میں کوئی شکست و ریخت نہیں ہوسکتی ۔ بات اس کے بالکل برعکس ہے قبائل میں تو ساخت و بگاڑ ہمہ وقت جاری رہتا ہے ۔ خود ہماری آنکھوں کے سامنے نئے نئے قبیلے نمودار ہوئے ۔ اسی طرح ہماری اپنی زندگیوں میں پہلے سے موجود قبیلوں کی شاخیں کسی دوسرے قبیلے میں جا کر ضم ہوگئیں ۔ لہٰذا صرف تبدیلی کو دوام ہے ۔ جو نہ تھا موجود ہوا ، جو مستحکم وجود رکھتا تھا تحلیل ہوا ۔ اور اب تو خیر جدید دور قبائلیت کی سب سے بڑے عزرائیل کے بطور اُمڈتا ہوا آ رہا ہے ۔ زئی اور خیل کی سرحدیں دھڑام سے گرتی جا رہی ہیں ۔ حتیٰ کہ اب بڑے بڑے قبائل تیزی کے ساتھ توڑ پھوڑ کا شکار ہیں ۔ لوگ شہروں میں آباد ہونے کے لیے اس تیزی سے نقل مکانی کر رہے ہیں کہ گاؤں کے گاؤں خالی ہوتے جا رہے ہیں ۔ آپ کسی بھی گاؤں جائیں وہاں گاؤں کا نصف ، کھنڈرات کی صورت میں نظر آئے گا ۔ اس لیے کہ لوگ گاؤں چھوڑ کے بڑے شہر میں جا بسے ۔ غریب روزگار کی تلاش میں ایسا کر رہا ہے اور امیر شہری سہولتوں کی تلاش میں ۔ چنانچہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں قبائل تیزی کے ساتھ بلوچ کے عمومی دھارے میں ڈھلتے جا رہے ہیں ۔

ایک مغالطہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ قبائلی نظام فارم بھی ہے اور کانٹینٹ بھی ۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ غلام داری ، سرقبیلوی ، جاگیرداری ، سرمایہ داری اور بہت بڑی حد تک سوشلزم کے عہد سب کے سب طبقاتی سماج ہوتے ہیں ۔ لہٰذا ان سارے سماجوں میں طبقاتی تضاد و تصادم ایک بڑی حقیقت کے بطور ہمیشہ موجود رہتا ہے ۔ اور چونکہ دنیا میں ہر جگہ سرقبیلوی نظام فیوڈل نظام سے متصل ہوتا ہے اس لیے اس میں کسان اور جاگیردار کے بیچ تلخ و شیریں تعلقات موجود رہتے ہیں ۔ اپنی آزادی کے لیے کسان طبقہ کبھی خفیہ و خفتہ اور کبھی اعلانیہ و متحرک جدوجہد کرتا رہتا ہے ۔ جبکہ فیوڈل اُسے ایسا کرنے نہیں دیتا ، طاقت سے بھی ، پیر کے دم درود سے بھی ، شاعر کی دانشوری سے بھی ، اور ریاست کی مدد اور طاقت سے بھی ۔

آرکیالوجی نے ثابت کیا کہ بلوچستان کے پہاڑوں ، دروں اور غاروں میں انسان کا

وجود صدیوں سے قائم ودائم رہا جو بلوچوں کے کسی نہ کسی قبیلے سے متعلق تھے۔ بلوچستان کا کوئی بھی بڑا حصہ آدم زاد سے خالی نہ رہا۔ مہرگڑھ سے لے کر آج تک ساری کسان، اور بین القبائلی لڑائیوں میں، اور نیز بیرونی حملہ آوروں کی یلغاروں میں، نہ تو ساری آبادی قتل ہوئی اور نہ ہی سب کے سب لوگ علاقہ چھوڑ گئے۔ اس لیے بلوچ محض پانچ سو سال کی تاریخ نہیں رکھتے، زلفِ یار دراز بھی، خم دار بھی۔

اسی طرح ہم جب پوری بلوچ قوم کو محض فردِ واحد کی اولاد کہتے ہیں تو یہ بھی سچ نہیں ہے۔ بلوچ چاکر اور گوہرام کی اولاد ضرور ہیں مگر چاکر اور گوہرام بھی کسی بلوچ کے بیٹے پوتے اور پڑپوتے تھے۔ چاکر و گوہرام بلوچ کے اجداد تو تھے لیکن بلوچ کے جدامجد بالکل بھی نہیں۔ بلوچ کے نسب اور شجرے کے دریا کا سرچشمہ تو بہت دور واقع ہے۔

بلوچ کے بارے میں انگریز اور دیگر مؤرخوں، محققوں کی مرتب کردہ تاریخ بھی لفظ بہ لفظ درست نہیں ہے۔ اس کی روانی میں گردن توڑ جھول موجود ہیں۔ بالخصوص انگریز کی لکھی تاریخ میں تو دانستہ اور غیر دانستہ دونوں طرح سے، غلط بیانی موجود ہے۔

اسی طرح، نظریہِ پاکستان، مقتدرہ زبان اردو، اور مسلم لیگ، کا تکون، تاریخ کو اپنے مخصوص نقطہ نگاہ کے اندر سکیڑ کر بلوچ تاریخ کی سا لمیت کو مجروح کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح تاریخ کے بارے میں ہماری سینہ بہ سینہ چلنے والی روایت، برطانوی ہینڈ بیگ والی تاریخ، اور شناخت کی تلاش میں سرگرداں پاکستانی مؤرخ، بلوچ ہسٹری کے بارے میں ہماری معلومات کو محدود رکھنے کے وسیلے رہے ہیں۔

انھیں تو چھوڑیے، خود بلوچ مؤرخ نے جب بھی تاریخ نویسی کے لیے قلم سنبھالا تو دراصل اپنے قومی مستقبل کے لیے موت کا نوحہ ہی لکھا۔ اس لیے کہ اُس نے اپنی قوم کو ایک ایسی نفسیات دے دی جس میں اُن کے لیے ماضی میں کھو کر رہ جانے کی منظر کشی کے علاوہ اور کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ ہمارے مؤرخ نے قوم کو مستقبل دیا ہی نہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ہم ماضی سے رشتہ توڑنے کی حماقت بالکل نہیں کر سکتے، اس لیے کہ ترقی تو نام ہے تواریخی تسلسل کا۔ ماضی کے

پیٹ سے حال اور حال کے بطن سے مستقبل پیدا ہوتا ہے۔ بلوچ کے پاس بلا شبہ ایسی تاریخ موجود ہے جس پہ شرمندگی کے بجائے فخر ہی کیا جاسکتا ہے۔ مگر، اُس سے اگلی اہم بات یہ ہے کہ اس اثاثہ کو سنبھال کر اسے جھاڑ صاف کر کے ہمیں حسین، روشن اور پراگریسو مستقبل کے لیے ڈگ بھرنے ہیں۔ بلوچ مؤرخ اور دانش ور ابھی تک اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا نظر نہیں آتا۔ وہ اس تابناک تاریخی ورثے پر ایک حسین مستقبل کے خدوخال نہ دے سکا۔ یعنی وہ، تاریخ کو اُس نقطۂ نظر سے دیکھ ہی نہ سکا جو انسان کو ماضی پرستی سے نکال لے۔ بلوچ کی حرکت وجہد بھری تاریخ اُس کے لیے ایک شاندار حال، اور روشن مستقبل کے تسلسل میں بڑی اہلیت رکھتی ہے۔ میں نے اِسی اہلیت کو دیکھنے جانچنے کی کوشش کی ہے۔

ایک اور گوشہ تحقیق و تالیف وتصنیف سے رہ گیا ہے۔ بلوچ کی مرحلہ وار معاشی سرگرمیوں کی سیڑھی چڑھنے کا سائنسی احوال ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا۔ موجودہ کتاب کی ہم نے بنیاد اِسی بات پہ رکھی تھی۔

تاریخی مٹیریلزم کو بیان کرنے میں اعداد وشمار سے مکمل طور پر محرومی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ جو منابع دستیاب ہیں بھی وہ ناقابلِ اعتبار ہیں۔ پچھلے ایڈیشنوں تک تو پھر بھی کچھ نہ کچھ باوروالا ڈیٹا موجود تھا۔ اُس کے بعد کی مجرم وفاقی صوبائی حکومتوں نے اعداد وشمار سے یوں خوف کھایا جیسے پاگل کتے کا کاٹا پانی سے خوف کھاتا ہے۔ وہ Movable کو دبئی لے گئے، Immovable پر گرد وغبار کی ایسی تہیں چڑھا دیں کہ کسی شریف حکومت ہی کی مدد سے اس کا مطلع صاف ہوسکتا ہے۔ اور شریف حکومت پاور پالٹیکس سے تو بنتی نہیں۔

خدا کرے کہ بلوچ سماج کی روانی اور ارتقا جاری ساری رہے، اُسے جمود نصیب نہ ہو۔

شاہ محمد مری

ماوند

29 جنوری 2021ء

قبیلہ کیسا ہوتا ہے؟

قبیلہ کی اناٹومی

فرد

فرد سے مراد نفر ہوتا ہے ۔یعنی مرد یا عورت، یا بچہ یا جوان یا بوڑھا۔ گوکہ ہر عمر اور ہر صنف کے فرائض اور ذمہ داریاں مختلف ہوتی مگر ہر انسان فرد میں شمار ہوتا ہے۔

فرد قبیلے کا سب سے نچلا اور بنیادی یونٹ ہوتا ہے۔ چوں کہ انسان ایک سماجی مخلوق ہے، اس لیے وہ الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ کرہِ ارض پہ اس کی سرشت اور حرکتیں ہی ایسی ہیں کہ اُس کے دشمن بہت ہوتے ہیں۔اور کوئی فرد خواہ کتنا ہی رستم اور سہراب (دونوں بلوچ تھے) کیوں نہ ہو، اسے اِدھر اُدھر کی خود سے زیادہ قوی اور طاقتور مخلوق اور آفتوں چیلنجوں سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ اس لیے فرد کو تحفظ اور حفاظت کی ضرورت رہی ہے۔دشمن اور مسائل سے تحفظ کے علاوہ اُسے ایسی سہولتیں بھی چاہئیں جو اکیلا رہ کر نہ تو حاصل کی جاسکتی ہیں اور نہ ہی برقرار رکھی جاسکتی ہیں۔اس لیے فرد ایک اجتماع، ایک اکٹھ، اور ایک ایسوسی ایشن بناتے ہیں۔ وہ اپنے وسائل اور قوتیں باہم ضم کر دیتے ہیں تا کہ وہ ایک نارمل زندگی گزاریں۔.......... یوں خونی رشتوں کی اولین تنظیم بنی۔ برادری یا قبائلی زندگی انھی خونی رشتوں والی تنظیم کی ایک وسعت یافتہ اور منظّم ارتقائی شکل ہے۔

لہٰذا ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم فرد کو گروہ، اجتماع، قبیلے، قوم یا طبقے

میں دیکھیں۔اُس کے ہست نیست کو، اُس کے حسب نسب کو، اور اس کی روٹی روزگار کو اُسی اجتماع میں تلاش کریں۔

فرد اور قبیلہ کا آپس میں سوشل کانٹریکٹ یہ ہوتا ہے کہ کچھ جرائم میں فرد انفرادی طور پر سزا جھیلتا ہے مگر بقیہ سارے شر و خیر اور نیک و بد میں وہ اپنے قبیلے کا اٹوٹ حصہ ہوتا ہے۔ سزا جزا سارا قبیلے کا ہوتا ہے۔

بلوچ قبائلی فرد تقریباً تقریباً سماجی ہوتا ہے ۔اس کی انفرادیت قبیلے کے سمندر میں جذب رہتی ہے۔

لوغ

کچھ افراد مل ایک خاندان بناتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں خاندان کے اندر افراد ہوتے ہیں ۔ اُن کے اشتراک سے انسانی سماج کی سب سے اہم اکائی یعنی خاندان کی تشکیل ہوتی ہے ۔ہم چوں کہ موجودہ یورپ سے کئی صدیاں پیچھے ہیں، اس لیے ہم آج کے بلوچ کے بارے میں ہی بات کریں گے ۔یورپ میں تو خاندان تقریباً ختم ہو چکا ہے اور شادی وغیرہ کا تصور تیزی سے مٹتا جارہا ہے ۔مگر وہ نظام یہاں آتے آتے صدیاں لے گا۔ اس لیے ہم اپنی بات کریں گے۔

ہمارے ہاں خاندان میں ممبر شپ، پوزیشن، اتھارٹی اور سٹیٹس باپ کی طرف سے اولاد کی طرف چلتا ہے۔خاندان خیمہ و خانہ بدوشی میں ماں باپ اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔مگر دیہات اور قصبہ میں یہ وسیع (extended) ہوتا ہے۔ ماں (ماث، آئی) باپ (پث، ابا) آپس میں میں ''زال ومڑد'' (میاں بیوی) ہوتے ہیں۔ خاوند ''لوغ واژہ'' یا ''مڑد'' کہلاتا ہے اور بیوی ''لوغی یا لوغ بانک''۔

مائیں دو بھی ہوسکتی ہیں؛ باہم ہفوخ (سوکنیں) ۔ایسی صورت میں ایک ماں سگی ہوتی ہے، دوسری ''ماتن'' ہے ۔اسی طرح بہن بھائیوں میں ''ماتنیں'' بچہ ''جُذ ماث'' کہلاتا ہے۔ بھائی

''براث، ادا'' ہوتا ہے اور بہن ''گہار'' یا ''اَدی''۔ بہن کی اولاد ''گہارڑ زاتک'' کہلاتی ہے۔ ماں کا بھائی ماما اور اس کی بیوی مامی ہوتی ہے۔ ماں کی ماں نانی ہوتی ہے، نانی کی ماں ''پرنانی'' اور ماں کی بہن ''ماسی یا تروُ'' ہے اور اس کے بچے ''تروزاتک'' یا ''تریں زاتک'' ہوتے ہیں۔

باپ کا باپ ڈاڈا ہوتا ہے۔ ڈاڈا کی بیوی ڈاڈی اور ڈاڈا کا باپ پرڈاڈا، اور باپ کے بھائی بابا، یا، ناکو، ہوتے ہیں۔ باپ کی بہن ''تروُ'' یا ''پھپھی'' ہوتی ہے۔ چاچا اور اس کی بیوی چاچی کے بچے ناخوزاتک کہلاتے ہیں۔ اور ناخوزاتک کے بچے پرناخوزاتک۔

بھائی (براث) اُس کی ماں باپ کے نرینہ بچے ہی ہوتے ہیں مگر عورت کا ایک اضافی بھائی بھی ہوتا ہے (منہ بولا بھائی) جو اس کی ماں شادی کے وقت اُس کے لیے اُس کے خاوند کے خاندان میں سے ایک کو منتخب کرتی ہے۔ اُسے ''وکیلی براث'' کہتے ہیں۔

بھائی کی بیوی ''نشار'' کہلاتی ہے۔ خاوند کے بھائی کی بیوی ''امجرات'' جبکہ اس کی بہنیں ''ڈشکیش''۔ بیٹے کی بیوی بھی ''نشار'' ہوتی ہے۔ بیٹے اور بیٹی دونوں کے بچے ''نواسغ'' ہوتے ہیں اور نواسغوں کے بچے ''کواسغ'' ہوتے ہیں اور کواسغ کے بچے کُراسغ۔

سُسر ''وَسرک'' کہلاتا ہے اور وسرک کے بیٹے یعنی خاوند کے بھائی ''وسرک زاتگ'' یا ''سٹرزاتک'' ہوتے ہیں۔ بیٹی یا بہن کا خاوند ''زامات'' ہوتا ہے۔ دو بہنوں کے خاوند آپس میں ''ہم زاماث'' ہوتے ہیں۔

بلوچوں کے ایک بہت بڑے حصے کی حالیہ تاریخ میں اب تک تو نرینہ انسان ہی زمین، مویشی اور دوسری جائیداد و مال میں حصہ دار ہوتا تھا۔ باپ کے دو حصے اور بیٹوں کا ایک ایک حصہ۔ عورت اور بچی کا ملکیت و جائیداد میں حصہ نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ خاوند لاولد مر جاتا تو بھی بیوہ کو کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا اور ساری جائیداد خاوند کے بھائیوں (اور اگر اس کے بھائی نہ ہوتے تو) چچیروں میں تقسیم ہوتی تھی۔

ٹکر اور قبیلہ

ٹکر کئی خاندانوں کے اجتماع سے بنا ہوتا ہے۔ اور کئی ٹکر مل کر قبیلہ بناتے ہیں۔

قبیلہ کی اس گروہی زندگی (حکومت) نے اپنے ممبروں کو سیکورٹی دی، اور بہبود بخشی۔ اس کا سماجی ڈھانچہ کچھ اس طرح منظّم ہے کہ جب لوگ اس سماجی سیٹ اپ میں پیدا ہوتے ہیں تو انھیں آٹومیٹک انداز میں اس کی ممبرشپ ملتی ہے۔

انسان کی گروہی زندگی اُس زمانے میں ساتھ ساتھ چلی جب وہ خانہ بدوشی پہ مجبور تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ خانہ بدوشی ایک تہذیبی ادارہ ہے۔ اتنا ہی جدید، ترقی یافتہ اور منظّم جتنی اپنے زمانے میں کوئی بھی تہذیب ہوسکتی ہے۔ یہ حکومت کی اولین صورت تھی۔

دوسری کسی بھی تنظیم کی طرح اسے بھی اپنا تنظیمی ڈھانچہ اور لیڈرشپ بنانے اور اس کے بعد قائم رکھنے پڑے۔ قبیلے نے خود اپنا ضابطہ اخلاق بنایا۔ اور اس کا ضابطہ اخلاق دراصل ضابطہِ وقار ہے۔ اس نے ایک کلچر پیدا کیا جس نے سب کے لیے مرکزی ویلیو سسٹم کے بطور کام کیا۔ اس کلچر کی پابندی سب پر لازم ہوئی۔ یہی کلچر گویا اس کا آئین بن گیا۔ قبیلے کے سارے ممبروں کے لیے لازم ٹھہرا کہ وہ اپنے قبیلوی آئین کو تسلیم کریں، اور اُسے خود پر، اور اپنے دوسرے قبائلی بھائی بندوں پر لاگو کریں۔ واضح رہے کہ قبیلے کا آئین کانفرنس ہالوں میں نہیں بنا بلکہ یہ چلتی پھرتی زندگانی میں سے تشکیل پایا۔ یہ بھی نوٹ کیجیے کہ دنیا بھر میں کبھی بھی کسی قبیلے نے اپنا آئین تحریری صورت میں نہیں بنایا۔ یہ ہمیشہ زبانی طور پر بلکہ برتاؤ کے بطور بنا، چلا اور ارتقا پاتا رہا۔

اینگلز نے لکھا: ''قبیلہ انسان کے لیے ایک سرحد ہے، خود اپنے تعلق سے بھی اور باہر والوں کے تعلق سے بھی۔ قبیلہ، خاندان، اور اُن کے ادارے مقدس اور قابلِ حرمت ہیں۔ ایک ایسی برتر طاقت کی طرح جسے فطرت نے مقرر کیا ہو، جس کا کہ فرد احساسات، خیالات اور عمل میں مکمل طور پر تابع رہتا ہے''۔

اِس گروہ (قبیلے) کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ اپنے ممبر کو حفاظت اور سیکورٹی مہیا کرے۔ قبائلی تنظیم فرد کو اس قدر گلے لگاتی ہے کہ ماسوائے سیاہ کاری کے اُس کا کوئی بھی جرم ذاتی یا انفرادی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ پورے قبیلے کا ہوتا ہے۔

جب بھی قبیلہ فرد کو بہبود، سکیورٹی، کلچر اور ایک سیاسی نظام دینے کے قابل نہیں رہتا تو پھر وہ ختم ہو جاتا ہے، کسی دوسرے قبیلے میں ضم ہو جاتا ہے، یا پھر اگلے سماجی معاشی نظام میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہاں منظّم قوت یعنی ریاست یہ فرائض انجام دیتی ہے۔

پڑوسی قبائل ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے چلے آ رہے ہیں۔ جب کوئی جھگڑا شروع ہوتا ہے تو دونوں قبیلے عموماً اُسے اپنے کلچر کے مطابق حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر جھگڑا ایک جنگ کی شکل اختیار کرے تو قبیلے کی لیڈر شپ کو جنگ کرنا پڑتی ہے اور یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وقار اور شان کو کمپرومائز کیے بغیر اپنی طرف اموات کم سے کم کرائے۔ اور جتنی جلد ممکن ہو فتح پائے، یا کوئی حل نکالے۔

جب بھی ہم کسی قوم بالخصوص بلوچ کی قبیلوی ساخت کی بات کریں گے تو ہم دراصل ایک خانہ بدوش پس منظر رکھنے والے معاشرے کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ (گو کہ اب یہ صورت بہت کم زور ہو کر نیم آبادی اور نیم خانہ بدوشی والی ہو چکی ہے)۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بلوچ سر قبیلوی نظام کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ بلوچستان کے طول و عرض میں قبائلی نظام ایک جیسا اور خالص کلاسیکل انداز میں موجود ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بلوچوں میں سر قبیلوی نظام کے ساتھ ساتھ اس سے پیچھے والے نظام یعنی غلام داری بھی موجود تھی اور اس سے آگے والا نظام یعنی جاگیرداری نظام بھی موجود رہا۔ (ہمارے ہاں قبائلی نظام کے ساتھ ساتھ غلام داری نظام بیسویں صدی کے وسط تک باقاعدہ جاری تھا)۔

دوسرا چیپٹر

قبیلے کا تنظیمی ڈھانچہ

بلوچستان تاریخی طور پر ایک ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن رہا ہے۔۔۔۔ بے شمار وادیوں پر مشتمل بہت سے چھوٹے چھوٹے خودکفیل معاشروں کا کنفیڈریشن۔ اس دُوری اور علیحدگی کو ایک حد تک نصیر خان نوری نے توڑ دیا تھا اور قبیلوں کی خودمختاری کو برقرار رکھتے ہوئے بلوچستان بھر میں نسبتاً ایک مرکزی اتھارٹی قائم کی تھی۔ اُس کے زمانے سے یہ قوم بہت ''سست رفتاری'' کے ساتھ، تنوع اور رنگارنگی کو برقرار رکھتے ہوئے، مرکزیت کی طرف ارتقا کرتی رہی ہے۔

مختلف علاقوں میں رائج مختلف ناموں اور اصطلاحوں کی یکسانیت تلاش کی جائے تو بلوچ قوم کا ڈھانچہ نچلی سطح پر موجود ''فرد'' سے لے کر ''قوم'' تک تقریباً تقریباً یوں بنتا ہے:

فرد سے لوغ، لوغ سے بولک (ترکی زبان کا لفظ ہے اس کا مطلب ہے ''مَردوں کا ایک گروہ'')، بولک سے زئی، زئی سے ٹکر، ٹکر سے سیک یا چیارک، وہاں سے تمن (قبیلہ)، اور پھر قبیلے مل کر ''بلوچ قوم'' تشکیل کرتے ہیں۔ (1)

بے شک بہت عرصہ تک کوئی حرکت محسوس نہ ہو، مگر دنیا میں کوئی بھی انسانی سماج ساکن و ساکت و مردہ نہیں ہوتا۔ ہر انسانی سماج بہرحال زندہ سماج ہوتا ہے۔ ہمارا قبائلی نظام والا سماج بھی کبھی محض افراد کا عام سا مجموعہ نہ رہا۔ یعنی یہ ایک زندہ سماجی مجموعہ تھا جس میں بہت سے اجسام

(قبائل) تھے۔ انھی اجسام کے اندر کچھ اور اجسام (ذیلی فرقے) تھے اور ان تمام اجسام میں سب سے ابتدائی عضو کا نام خاندان ہے جو کہ ''فرد'' کے کاندھوں پر کھڑا ہے۔

قبیلے کی ہیرارکی بالکل خاندان کی ہیرارکی جیسی ہوتی ہے۔ افراد پہ کھڑا ہوا سٹرکچر! اگر آپ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ایک اہرام (Pyramid) نما ڈھیری بنائیں تو اُس کی چوٹی پر سردار ہوتا ہے جو اکیلا ہوتا ہے اور اختیارات سے بھرا ہوا۔ اس احرام کی چوٹی سے نیچے آتے جائیں تو درجہ بدرجہ نیچے ''بڑی تعداد اور کم ہوتے ہوئے سٹیٹس'' والی سطحیں ملیں گی۔ سب سے نیچے عوام ہوتے ہیں۔(2)

گو کہ قبیلے کا پیریں مڑد (سردار) سب سے بلند ہوتا ہے۔ مگر جب بھی ایک عہدہ ہوتا ہے تو اس کے بہر حال کچھ Previlages تو ہوتے ہیں۔ قبائلی ہیرارکی میں ہر ایک پیریں مڑد کا اپنا ایک مخصوص مقام ہوتا ہے۔ اس نظام میں قبائلی سٹیٹس، برابری پر زور نہیں دیتا بلکہ یہ ایک ہیرارکی میں بڑے اور چھوٹے لیڈروں کے درمیان سرپرستی اور حاشیہ نشینی کے سلسلہ پر مبنی ہوتا ہے۔

اس تنظیم کا سیاسی طور پر اہم پہلو یہ ہے کہ ہر گروپ کے ممبر اس گروپ کے لیڈر کے ساتھ سیاسی حاشیہ نشینی کا رشتہ تسلیم کرتے ہیں۔ یہ لیڈر پھر ''عمودی'' طور پر کام کرتا ہے۔

پیر یں مڑد

خاندان کا جو سفید ریش، بزرگ' لیڈر، یا فوکل پرسن ہوتا ہے اُسے ''پیریں مڑد'' کہتے ہیں۔ مختلف خاندانوں کے پیریں مڑد ایک لحاظ سے اُس طائفے کی سماجی زندگی میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ غیر موروثی لوگ ہوتے ہیں۔ اِن کی کوئی دستار بندی وغیرہ نہیں ہوتی اور انھیں کوئی الاؤنس اور مراعات نہیں ملتے۔ تکریم تو بہر حال بڑی ہوتی ہے ان کی۔

وڈیرہ

وڈیرہ اپنے ٹکر (ذیلی قبائلی فرقہ) کا بڑا ہوتا تھا۔ اس کی حیثیت اپنے ذیلی فرقے میں

تقریباً وہی ہوتی تھی جو سردار کی پورے قبیلے میں ہوتی تھی۔ اس کا عہدہ موروثی ہوتا تھا جس میں اُس پر دستار بندی (تاج پوشی) کی رسم لازمی ہوتی تھی اور اس کے سر پر دستار کا پہلا بل قبیلے کا سردار خود باندھتا تھا۔

وڈیرہ کو سردار کی طرح پگڑی والی زمین و جائیداد ملتی تھا۔ اِسے ''پاغہ ڈغار'' کہتے تھے۔ یہ زمین دستار کے ساتھ منتقل ہوتی جاتی تھی۔ اُسے دستار بند شخص کے دوسرے بھائیوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وڈیرہ جنگی صورت میں اپنے قبیلے سے افراد مہیا کرتا۔ تاوان یا غنیمت کی تقسیم اپنے قبیلے میں کرتا، جھگڑوں کے فیصلے کرتا۔ پوری قوم کے جرگے میں اپنے ذیلی قبیلے کی نمائندگی کرتا تھا۔

سڑدار

تمن یا تومان چنگیز خان کی فوجوں میں دس ہزار افراد پہ مشتمل جنگی گروپ کو کہا جاتا تھا۔ اسی تمن سے تمندار نکلا جو بڑے قبیلے کے سربراہ کو کہا جاتا تھا۔ (تمن اور تمن دار کے الفاظ اب تقریباً گم ہو چکے ہیں)۔

قبائلی ہیرارکی کی چوٹی پر سڑدار بیٹھتا تھا۔ اس کا ہمسر اور اس کی برابری کرنے والا قبیلے میں کوئی دوسرا نہیں تھا۔ وہ قبیلہ پر اپنا اثر و رسوخ اپنے ماتحتوں یعنی وڈیروں کے ذریعے برقرار رکھتا تھا۔ سردار، وڈیروں کے ذریعے نظامِ حکومت چلاتا تھا۔ سردار ہی وہ سرچشمہ تھا جہاں سے سیاسی، ثقافتی اور معاشی اختیارات کے چشمے پھوٹتے تھے۔ وہ اپنی اتھارٹی کو برقرار رکھنا جانتا بھی تھا اور ایسا کرنے کی قوت بھی رکھتا تھا، اُسے ہر حال میں اپنی اتھارٹی برقرار رکھنی ہوتی تھا۔ اس لیے اوپر سے نیچے تک ہر ایک ممبر نظامِ حکومت چلانے میں ماہر ہوتا تھا۔

عمومی طور پر، سردار اپنے ذیلی فرقے یعنی سردارخیلوں کے علاوہ کسی اور سے رشتہ نہیں کرتے تھے۔ رواج تو نہیں تھا۔ مگر مشاہدہ یہی ہے کہ سردار اپنی بیٹی دوسرے قبیلے کے سردار کے ہاں ہی بیاہتا تھا۔ البتہ وہ خود اپنے ہاں عام قبائل حتیٰ کہ غیر بلوچ لڑکی بیاہ لانے کو کوئی حرج نہیں گردانتے تھے۔

ابھی حال تک سردار کی اپنی جیل ہوا کرتی تھی۔ جہاں اُس کے مخالفوں کو، قبائلی دستور توڑنے والوں کو، اور سماج دشمن عناصر کو انتہائی وحشیانہ اور غیر انسانی سزائیں دی جاتی تھیں۔ وہاں ''کاٹ'' نامی ایک بڑی موٹی شہتیر پڑی ہوتی تھی۔ اور اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سوراخ بنے ہوتے ہیں۔ قیدی کے پیر سزا کی مناسبت سے ان سوراخوں میں ڈال دیے جاتے تھے۔ اور اُسے کھڑا رکھا جاتا تھا۔ چھوٹا قصور تو پیروں کا فاصلہ کم، بڑا جرم تو فاصلہ دور۔ قیدی کو اپنی خوراک کا خود بندوبست کرنا ہوتا تھا، یا اُسے وہاں کے لوگ خیرات کے بطور کھانا دیتے تھے۔

سردار کی پشت پہ سنڈیمن کا وضع کردہ اور فائنانس کردہ لیویز کا نظام ہوتا تھا۔ (اب بھی سرکاری لیویز ہی اُن کی طاقت کا سبب ہیں)۔ انگریز کے دیے ہوئے سردار کے لیویز والوں کو ''سردار کے سوار'' کہا جاتا تھا۔ یہ لیویز والا بہت اختیارات رکھتا تھا۔ اس کے پاس موجود سردار کی مہر لگی چھڑی اُسے ناقابلِ گرفت بنا دیتی تھی۔ وہ صرف احکامات کی تعمیل ہی نہیں کرتا تھا، بلکہ بہت سے احکامات خود سے بھی جاری کرتا تھا۔ یہی سوار قدیم زمانوں میں جنگوں کے وقت لڑنے والوں میں ہوتا تھا، اور امن کے زمانے میں پولیس مین۔ (3)

بلوچوں کے سرداری نظام کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے سردار کی عزت اور احترام بہت کرتے تھے، عقیدت کی حد تک۔ یہ مستقل اور بے انداز احترام محض سیاسی و سماجی وجوہات سے نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی سردار کے جاہ وجلال واقتدار و کرسی کی وجہ سے ہی اُسے نصیب ہوتا تھا بلکہ یہ احترام روحانی بھی ہوتا تھا۔ عام انسان کے نزدیک سردار آسمانوں کا برگزیدہ اور پسندیدہ شخص تھا، ''تبھی تو اُسے اتنی طاقت عطا کر دی گئی''۔ بلوچ اپنے سردار کے ولی اور باکرامت ہونے پر ایمان رکھتے تھے اور قلب کی اتھاہ گہرائی سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔ سردار کی حکم عدولی اور دل شکنی، نقصان پہنچاتی تھی۔ سردار کو غائبانہ طور پر بھی کچھ کہا یا محض اُس کا برا سوچا بھی ہو تو عزرائیل آ کر مویشی کو کسی بیماری کے بہانے مار جاتا تھا، یا ہوا یا بارش فصل کو تباہ کر سکتی تھیں۔ یا، اولاد کو پولیو دبوچ لیتا تھا، یا مرگی کا مرض بیوی کو چپک سکتا تھا اور بدبختی اولاد کے حصے میں لکھی جاتی تھی۔ قبائل کے پاس سیکڑوں ایسی مثالیں، ایسی حکایتیں، ایسے ضرب الامثال ہیں، جن میں سردار

کے خلاف سوچنے والے کو قدرت کی طرف سے مندرجہ بالا عبرت ناک سزاؤں میں سے کوئی مل چکی ہوتی ہے۔ ''سردار سات ولی سے زیادہ ولی ہے''۔ آپ تصور کر لیں کہ عام آدمی کے لیے محض ایک ولی کتنا طاقتور ہوتا ہے۔ یہی مثالیں یہی حکایتیں نسل در نسل محفلوں، شادیوں، قصوں کہانیوں، شعروں، ضرب المثالوں اور محاوروں میں دہرائی جاتی تھیں............ یہی واقعات و سرگزشتوں کی کہانیاں سرداری نظام کو نظریاتی بقا بخشتی رہیں۔

بلوچ رواج میں سردار یا اس کے خانوادے کے کسی فرد کا خون بہا عام آدمی کے خون بہا سے چار گنا زیادہ ہوا کرتا تھا۔ وڈیرہ کا، عام آدمی سے تین گنا۔ پیہرسن نے بیسویں صدی میں مری قبیلے میں مروج خون بہا کے نرخ کو یوں بیان کیا:

سردار یا کوئی بھاولاں زئی............8000 روپے

وڈیرہ..................................4000 سے لے کر 7000 روپے تک

عام مری..............................2000 روپے (4)

بلوچوں میں سردار کا مقام بہت اونچا اس لیے ہوتا تھا کہ شروع میں سردار کوئی موروثی عہدہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو قبیلے کا سب سے اچھا آدمی ہوتا تھا جس میں بلوچیت کی تمام خوبیاں موجود ہوتیں۔ سردار قبیلے کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتا۔ ایک بلوچ شاعر نے کہا تھا:

آس مڑد کہ راجانی سرنت
لوغ کانڑ اِنش آفی بہنت
فیضاں ہزار قوم اش گرنت

ترجمہ:

وہ اشخاص جو قوموں کے سربراہ ہیں
ان کے گھر معدنی خزانے کی طرح ہیں، میٹھے چشمے کی مانند ہیں
ہزاروں لوگ ان سے فیض یاب ہوتے ہیں

اسی وجہ سے تو سردار عوام الناس کی توجہ اور تعریف و توصیف کا مرکز تھے۔

ایک وقت ہم نے یہ مہم شروع کی تھی کہ ''نواب'' کا لفظ سامراجی ہے۔ اس لیے سردار پکارا جائے، نہ کہ نواب۔ اب تو پتہ چلا کہ لفظ ''سردار'' بھی ہمارا نہیں بلکہ درآمد شدہ لفظ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ نصیر خان اول کے زمانے سے شروع ہوا۔ اس سے قبل بلوچ عوام سردار کے بجائے لفظ ''میر'' استعمال کرتے تھے۔ (5) چاکر عہد کی شاعری اِس لفظ ''میر'' سے بھری پڑی ہے۔

واضح رہے کہ سردار کو موروثی بنانے کا سارا کام نجی ملکیت کے وجود میں آنے کے بہت بعد شروع ہوا۔ پہلے تو لوگوں کا اجتماع ہی سردار کو منتخب کرتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بہادر ہو، مہم جُو ہو، جلد فیصلہ تک پہنچنے والا ہو، پُرعزم ہو، سخی اور فیاض ہو۔

پھر، رفتہ رفتہ سرداریت ایک موروثی عہدہ بن گئی۔ بالخصوص انگریز کے آنے کے بعد تو یہ پکا، مضبوط، موروثی اور بے لگام ادارہ بن گیا۔ یعنی سردار کی موت پر اُس کا بڑا بیٹا سردار بن جاتا ہے، لیکن اگر اس کی ماں بلوچ کے سماجی حیثیت کی برابری والی عورت نہ ہوتی تو اس کے انتخاب کا سوال اچھا خاصا متنازع ہو جاتا۔ (6) یا پھر اگر وہ دماغی طور پر تندرست نہ ہوتا تو سردار نہیں بن سکتا تھا۔ (مگر یہ تو ہزار میں ایک بار ہوتا ہوگا)۔

جیسا کہ بتایا گیا کہ عوام اپنے سردار کو زبردست عزت و توصیف بخشتے تھے۔ اور اس کے نسب کے بارے میں اعلیٰ ارفع روایتیں بناتے تھے۔ ہر قبیلے کے سردار کے حسب نسب میں آپ کو کہیں نہ کہیں مافوق الفطرت، نُور کی دھند میں لپٹی، اور معجزاتی باتیں ضرور ملیں گی۔ مثلاً بعد میں مری قبیلے کا موروثی بنا ہوا عہدہ سردار، گزینی کے ذیلی فرقے سے تھا۔ اب یہاں عوام الناس خوبصورت انداز میں گزینی کو پیش کرتے رہے ہیں۔ وہ گزینی کے شجرہ کو میر جلال خان کے نواسے ''گزین'' تک لے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ گزین بلیدی تھا جس کا باپ آ کر بجار کا ''باہوٹ'' ہوگیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ گورگیژ تھا۔ میں نے جب معمر، محمد خان پیردادانڑیں (مرحوم) سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے جو آرٹسٹک روایت بیان کی تھی، اس سے قارئین کو محظوظ کرانا بہت ضروری ہے:

''گزین کے باپ کا ایک ریوڑ تھا۔ اس نے بجار سے پوچھا کہ تم مجھے کہاں تک پناہ میں رکھ سکتے ہو؟ بجار نے کہا، ''میں تمھیں ماوند تک سفیث، مورانی، گوا ثانی، بجارو ڈ اور کاہان تک پناہ میں رکھ سکتا ہوں۔ تم اپنا ریوڑ چراؤ، تمھارے حقوق سلب کرنے نہیں دوں گا''۔

''تب وہ شخص بجار کے ساتھ ہمساخ (پناہ گزیں) کے بطور رہنے لگا۔ کاہان میں درندے بہت ہوا کرتے تھے۔ گز نامی درختوں کے بڑے بڑے اور بہت ہی گھنے جنگل تھے۔ جن میں گورپٹ، چیتا اور شیر نامی درندے ہوتے تھے۔ جو انسانوں سے لڑتے تھے۔ اس لیے لوگ اُن جنگلوں میں مویشی نہیں چراتے تھے بلکہ آس پاس پہاڑیوں میں لے جاتے تھے۔

''ایک ڈور (جوہڑ) میں پانی تھا۔ اُس شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ ہمارے کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ تم جا کر انہیں دھودو۔ میں وہاں آ کر مویشی چراتا ہوں، تمھاری نگہبانی بھی کروں گا۔ ورنہ درندے کھا جائیں گے۔

وہ جب کپڑے دھو رہی تھی تو وہاں سے چار درویش گزرے۔ ایک نے کہا: ''ساتھیو، میرے کپڑے بہت میلے ہوگئے ہیں۔ میں اس عورت سے اپنے کپڑے دھلواؤں گا'' میرے انٹرویو والے سفید ریش کے الفاظ میں یہ چار درویش دراصل ''چہار یار'' تھے۔ ایک شہباز قلندر تھا۔ ایک غوث بہاءالحق تھا۔ ایک کا نام شیر شاہ سید جلال تھا، اور ایک کا نام شیخ فرید تھا۔

''خاتون نے اُس کے کپڑے دھودیے۔ درویش نے گڑ کا ایک ٹکڑا عورت کو دیا کہ اپنی بیٹی کو کھلا دے۔ وہ اُسے کھا کر الٹی کر دے گی۔ اُس کی قے میں ایک بیٹا ہوگا۔ وہ تم لوگوں کے لیے سات پشت تک بادشاہی لائے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ لڑکی نے قے میں ایک بیٹا اگل دیا۔ عورت نے گز کی ٹہنیاں کاٹ کر بچھا دیں اور بچے کو ان پر رکھ دیا اور روتی ہوئی بھاگ کر شوہر کے پاس گئی اور اسے بتایا کہ ہم تباہ اور بدنام ہوگئے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ شوہر نے کہا، ''نہیں، جا کر اُسے لائیں گے''۔ جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ گز کے درخت کے نیچے بچہ لیٹا ہوا ہے۔ درخت کی ٹہنیوں سے دودھ ٹپک ٹپک کر بچے کے منہ میں گر رہا ہے۔ (یوں گز کا درخت اُس بچے کو اپنا دودھ پلا رہا تھا)۔ اسی ''گز'' سے گزینی بنا۔ اور اُنھی کی سرداری ہے مری قبیلے پر، سات پشتوں سے۔

’’درویش نے یہ بھی کہا تھا کہ جب بیٹا ہوتو ہرسال ایک اونٹ کی قربانی دو۔ چنانچہ اب بھی وہ خاندان (باولہاں زئی) ہرسال ایک اونٹ غوث بہاءالحق کو دیتے ہیں‘‘۔

اسی طرح کی مافوق الفطرت کہانیاں اور روایتیں دوسرے سارے سرداروں سے متعلق بنادی گئی ہیں۔مثلاً مزاری سردار حادثاتی طور پر شیر کا پیشاب پینے سے پیدا ہوا۔کسی کا خاندان آگ،سورج یا چاند سے پیدا ہوا۔ یا وہ سیدھا سیدھا آسمان سے اچانک زمین پر نمودار ہوا۔ بہرحال ظاہر یہ کرنا تھا کہ سردار خدا کا محبوب و برگزیدہ ہستی ہے اور یہ سرداری یا پیری اُسے خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔اس تصور کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ لوگوں میں اس کی عظمت کی دھاک پھیل جائے،اور سرداراوراس کے خاندان کی حیثیت مضبوط ہوجائے تاکہ سماج کا کوئی فرد اس کے خلاف کسی قسم کی مخالفت کا خیال بھی نہ لاسکے۔اور نہ کسی دوسرے فرد کو حکمرانی کی خواہش پیدا ہوسکے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس خاندان کی عظمت،دھاک اور کرامت لوگوں کے دلوں میں سختی کے ساتھ جاگزیں ہوتی ہے اور’’ان کے خلاف کسی قسم کی بغاوت ایک گناہِ عظیم تصور ہوتی ہے‘‘(7)۔

چوں کہ ہم صرف بلوچ کی بات کررہے ہیں اس لیے چین اور ایران کے بادشاہوں کے کراماتی ظہور کا ذکر نہیں کررہے۔

سردار سے متعلق دوسری ساری رسومات روحانی تقدس میں لپٹی ہوتی ہیں۔مثلاً بگٹیوں میں نئے سردار کے سر پر دستار کا پہلا پیچ مشرقی بلوچستان کے بہت بڑے روحانی پیشوا،پیرسُوہری کے مزار کا مجاور خود باندھتا ہے۔حالاں کہ خود اُس روحانی پیشوا کو سردار،(پیروزانی وڈیرہ کی مشاورت سے) مقرر کرتا ہے۔

بگٹی سردار کے سر پہ دستار کا دوسرا پیچ مشرقی بلوچستان کے پورے علاقے کی بڑی روحانی ہستی سخی سرور کے دربار کا مجاور،باندھتا ہے۔اس کے بعد سردار کے خاندان کے بزرگ شخص کی باری آتی ہے۔اور پھر راہیجہ کی ذیلی شاخوں کرمانزئی،سوبھازئی،مندوانڑیں،اور قاسمانڑیں وڈیرے دستار بندی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔اس کے بعد قبیلے کی شاخوں کے وڈیرے مندرجہ

ذیل ترتیب کے ساتھ بیعت کے بطور اس کی دستار بندی کرتے ہیں؛کلپر،مسوری،پیروزانی، نوثانڑیں،شمبانڑیں،موندرانڑیں،نوہکانڑیں،کیازئی،سیدیانڑیں،ہندو،مریٹہ۔(8) آپ اندازہ کریں کہ اگر پیرسُوہری کے مزار کا مجاور موجود نہ ہوتو دستار بندی ملتوی کی جاتی ہے۔یعنی بلوچ کا سرداری نظام ہر لحاظ سے روحانی مدد وحمایت سے قائم ودائم ہے۔

ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ سردار کا گھرانہ تقریباً ہر قبیلہ میں تعداد اورقوت دونوں اعتبار سے نسبتاً کمزور ہوتا ہے۔مری کا باولہاں زئی،مکران کا گچکی،خاران میں نوشیروانی سب پر یہ دلچسپ کلیہ لاگو ہوتا ہے۔اس کے علاوہ رئیسانی،زرکزئی،مینگل،رند،بگٹی حتیٰ کہ خود بلوچوں کا مشترکہ خان،(خانِ کلات) تعداد میں چھوٹے سے قبائلی ذیلی فرقوں سے ہیں۔

المختصر،بلوچستان میں قبیلہ کا مطلب تھا،سردار کے تحت مضبوطی سے گرہ دیا ہوا گروپ۔(9)

ریفرنسز

1۔ایماڈنکن۔صفحہ۔136
2۔عطائی،ابراہیم۔ڈکشنری۔صفحہ 9
3۔پیپرسن۔صفحہ 71
4۔مزاری،شیرباز۔A Journey to disillusionment آکسفورڈ یونیورسٹی پریس xxxi
5۔بزنجو،غوث بخش۔تحریک آزادی کا ایک باب۔طاہر بزنجو کی کتاب’’بابائے بلوچستان‘‘ سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ۔1999۔صفحہ 34
6۔مبارک علی۔بازار اور دوسرے مضامین۔1988۔نگارشات لاہور۔صفحہ 64
7۔ارباب،محمد جہانگیر’’میریٹل رول پیٹرنز ان مسلم سوسائٹی۔پاکستان سٹڈیز،ریسرچ جرنل یونیورسٹی آف بلوچستان۔1990۔جلد نمبر1۔صفحہ 71
8۔بگٹی،عزیز۔بگٹی قبیلہ۔2005۔قلات پبلشرز کوئٹہ۔صفحہ نمبر 101
9۔لیون،اناتول۔Pakistan, A Hard Country۔2011۔پنگوئن۔صفحہ 39

تیسرا چیپٹر

انفرادی بلوچ قبائل

بلوچ اپنی شناخت کے بارے میں بہت حساس قوم ہے۔اُس کا ہر فرد اور ہر قبیلہ خود کو اوریجنل، مقامی، معزز، محترم اور اصلی بلوچ قرار دینے میں سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار رہتا ہے۔ ہر کسی کو اگر اپنی برتری کا نہیں تو کم از کم دوسرے سے برابری کا یقین ضرور ہے۔''میں' میرا دادا، میرا قبیلہ'............ اِس ''میں'' نے بلوچ کو تباہ بھی بڑا کیا مگر اُسے بقا بھی اسی ''میں'' نے عطا کی۔ بس یہ ''میں'' ذرا سا ''ہم'' ہو جائے تو بلوچ قوم کے وارے نیارے ہو جائیں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ جی ہاں، ہر انسان۔عربی' عجمی پہ کوئی بالا دستی نہیں رکھتا اور گورا کالے پہ کوئی برتری نہیں رکھتا۔ بلوچ قوم اور اِس وطن کے لیے تو بالخصوص' سب سے غریب اور سب سے دھتکارے ہوئے بلوچ لڑے ہیں۔ بلوچ ویلیو سسٹم کا تقدس انھی غریب (معاشی یا سماجی طور پر) لوگوں کے دم سے قائم ہے۔غیر سائنسی، غیر منطقی اور غیر فطری فضیلت بازی کے چکر میں پڑے بغیر اپنی اِس تصنیف میں ہم ہر ہر باب کے اندر اصلی نقلی کی تفریق کے خلاف بات کرتے چلیں گے۔ اصلی نقلی کی تفریق نہ تو سائنسی ہے، نہ مستند اور نہ علمی ادبی لحاظ سے پسندیدہ۔ شیخ سعدی نے کہا تھا؛

بنی آدم اعضائے یک دیگرند
کہ در آفرینش زیک گوہرند

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ بلوچوں کا ذکر سب سے پہلے ساسانی دورِ حکومت میں (22۔651 عیسوی) ''شاہنامہ فردوسی'' میں ملتا ہے۔ جہاں یہ حقیقت چھلکتی ہے کہ بلوچ، اُس وقت کے جابر و ظالم حکمران نوشیرواں کے عہد تک ایک منظّم قوم بن چکے تھے۔

بلوچوں کی تنظیم کے بارے میں اُس کی ہسٹری کی طرح بہت ابہام پھیلائے گئے ہیں۔اُن میں سے ایک بہت ہی مضبوط انداز و ترک قوم والی بنیاد ہے۔ بلاشبہ ہم میں اور ترک زبان میں تمن، بولک اور اولس وغیرہ بے شمار الفاظ مشترک ہیں۔اسی طرح چاکر، سنجر اور زنگی بھی ایسے الفاظ ہیں جن سے ہمارے ہاں پورے کے پورے قبائل موجود ہیں۔مگر یہ سارا تذکرہ تو بہت حالیہ ہے۔ ساری پیدا کردہ غلطیوں واہموں کا علاج محض ایک فقرہ ہے: ''ہم تو مہر گڑھ زمانے کے لوگ ہیں''۔یعنی گیارہ ہزار سال قبل کے۔ قبیلے تو ابھی چند سو برس قبل تشکیل پائے ہیں۔ جی ہاں چند سو برس قبل آپ کو موجودہ قبیلوں کا ذکر تک نہیں ملے گا۔

ایک اور بات یہ ہے کہ بلوچ ایک بہت بڑے رقبے پہ پھیلے ہوئے ہیں۔اس کے بے شمار قبیلے ہیں۔ چاہیں بھی تو سب قبیلوں کا نام آپ جمع نہیں کر سکتے۔محض چند بڑے اور رابطے میں آنے والے قبائل ہی کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی اُس تفصیل کے ساتھ نہیں جس تفصیل کی توقع اُس قبیلے سے وابستہ افراد کیے رہتے ہیں۔

یہ بات بھی نوٹ کیجیے کہ ہم قبیلوں کے حجم، طاقت، بہادری، فضیلت وغیرہ کی بنیاد پر اندراج نہیں کر رہے بلکہ ہم اپنی کتاب میں قبیلوں کو صرف حروفِ تہجی کے اصول پر بیان کریں گے۔

اربابی

مغربی (ایرانی) بلوچستان کے لوگ ہیں۔اِن لوگوں کو کواشی بھی کہتے ہیں۔ بندر عباس کے بلوچوں کو عباسی کہتے ہیں۔ پاکستانی بلوچستان میں اربابی علیحدہ وجود نہیں رکھتے۔ بلکہ مختلف قبیلوں کی بہت چھوٹی ذیلی شاخوں کی صورت وجود رکھتے ہیں۔

اسماعیل زئی

یہ ''قبائلی اتحاد یہ'' ماضی قریب میں بلوچوں کے کچھ چھوٹے قبیلوں کے اکٹھے ہونے سے

وجود میں آیا۔ یہ لوگ ایران و پاکستان کی سرحد کے ساتھ ریکیوں کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ ان کے علاقے کوہ یارت، غوربند، چشمی، دامک، حیدرآباد، مزارآب اور دِھک پر مشتمل ہیں۔ 38-1937ء کی بغاوت کے دوران شاہِ ایران کی فوجوں نے اسماعیل زئی قبیلے کو شکست دی۔ فقیر زئی، خودزئی، کریم زئی اور اللہ بخش اس کے ذیلی طائفے ہیں، جب کہ توتو زئی، شاہوزئی، حسن زئی اور محمد زئی نامی دوسرے بلوچ قبائل اس میں جذب ہو چکے ہیں۔

بادینی

یہ بلوچ قبیلہ پاکستان، ایران، افغانستان، اور ترکمانستان کی بلوچ آبادی میں وجود رکھتا ہے۔ پاکستانی بلوچستان میں یہ نوشکی کے علاقے میں آباد ہے۔ اس کے علاوہ سندھ اور پنجاب (مظفرگڑھ اور علی پور) میں بھی بادینی موجود ہیں۔ بلوچستان میں تو بادینی اور مری قبیلے کی بڑانی شاخ الگ الگ موجود ہیں مگر پنجاب میں اس فرق میں اچھا خاصا ابہام پایا جاتا ہے۔

بادینی کے ذیلی قبائل میں جیند زئی، انگلزئی، عزت زئی، مصری زئی، جنگے زئی، قمبر زئی، ہالوزئی، گورگیژ، فقیر زئی، مکا کی، کمال زئی، دشتکانڑیں، بنگلانڑیں، مندوزئی، دائزئی اور بلوزئی شامل ہیں (ذرا ملاحظہ کریں کہ بادینی کی اِن شاخوں کے نام سے دوسرے بلوچ قبائل میں بھی گروہ شامل ہیں۔ اور کہیں کہیں تو الگ قبائل اس نام سے موجود ہیں)۔

باران زئی یا بارکزئی

بمپور کے بلوچوں کا یہ طاقتور قبیلہ 1928ء تک بلوچستان پر حکمرانی کرتا رہا۔ مغربی (ایرانی) بلوچستان کا آخری بلوچ حکمران میر دوست محمد، باران زئی تھا۔ اسے شاہِ ایران رضا شاہ اول نے قتل کر دیا۔ باران زئی جالک، دیزک اور ارفشان میں بھی آباد ہیں۔ اس کے چھوٹے اور الگ الگ فرقے کراچی، اندرون سندھ اور وسطی بلوچستان میں بکھرے انداز میں آباد ہیں۔

بِرھمانڑیں

یہ قبیلہ ڈیرہ غازی خان، راجن پور، جام پور اور مظفرگڑھ میں آباد ہے۔ اس کا کچھ حصہ

لیغاری قبیلے میں ضم ہو چکا ہے۔ پھر، اس کا ایک بڑا حصہ ڈومبکی قبیلے کو تشکیل دیتا ہے۔ اس کے علاوہ برہمانڑیں لاڑکانہ، ہالہ، حیدرآباد، کیرتھر پہاڑ اور سمندری ساحل پہ بھی آباد ہیں۔ سرائیکی، اکثریت کی زبان ہے۔ کچھ لوگ سندھی کو مادری زبان کے بطور بھی اپنائے ہوئے ہیں۔ بلوچی سیکھنے کی حسرت عالمگیر ہے۔

بزدار

بزدار بلوچوں کا ایک اور بڑا قبیلہ ہے جس کے لغوی مطلب ہیں؛ ''بکریاں پالنے والا''۔ مگر بزدار اپنے نام کے برعکس بکریاں نہیں بلکہ بھیڑیں پالنے والا قبیلہ ہے۔ گوکہ اب کچھ شہری لوگ اپنے قبیلے کے سپیلنگ Buzdar کے بجائے Bozdar کر کے بکریوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ مگر بلوچ خواہ صنعتی معاشرہ بھی پھلانگ جائیں بھیڑ بکری سے وابستہ الفاظ تو اُس کی جڑوں میں موجود ہی رہیں گے۔

یہ قبیلہ رندولاشار کے زمانے یعنی پندرہویں صدی تک بطور منظّم قبیلہ موجود نہ تھا۔ ہماری قدیم شاعری میں اس قبیلے کا ذکر موجود نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ اس کی تشکیل، بہت بعد میں حالیہ صدیوں میں ہوئی۔

کوہِ سلیمان میں سنگھڑ درے کا مالک یہ رند قبیلہ کیسرانڑیوں کی طرح موسیٰ خیل اور جعفر قبیلوں کے اڑوس پڑوس میں آباد ہے۔ ڈُرگ کئور نامی دریا، بزدار اور کیسرانڑیں کے بیچ حد بندی کرتا ہے۔ کھترانڑ اور بگٹی بھی بزدار کے پڑوسی ہیں۔ بزدار کا علاقہ سارے کا سارا کوہستانی بلندیوں اور گھاٹیوں پر مشتمل ہے۔

بزدار کی ذیلی شاخوں میں دولانڑیں، لدوانڑیں، غلامانڑیں، چاکرانڑیں، سیھانڑیں، شاہوانڑیں، جلالانڑیں، دوستلانڑیں، جہانانڑیں، احمدانڑیں، جافرانڑیں، اور رستمانڑیں شامل ہیں۔

کوہ سلیمان اور راجن پور کے علاوہ بزدار لوگ ملتان، لیہ، تونسہ، دادو، ٹنڈو اللہ یار، ٹنڈو محمد خان، ٹنڈو غلام علی، سکھر، میر خانڑیں، خیر پور، گھوٹکی، سیہونڑ، کھپرو، حیدرآباد اور میر پور ماتھیلو میں آباد ہیں۔

یہ لوگ بلوچستان و پنجاب کی سرحدوں پہ تو مویشی بانی کرتے ہیں اور بقیہ علاقوں میں کاشتکاری۔ کچھ لوگ سرکاری ملازمتوں میں بھی ہیں۔

بُلفتی

مری قبیلے میں ماوند کے مقام پہ باغار نامی ایک رینگنے والے جاندار پر اِس قبیلے کی کلمتی قبیلے کے ساتھ جنگ کے نتیجے میں دونوں کی تباہی کے آثار ابھی ماضی قریب تک ''باغار سر'' میں موجود تھے۔ شاہ لطیف کی شاعری میں ''بُرفت'' کے بطور اِن کا ذکر موجود ہے۔ معلوم نہیں ماوند کے بُلفتی اور سندھ و مکران کے بلفتی / بُرفت ایک ہیں یا الگ الگ۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ الگ الگ لوگ ہیں۔ آپس میں ان کا کوئی تعلق نہیں۔ بُرفت لوگ سہونڑ، کوٹڑی، لیاری، لسبیلہ اور مکران میں بکھرے انداز میں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ باہو، چاہ بہار اور ڈیرہ جات میں بھی اس قبیلے کی ٹکڑیاں موجود ہیں۔

زرداری

یہ زیادہ تر سکرنڈ یعنی نواب شاہ کے بلوچ ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بکھرے طور پر دادو، سانگھڑ، جامشورو اور نوشہرو فیروز میں آباد ہیں۔ یہ لوگ اب شتر بانی کے بجائے کاشتکاری اور تجارت وغیرہ سے وابستہ ہیں۔

بلیدی

ایک تھیوری یہ ہے کہ اس قبیلے کا تعلق دراصل بلیدہ سے ہے جو کہ مکران میں واقع ہے۔ یہ ایک قدیم قبیلہ ہے جو رند و لاشار سے بھی قبل مکران کے بلیدہ میں آباد تھا۔ اس کے علاقے مغربی (ایرانی) بلوچستان میں رسک، قصرقند اور فانوج ہیں۔ بلیدی، مکران میں بہت عرصہ حکمران رہے۔ انھوں نے گچکیوں کو شکست دی تھی اور مکران پر حکمران ہو گئے تھے۔ گچکی کے ساتھ جنگوں کے نتیجے میں اس قبیلے کے کچھ حصے شمالی سندھ میں جا بسے۔

سترھویں صدی تک اس قبیلے کا ایک بڑا حصہ مری بگٹی علاقے میں آباد تھا۔ بالاچ گورگیژ کی ساری دشمنی اسی قبیلے کے ساتھ تھی۔ اور یہ ساری جنگ آج کے مری بگٹی علاقے میں لڑی گئی تھی۔

مشرقی علاقوں میں بلیدی سبی، گنداواہ، پٹ فیڈر، جیکب آباد، ٹنگوانی، کندھ کوٹ اور کشمور اور پنجاب میں آباد ہیں۔ اِس کی ذیلی شاخیں یوں ہیں: گولہ، جوفوزئی، کھرکانڑیں، بجارانڑیں، سُندرانڑیں، پیتافی، سوہریانڑیں، تیغانڑیں، ہاجیجہ، لولائی، پیتافی اور ریعیتی۔

انھیں بردی بھی کہا جاتا ہے، بالخصوص اُس گروہ کو جو سندھ میں آباد ہے۔

بقال

یہ باقاعدہ ایک لگا بندھا قبیلہ نہیں ہے۔ بلکہ بہت سے قبیلوں / برادریوں کا مجموعہ ہے۔ یہ متفرق مائتھالوجیکل عقیدہ رکھنے والا دکاندار طبقہ ہے۔ دکانداری میں یہ کہیں بلوچی بولتا ہے تو کہیں براہوئی۔ مگر گھر میں یہ لوگ سندھی، اور سرائیکی بولتے ہیں۔ سکھ دھرم کی معمولی اقلیت نے بھی خود کو اسی بڑے نام میں شامل کر رکھا ہے۔

بقال بلوچستان میں کچھ مقامات میں مستقل رہتے ہیں اور کہیں فیملی کے بغیر دکانداری کرتے ہیں۔ بقال بلوچستان میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں کہ ہر جگہ کے لوگوں کو اشیائے صرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اشیائے صرف کی ضرورت ایک بنیادی انسانی خاصیت ہے۔ بلوچ معاشرے میں یہ اشیا بقال سپلائی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت معمولی تعداد میں یہ لوگ ملازمتیں بھی کرتے ہیں۔ کاشتکاری سے شاید ہی کوئی وابستہ ہو۔

بقال کبھی بلوچ کے غلام نہیں رہے۔ یہ ٹریڈرز ہیں اور اپنی مذہبی رسومات میں مکمل آزادی رکھتے ہوئے، سردار کو معمولی ٹیکس نما تحفے تحائف دینے کے عوض تجارت میں مکمل آزادی رکھتے تھے۔ ان کی جان اور مال متعلقہ قبیلے کے فیوڈل کی ذمہ داری ہیں۔ بلوچ نے ابھی تک کہیں بھی انھیں خود میں شامل نہ کیا۔ اس لیے کہ ابھی تک قبائلی زمین سے کسی ہندو کو بھی حصہ نہ دیا گیا۔ قبیلے میں ضم کرنے کا مطلب باہمی رشتے داریاں کرنا بھی ہوتا ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہے۔

بنگلزئی

یہ ایک بڑا قبیلہ ہے۔ یہ لوگ بلوچستان کے کئی علاقوں میں آباد ہیں۔ بنیادی طور پر رند بلوچ ہیں اور بلوچی بولتے ہیں۔ یہ قبیلہ ریاست قلات کے سراوان قبائل میں شمار ہوتا ہے۔ مگران

کے کچھ طائفے براہوئی اور سندھی بھی بولتے ہیں۔سندھ میں بکھرے ہونے کے علاوہ اصل قبیلہ اپنے علاقے نرمک وجوہان میں رہتا ہے۔ اس قبیلے کا اچھا خاصہ حصہ کوئٹہ کے سریاب اور بروری علاقوں میں رہتا ہے۔اُن کی سرداری پہلے گوہرام زئی کے پاس تھی جو بعد میں سیدزئی کے پاس آ گئی۔اُن کا فیوڈل ہیڈکوارٹر اسپلنجی ہے۔

اس اپنے جدِ امجد بنگلؔ سے منسوب قبیلے کے ذیلی طائفے یوں ہیں؛ گوہرام زئی، دینارزئی، گرّانڑیں، شوران زئی، بدوزئی، بجارزئی، شاہوزئی، مندوانڑیں، پُرّ، پھُگ۔

ملاّ مزار بنگلزئی زبردست سامراج دشمن شاعر تھا۔

بیزن جو

رند بلوچ سے وابستہ یہ قبیلہ ایک وسیع علاقے میں آباد ہے (ہیتو رام، صفحہ 333)۔نال تو سارے بلوچوں کے لیے معتبر شہر ہے کہ بابا غوث بخش بزنجو کا گھر، قبر اور لائبریری یہاں ہے۔ محترمہ جان بی بی بھی یہاں کی سیاسی نامور شخصیت تھیں۔حاصل بزنجو نے بزنجو کے نام کو معتبر بنایا۔ بزنجو نال، آواران، کولواہ، جھاؤ اور بیلہ میں بھی آباد ہیں۔ایرانی بلوچستان میں بھی بزنجو دیکھے جا سکتے ہیں۔یہ لوگ بلوچی بھی بولتے ہیں براہوئی بھی۔پہاڑ میں بھی رہتے ہیں اور میدان میں بھی۔

’’بیزن‘‘ نام نہیں ہے بلکہ امتیازی خطاب ہے جس کا اطلاق بعد میں سارے قبیلے پر بزنجو یعنی بیزن کی اولاد کی صورت میں ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب احمد شاہ ابدالی افغانستان کا بادشاہ بنا اور اس کے فوراً بعد اس نے افغان سرداروں کو جو خطاب دیے ان میں سردار میر جہاں خاں پوپلزئی بھی تھا جس کو احمد شاہ نے میر بیزن اور خان خانان کا خطاب دے کر اپنی فوج کا سربراہ مقرر کیا تھا۔

حملانڑیں، بزنجو قبیلے کا سردار خیل طائفہ ہے۔اس کے علاوہ بزنجو کی ذیلی شاخیں یہ ہیں: تمرانڑیں، ہومرانڑیں اور سیاہ پاذ۔

پرّکانڑیں

چھوٹا مگر قدیم قبیلہ ہے۔ خانہ بدوشی اور مویشی بانی کرتا ہے۔کوئٹہ کے آس پاس اور افغان سرحد پر مویشی بانی کے سبب خانہ بدوشیاں کرتا رہتا ہے۔اس کی ایک آدھ ٹکڑی نوشکی میں

نیم خانہ بدوشی کرتا ہے۔بھیڑ پال روزگار کی مطابقت میں ہمہ وقت چوکنا رہنا اِس قبیلے کی اجتماعی نفسیات ہے۔

حبیب جالب بلوچ اسی قبیلے کا چشم و چراغ تھا۔ وہ نہ صرف سیاسی راہنما تھا بلکہ بلوچستان کی تاریخ پر ایک معتبر انگریزی کتاب کا مصنف بھی تھا۔

پیتافی

بلوچی زبان میں دو خوب صورت باہم متضاد الفاظ ہیں؛ پیتاف اور سابند۔سابند وہ علاقہ ہوتا ہے جہاں اکثر سایہ رہتا ہو۔ پیتاف دھوپ کو کہتے ہیں، اور جہاں ہر وقت دھوپ رہتی ہواُسے پیتافی کہا جاتا ہے۔

اس’’ پیتاف‘‘ لفظ کے کارن قبیلے کا نام پیتافی پڑا۔بلوچ قبائل میں بہت ہی کم قبائل ایسے ہیں جن کے نام موسمی اثرات سے اور مقامات سے وابستہ ہوں۔ پیتافی اُن میں سے ایک قبیلہ ہے۔یہ ڈیرہ مراد جمالی میں گوٹھ پتافی میں آباد ہے، جو سرائیکی بولتا ہے۔اس قبیلے کے لوگ ڈیرہ جات (غازی خان اور اسماعیل خان) میں آباد ہیں۔ کچھ لوگ مظفر گڑھ میں بھی سکونت رکھتے ہیں۔اسی طرح، منتشر انداز میں سندھ میں بھی اس قبیلے کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بکھری ہوئی ہیں۔

تالپور

تالپور یا تالپر ہوت بلوچ ہیں۔انھوں نے کلہوڑوں کو شکست دے کر سندھ میں حکومت قائم کی۔ان کی حکومت 1783ء سے لے کر 1843ء تک قائم رہی۔یہ میروں کی حکومت کہلاتی تھی۔

یہ حکومت چلتی رہی تا آنکہ 17 فروری 1843ء کو انگریز نامی ابلیسیت نے حملہ کر دیا۔تالپور حیدر آباد کے قریب میانی کے مقام پر انگریز سے شاندار سامراج دشمن جنگ لڑے۔ بلوچیت یعنی بہادری، انسانیت، اور قول کی پکائی جیسی عالمگیر صداقت سامراجیت یعنی روباہی، عہد شکنی، اور سازش کے سامنے شکست کھا گئی۔

تئوکی

بہت چھوٹا ایرانی بلوچستان کا قبیلہ ہے۔دوسرے حصوں میں موجود نہیں ہے۔ یہ لوگ

بلوچی زبان بولتے ہیں۔ انگریز کی 1911ء کی مردم شماری میں اُن کے ذیلی طائفے یوں لکھے گئے تھے: چاکرزئی، ہُرماگی، کوچال زئی۔

ٹیہہ

یہ بھی ذات پات کا شکار دوسرے درجے کے بلوچ تصور ہوتے تھے۔ ڈاکٹر غلام نبی ساجد بزدار کی معلومات کے مطابق یہ زرخرید غلاموں کا طبقہ ہوتا تھا۔ اب یہ خرید وفروخت باقی نہیں رہی۔(3) لہٰذا اب ان کا الگ سے کوئی وجود موجود نہیں ہے۔

جام

جام، لسبیلہ کے فیوڈل اور انتہائی سخت گیر حاکم ہیں۔ لسبیلہ میں مثال ہے کہ ننذے بیلوا جامہ سلام نہ خنئے؟ (بیلہ میں رہ کر جام کو کیسے سلام نہ کروگے؟)۔ مگر صدیوں تک تاریکی میں رہنے کے بعد اب سولائزیشن کی کرن یہاں کے عوام میں بھی پہنچ رہی ہے۔

جاموٹ

جاموٹ ایک بہت ہی ملا جلا بلوچ قبیلہ ہے۔ پٹ فیڈر میں رہنے والے یہ لوگ زیادہ تر بلوچوں میں کسان طبقہ تشکیل دیتے ہیں اور کسانوں کی جاگیردار دشمن جدوجہد دراصل اسی مخلوط قبائلی اتحادیے کی جدوجہد رہی ہے۔

بلوچستان کے پٹ فیڈر کے زرعی علاقے میں کسان اپنے طبقاتی حریفوں کی طرف سے، اور خود اپنی طرف سے اس مجموعی نام کو خود پہ قبول کر چکے ہیں۔ ظلم یہ ہوا کہ وہ پہلے تو بلوچ کی صف سے نکالے گئے تھے، اب وہ آہستہ آہستہ برابر درجے کے شہری ہونے سے بھی باہر کیے جارہے ہیں۔ طبقاتی نظام اپنے ساتھ بدترین چھوت چھات لاتا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ سیاسی تحریک اس ساری ''جاگیردار'' ساختہ باتوں روایتوں کو برباد کردے گی۔

جت

جت ایک مخلوط النسل گروہ ہے۔ یہ سردعلاقوں کو چھوڑ کر بقیہ بلوچستان کے عام بلوچوں کی طرح ''سوزارنگ'' ہوتے ہیں۔ زیادہ تر شتربانی کرتے ہیں۔ صرف مخلوط النسل نہیں بلکہ یہ لوگ

پورے بلوچ وطن میں بہت اقلیت کی صورت بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے پاس (شاید کہیں بھی) زمینی ملکیت نہیں ہے۔

اور بلوچ سماج میں ایسا گروہ دوسرے درجے کے شہریوں میں شمار کیا جاتا تھا جس کے پاس 'قبائلی'' زمین نہ ہوتی۔ کاش بلوچ کا قلم ٹوٹا نہ ہوتا! ہمارے پاس قویل جت کو سپارٹیکس بنا کر ایک ناول لکھنے کا موضوع موجود ہے۔ بلوچ قوم ابھی بلوغت کی اس سطح تک نہیں پہنچی جہاں اپنے سارے ممبروں کو برابری کا درجہ دے سکے۔

جت کی اکثریت بلوچستان کے شمال مشرقی حصے میں رہتی ہے۔ اس کے فرقے ہیں؛ میر جت، لاشاری، براہاٹریں (باہراٹریں)، مجیدانی، بُھنڈا، لنجوانی، ببر، وسوانیا اور بلادی (4)۔ اسی طرح کنڈ کانی، حجانو، دائی دانو بھی جت ہیں۔

میں مؤرخین و محققین کو ان کے محبوب/ محبوبہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ وہ جت کو بلوچستان سے باہر والا قرار دینے کے دھندے میں نہ پڑیں۔ جت یہیں کا، بلوچستان کا سنہرا بیٹا ہے۔

یہ عموماً تو شتربانی کرنے والے بلوچ ہیں۔ اگر وہ مری بگٹی اور دیگر مشرقی قبائل کے اندر ہیں تو مالکوں کے اونٹ (بگ) چراتے ہیں۔ ہماری کلاسیکل شاعری لفظ ''بگ جت'' سے بھری ہوئی ہے۔ ملک الشعرا گل خان نصیر نے تو یہ لفظ محنت کشوں یعنی مچھیروں، چرواہوں، کسانوں کے ساتھ استعمال کیا۔

یہ لوگ دوسری جگہوں پر خود اپنے اونٹ بھی رکھتے ہیں۔ اور یہ اونٹ وہ باربرداری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ انجن آنے سے قبل تجارتی مال اونٹوں کے قافلوں کے ذریعے آتا جاتا تھا۔ مقامی طور پر بھی اور دور دراز سے بھی۔ مثلاً سومیانی بندرگاہ سے لے کر ملتان تک اور سومیانی بندرگاہ سے لے کر کندھار تک کاروانوں کے کاروان چلتے تھے جو درآمدی اشیا لاتے تھے اور برآمدی اشیا لے جاتے تھے۔ ان کاروانوں کے حوالے سے بلوچ سماج میں ٹیکس، سرائے، ٹریفک کے قوانین بنے۔ شعروادب اور کلچر کو زبردست ترقی ملی۔

یہ پٹ فیڈر علاقے میں زراعت کے پیشے سے بھی وابستہ ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر سرائیکی بولتے ہیں۔لیکن اگر وہ الگ الگ بڑے قبائل میں پڑے ہیں تو وہاں کے جت سلیمانی بلوچی بولتے ہیں۔

جتک

ایک آدھ بکھری اکھڑی شاخیں سندھ اور ڈیرہ جات میں رہتی ہوں گی۔مگر اس قبیلے کا بڑا اور مرکزی حصہ بلوچستان میں رہتا ہے۔نسبتاً چھوٹا قبیلہ ہے اور دیگر بلوچوں کی طرح مویشی بانی کرتا ہے۔ کچھ لوگ کوئٹہ کے گردونواح میں گاؤں آباد کیے ہوئے ہیں جہاں وہ چھوٹا کاروبار، سرکاری ملازمت اور دیگر شہری روزگار کرتے ہیں۔

جتوئی

ایک وسیع علاقے میں بکھرا قبیلہ ہے۔جتوئی ہزاروں کی تعداد میں سندھ میں رہتے ہیں۔ پنجاب بھر میں موجود ہیں۔ بالخصوص مظفر گڑھ، ساہیوال، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، جھنگ، شاہ پور اور لاہور میں۔اس بلوچ قبیلے کی بہت کم تعداد بلوچستان میں رہتی ہے۔اس رند قبیلے کی ذیلی شاخیں ہیں؛مظفرانڑیں، فتح ہانڑیں، شاذیں زئی، خلورانڑیں۔

ہمارا بزرگ جناب حیدر بخش جتوئی انقلابی کے بطور شہرت کے آسمانوں کو چھو گیا تھا۔اس نے بہت ہی خوبصورت سیاست کی اور شاعری کی۔

جروار

یہ قبیلہ بلوچستان میں تو مری کے گزینی کا حصہ ہے۔مگر سندھ اور پٹ فیڈر میں یہ تقریباً ایک الگ قبیلے کی صورت یہاں وہاں بکھرا ہوا ہے۔ یہ بلوچستان میں مویشی بانی مگر زرعی علاقوں میں کاشتکاری سے وابستہ ہیں۔

جروار، شہدادکوٹ، کمبر، لاڑکانہ، سانگھڑ، حیدرآباد، بدین، میرپورخاص، کشمور اور جیکب آباد میں اب کہیں کہیں ایک الگ قبیلے کے بطور بھی موجود ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ جروار راجھستان ہندوستان میں بھی ہیں اور بلوچی بولتے ہیں۔

جسکانڑیں

یہ بلوچ قبیلہ بلوچستان میں کم، اور سندھ و پنجاب میں زیادہ تعداد میں آباد ہے۔ بالخصوص ڈیرہ غازی خان کے علاقے میں۔کیا یہ لوگ بلوچی لفظ ''جسک'' (Jusk) سے منسوب ہیں جس کے معنی ہیں؛ ''جھنجھوڑ ڈالنا''؟

جکھرانڑیں

جکھرانڑیں کچھی اور شمالی سندھ کا بڑا قبیلہ ہے۔ رند کی شاعری میں اس کا تذکرہ موجود نہیں۔یعنی یہ بعد میں تشکیل پانے والا قبیلہ ہے۔ان میں سیاہ پاذ نامی قبیلہ موجود ہے۔جس کا بڑا حصہ الگ شناخت کے بطور خاران میں آباد ہے۔

یہ دراصل ایک اور رندی قبیلہ ڈومبکی کی ذیلی شاخ ہے۔مگر اب خود اتنا مشہور قبیلہ بن چکا ہے کہ اپنے الگ نام سے ہی جانا پہچانا بن چکا ہے۔

جمالدینی

گو کہ یہ قبیلہ بلکہ وہ علاقہ بھی، ہم سرحد کے اِس پار کے بلوچ دانش وروں اور مؤرخوں نے بری طرح نظرانداز کر رکھا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ بلوچ تاریخ ان لوگوں کو نظرانداز کرنے کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔خواہ انگریز ہو یا ایرانی حکمران، یہاں کے قبائل کمال بلوچیت دکھاتے رہے ہیں۔ سردار جیئند خان اس پورے خطے کا مشہور شخص گزرا ہے۔ برطانوی سامراج کے خلاف بالخصوص اس قبیلے نے زبردست جنگیں لڑیں۔

علم و ادب کی دنیا میں میر عبداللہ جان جمالدینی اور اس کا بڑا بھائی آزات جمالدینی بلوچ آسمان کے بڑے درخشاں ستارے ہو گزرے ہیں۔

جمالی

بلوچستان میں جعفر آباد، روجھان، اور نصیر آباد میں رہتے ہیں۔سندھ (مورو، دادو، نواب شاہ، حیدرآباد اور ٹمیاری) کے علاوہ پنجاب میں بھی جمالی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔قبیلے کی اہم شاخیں یہ ہیں؛ تھارانڑیں، شاھلیانڑیں، شاھل زئی، مندرانڑیں، ساہریانڑیں (دراصل کھوسہ

ہیں)، وسوانڑیں، بھندانڑیں، بابر، ٹینگیانڑیں، مانجھی، پہنوراور ریحان والس۔(5)

نہری پانی ملنے سے پہلے یہ بہت ہی غریب قبیلہ مویشی بانی اور بزگری کرتا تھا۔ نہر آنے کے بعد سے اس قبیلے کا ایک حصہ بلوچستان کا فیوڈل طبقہ تشکیل کرتا ہے۔ اس علاقے میں کسان تحریک کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ سر اٹھاتی رہتی ہے۔ اس تحریک کو دبائے رکھنے کی خاطر جمالی فیوڈلز مرکزی سرکار کی حمایت پر مجبور، مامور، اور تیار رہے ہیں۔

چانڈیہ

سیوی، لاڑکانہ، اورڈیرہ غازی خان میں بودوباش رکھتے ہیں۔ ''چانڈکا'' کے نام سے تو لاڑکانہ میں اُن کی حکمرانی ہوا کرتی تھی۔ اس بہت بڑے مگر بہت بکھرے قبیلے کی شاخیں یہ ہیں:
گرمانڑیں، حسنانڑیں، آجیانڑیں، سخانڑیں، کبرانڑیں، غیبانڑیں، مارفانڑیں، چولیانڑیں، بنگلانڑیں، مصرانی، الہیارزئی، میروانڑیں، بھنڈانڑیں، مرزانڑیں، حیدرانڑیں، للوانڑیں، نوثانڑیں......۔ ایک ویب سائٹ(6) میں ذکر ہوا کہ یہ قبیلہ رند و لاشار کی جنگ کے زمانے میں ہربوئی اور ڈھاڈر سے نکل کر ڈیرہ غازی خان کے علاقے آیا۔ اُن کے اس زمانے کے سردار ہیرین خان کی قبر حضرت سخی سرور کے احاطے میں ہے۔ یہاں سے یہ قبیلہ لاڑکانہ مائیگریٹ کرگیا۔ جنگیں، قحط سالیاں، ناراضگیاں اور چراگاہیں ہماری مہاجرتوں کا سبب رہی ہیں۔

چانڈیو کے نام کے مترادفات بے شمار ہیں۔ ذرا سے ہجے بدل دیں تو آپ کو یہ قبیلہ بلوچستان میں سیوی، جعفرآباد، اوستہ محمد، بولان، خضدار، کرخ، بارکھان، ماونداور گوادر میں ملے گا۔ سندھ اور پنجاب تو خصوصی طور پر گنجان انداز میں چانڈیہ کے رہائشی مراکز ہیں۔ ضلع لاڑکانہ، ضلع کمبر، ضلع دادو، ضلع نواب شاہ، میرپورخاص، بدین، کراچی، شکارپور، سکھر، خیرپور......سب چانڈیہ ہی چانڈیو۔ اُدھر آپ ملتان جایئے، مظفرگڑھ جایئے، لیہ اور بکھر اور دریاخان جایئے، چانڈیہ آپ کو وہاں کے مستقل باشندوں کے بطور ملیں گے۔

خشک

یہ بلوچ قبیلہ گھوٹکی، ٹھٹھہ، دادو، کنڈیارو، شکارپور، ٹیاری اور حیدرآباد میں بکھرے انداز

میں آباد ہے۔ بلوچستان میں سیوی، اوستہ محمد، تربت، نصیرآباد، جھل وغیرہ میں ان کی ٹکڑیاں آباد ہیں۔ ڈیرہ غازی خان، رحیم یار خان، مظفرگڑھ اور خان پور میں بھی خشک رہتے ہیں۔ مگر بکھرے ہوئے۔

خوجے

قدیم وقتوں سے ساحلی علاقوں کے بلوچ ہیں۔ ہمیشہ سے تجارت سے وابستہ رہے ہیں۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے ان کے پاس ہر ملک کا سکہ ہوتا تھا۔ بیورغ رند نے اپنی شاعری میں سیوی کے علاقے میں ان کی موجودگی بتائی ہے۔

دامانی

یہ قبیلہ ایران، چاغی اور کوہِ سلیمان میں آباد ہے۔ اس کی ذیلی (بہت بڑی) شاخیں ہیں: یاراحمدزئی، اسماعیل زئی اور گمشادزئی۔ اب تو یہ خود الگ اور آزاد قبیلوں کی شکل اختیار کرگئے ہیں۔

دُرّازئی

ایرانی بلوچستان کا قبیلہ ہے۔ بمپشت اور ہیدوچ کی خوبصورت وادیوں کا مالک ہے۔ اس کی چھوٹی سی آبادی پاکستانی بلوچستان میں بھی آباد ہے۔ اس کے علاوہ خلیجی ممالک میں محنت کرتے ہیں۔

دَرزادَغ ، نقیب

ان ناموں سے بلوچوں کے گروہ مکران، لسبیلہ اور اندرونِ سندھ میں آباد ہیں۔ یہ کام کرنے والے محنت کش ہیں اور زراعت اور قبل از زراعت پیشوں سے وابستہ ہیں۔ یہ جفاکش لوگ مختلف قسم کی دستکاریوں کے ماہر ہیں۔ ثقافتی سرگرمیاں بھی انہی کے دم سے رنگین و آرٹسٹک ہیں۔

خداہماری قوم کو اس قابل بنادے کہ ہم اپنے محنت کش، اور فنکار انسانوں اور گروہوں کی توقیر کریں۔ اِن لوگوں نے بلوچ قوم کو بہترین فرزند عطا کیے ہیں۔ جنھوں نے سیاست، جمہوری جدوجہد، کلچر اور موسیقی میں ہمارا نام روشن کیا۔

دریشک

رند شاخ کا یہ قبیلہ کوہِ سلیمان کے قبیلوں میں سب سے بکھرا ہوا قبیلہ ہے جس کے گاؤں زیادہ تر دریائے سندھ کے کناروں پر واقع ہیں۔ پہاڑ میں ان کا کوئی قابل ذکر ٹھکانہ نہیں ہے۔ یہ قبیلہ ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان میں آباد ہے۔ اکّا دکّا گھرانے سندھ میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ وہ رند ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ جلال خان کے بیٹے ہوت کی اولاد ہیں۔ اس کی قابلِ ذکر شاخوں میں کرمانڑیں، منگوانڑیں، گولپاذ، سرگانڑیں، اریانڑیں، اور جسکانڑیں شامل ہیں۔

دریشک کے لفظی معنی ''مضبوط'' کے ہیں۔(7) دلچسپ ہے کہ کوہِ سلیمان کے بلوچ بینا نامی پرندے کو ''دریشک'' کہتے ہیں۔ اس نامور قبیلے کا صدر مقام راجن پور کے قریب اسنی ہے۔

دشتی

(دشت سے دشتی)۔ پاکستانی اور ایرانی بلوچستان دونوں میں یہ لوگ موجود ہیں۔ مری قبیلے میں ایک ذیلی فرقہ بھی اسی نام سے موجود ہے۔ مری کا دشتی بہت ضدی اور ہٹ دھرم قبیلہ ہے۔ ان کے بارے میں مقولہ ہے: دشتی، بے گوشتی۔ مکران میں بھی دشتی آباد ہیں۔

اس کے علاوہ مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، اور شاہ صدر دین میں شین کے تینوں نکتے حذف ہوکر ایک بڑا قبیلہ ''دستی'' کا موجود ہے۔

دیہوار

دہوار، یا، دہقان ہم معنی الفاظ ہیں۔ زراعت پیشہ یہ لوگ ریاست قلات کو زرعی آمدن عطا کرنے والے رہے ہیں۔ مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ فارسی اور بلوچی سے مخلوط ایک زبان بولتے ہیں جسے دیہواری کہتے ہیں۔ خانہ بدوش نہ ہونے اور ایک جگہ پر آباد ہوکر کاشتکاری کرنے کی وجہ سے اُن کو تعلیم، اور پیشہ ورانہ ہنرمندی حاصل کرنے کے مواقع زیادہ ملے۔ اس طرح دفتری تعلیمی، ثقافتی، صحافتی اور سیاسی میدان میں انہیں بہت آسانیاں رہیں۔ خانِ قلات کے درباری امور صدیوں تک دیہوار سنبھالتے رہے۔ دربار کے لیے ریونیو ٹیکس جمع کرنا، رسائل و وسائل، ریکارڈ

رکھنا اور دربار کا عمومی نظم و نسق یہی لوگ چلاتے رہے۔ اس کے علاوہ خان کے دستہِ خاص میں بھی دیہوار لوگ موجود رہے۔

مستنگ شہر بلوچ سامراج دشمن قومی سیاست میں اہم ترین کردار ادا کرتا رہا ہے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ بلوچ سیاست (بالخصوص بیسویں صدی کے نصفِ اول میں) پوری کی پوری انھی کے گرد گھومتی رہی ہے۔

1920ء میں ''انجمن اتحادِ بلوچاں'' نے بلوچ سیاست میں پہلی بار ماقبل فیوڈل صورت بدل ڈالی۔ اس تحریک نے شہری بورژوازی، تعلیم یافتہ نوجوان اور مذہبی وقبائلی اشرافیہ میں سے قوم پرست ذہنوں کو اپنی طرف کھینچا۔

اس مخلوط قبائلی اتحاد یہ میں مندرجہ ذیل طائفے شامل ہیں؛

خواجہ خیل، تیر پچی، شیخ، سارنگ زئی، زڑخیل، آبی زئی، ہیبت زئی، یوسف زئی، محمود زئی، توران زئی، بڑھا زئی، سنجر زئی، مندو زئی، ہوتی زئی، دادی زئی، قاضی، تاجک، ڈھاڈری زئی، رند، ملازئی، مغل زئی۔

ڈومب

یہ سمجھیے بلوچ کلچر کے رکھوالے ہیں۔ ایک اہم ترکیبی جُز ہے۔ جنگ وامن میں خبر لانے اور لے جانے والا ہوتا تھا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر دور دراز تک لوگوں کو دعوت نامے (لوٹ) پہنچاتا تھا۔ موسیقی سے لے کر رقص تک، اور جنگی ماحول میں متحارب فریقین کے بیچ سفارت کاری سے لے کر قبائلی امور میں مشاورت تک کے اہم ترین فرائض انجام دینے والا یہ گروہ کوئی الگ قبیلہ تشکیل نہیں دے سکا۔ ہر قبیلے اور ذیلی طائفوں کا اپنا اپنا ڈومب ہوتا تھا۔ اور ڈومب کا یہ ''عہدہ'' موروثی تھا۔

بلوچ راج میں فنکار کی حیثیت بھی، لوڑی کو حاصل ہے۔ یہ نسل در نسل موسیقی کے مختلف ساز بنانے اور بجانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ یہ بلوچ شہری محنت کش طبقے کی بھی تشکیل بھی کرتے ہیں: دارتراش (لکڑی کا کام کرنے والا)، آسن کار (لوہار) زرگر (سنار) وغیرہ۔ ان کے اندر جدید دور کا سورج بہت نرم گامی سے داخل ہو رہا ہے۔ تعلیم، نوکری اور سیاسی شعور ان کی نجات کی دُور

افتادہ منزل کی طرف اُن کو مدد دے رہے ہیں۔(18)

یہ وہ فنکار لوگ اور گھرانے ہیں جنھیں عزت سے ''لوڑی'' کہا جاتا ہے۔مگر سچی بات یہ ہے کہ ہمارے سماج میں ابھی تک اِن کے شایانِ شان عزت، وقار اور مقام نہیں بن سکا ہے۔ یہ موسیقار ہمارے سماج کے پائین ترین درجے کے شہری ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ لوڑی کا درجہ غلام سے بھی کم تر ہے۔ یہ مخصوص خاندانوں سے ہوتے ہیں۔ یہ شادیوں میں، جشن میں گانے گاتے ہیں، ساز بجاتے ہیں، رقص کرتے ہیں مگر پھر بھی یہ ''اصل'' نہیں شمار کیے جاتے ہیں۔انھیں ''کم اصل'' کا گھٹیا درجہ دیا گیا ہے۔ان کا کوئی خون بہا، کوئی انتقام، کوئی سیاہ کاری قابلِ قدر نہیں ہوتی۔ اگر کوئی بلوچ کسی لوڑی یا ڈُومب کی عورت سے شادی کرے تو اس کی اولاد کو جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ملتا۔لوڑی کی بیوی یا ماں عموماً علاقے کی دائی (نیم حکیم) ہوتی ہے۔

لوڑی سارے بلوچستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

بلوچستان، جو بھیانک انداز میں بے اتفاق رہا، بری طرح توڑ پھوڑ میں رہا، اور ہلاکت خیز جنگوں کی سرزمین رہا، وہاں ڈومب اور لوڑی کو قتل کرنا جرم تھا۔ گو کہ ہر قبیلے کا اپنا اپنا لوڑی گھرانہ ہوتا تھا مگر یہ جنگی حالت میں بھی دوسرے قبیلے میں آ جا سکتے تھے۔ان کی قبائلی ڈیوٹیاں بے شمار تھیں۔ ہمارا خیال تھا کہ صرف مکران میں ان کی ذرا برابری ہوگی اس لیے کہ وہاں کے دانش وروں کے بقول ''قبائلی نظام ٹوٹ گیا''۔مگر وہاں بھی بدقسمتی کو بدقسمتی ہی کہا جاتا ہے۔

ڈومب، لوڑی بھی تھا، سنار بھی، نغمہ نگار بھی، گلوکار بھی۔ پیغام بر بھی تھا اور رشتے کرانے والا بھی۔ وہ ہر فن مولا ہے۔قوم کو ابھی بلوچی زبان و ادب اور ثقافت کے امین ان لوگوں کی ترقی اور بہبود کا بہت سارا کام کرنا ہے۔

ڈومبکی

عام قیاس ہے کہ یہ قبیلہ بنیادی طور پر ایرانی بلوچستان کے ڈومبک دریا کے علاقے سے متعلق ہے۔

ڈومبکی ایران کے علاوہ سندھ میں جیکب آباد، کشمور اور بخشاپور میں بھی رہتے ہیں۔مگر

ان کا اصل علاقہ لہڑی ہے۔

یہ رند قبیلہ مشرقی سلیمانی بلوچی بولتا ہے۔دیر خانی، گبول، دیناری، میروزئی، بھرمانڑیں، بغداد، بھنڈ، غازیانڑیں، براہمانڑیں، شاہ بلی، گشکوری، کھوسہ، لاشاری، محمدانڑیں، شف کور، سنگیانڑیں، سہریانڑیں، تالانی، گورگیژ، ہاڑا، جمبانڑیں اور وزیرانڑیں اس کے مشہور ذیلی فرقے ہیں۔جکھرانڑیں اسی قبیلے کی ایک شاخ ہے جو اب خود ایک بڑا قبیلہ بن چکا ہے۔

بلوچوں اور ان کے قبائل کے بارے میں تاریخی معلومات رکھنا اس قبیلے کی موروثی ذمہ داری رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اُن کے پاس ''دفترِ علم الانساب'' موجود ہے جو 1840ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں شائع ہوا تھا۔(8)

ڈومبکی قبیلہ بہت قدیم قبیلوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا ذکر قدیم بلوچی شاعری میں موجود ہے۔انگریز کے خلاف یہ قبیلہ خوب خوب لڑا۔

پہلوان فقیر کتنا خوب صورت شاعر ہے!!

رخشانڑیں

دریائے رخشان سے منسوب ہیں۔رخشانڑیں دراصل اپنی قبائلی بنیادیں ختم کر چکا ہے اور اپنے ذیلی فرقوں میں اس طرح بٹ گیا ہے کہ ہر فرقہ خود ایک بڑا، مکمل، اور الگ قبیلہ بن چکا ہے۔

خاران، راس کوہ، نوکنڈی، دالبندین، نوشکی، مکران، افغانستان (گرم سیل اور گریش)، ایران (سیستان، خراسان) اور ترکمانستان ان قبائل کے وطن ہیں۔ یہ بہت بڑا قبائلی اتحادیہ ہے۔اس قبائلی اتحادیے میں سیاہ پاذ، بادینی، جمالدینی، ریکی، نوشیروانی، ماندائی، اور نوتی زئی شامل ہیں۔

یہ لوگ بلوچی کا خوب صورت لہجہ ''رخشانی'' بولتے ہیں۔یہ شتر پال بھی ہیں اور کاشتکاری بھی کرتے ہیں۔ بلوچستان میں سیاست اور ادب و صحافت کے میدان میں بادینی اور جمالدینی کا اہم مقام ہے۔

رند

رند کو اکثر بلوچ قبیلوں کا سرچشمہ جانا جاتا ہے۔ بالخصوص مشرقی بلوچستان کے بڑے

بڑے قبیلے رند کی شاخوں کی حیثیت سے خود کو پہچانتے ہیں۔ مثلاً بزدار، گشکوری، عمرانڑیں، جکھرانڑیں، قیصرانی، مزاری، مستوئی،نوشیروانی،رخشانی وغیرہ۔ اسی طرح مری، بگٹی ،چانڈیا، کہیری، ہوت، جمالی، بلیدی، ڈومبکی ،لُنڈ ،لیغاری اور کھوسہ۔

ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان،مظفر گڑھ، ملتان، لیہ، رحیم یار خان، جھنگ، شاہ پور اور سیالکوٹ میں جو رند رہتے ہیں اُن کی مرکزیت اب ختم ہوچکی ہے۔ چندن ہار کے یہ ٹوٹے دانے بس،شانِ ماضی کی ہی مشترک میراث رکھتے ہیں۔ سبی کے غلام بولکوں کا بھی یہی حال ہے۔

میر چاکر خان اور اس کا پورا عہد ''رندی عہد'' کہلاتا ہے۔تاریخِ بلوچستان کا ایک پورا باب اس عہد سے وابستہ ہے۔

رند نے بے شمار بلوچ قبائل کو جنم دے کر بھی اپنا اصل نام آج تک برقرار رکھا ہوا ہے۔ اورسیوی وشوران میں آج بھی رند کے نام سے ایک قبیلہ موجود ہے۔ یہ رند قبیلہ بڑے رند کی محض ایک ذیلی شاخ ہے۔ جس کی اپنی ذیلی شاخیں یوں ہیں؛ چاکرانڑیں،چانڈیہ، چلگری، چولانڑیں،ازدی ، بادینی ، بجارزئی، بزدار، دنیاری، فیروزئی، گبول،گدائی، گدری،غلام بولک، ہڈ دار، ہوتانزئی۔سیوی کے قریب شوران میں اس ذیلی قبیلے کے فیوڈل رہتے ہیں۔

دہلی کے آس پاس رند ملیں گے، ایرانی بلوچستان، پنجاب، اور سندھ میں یہ قبیلہ اپنے نام سے وجود رکھتا ہے۔

رودینی

اس قبیلے کا صدر مقام تو سوراب میں ہے مگر یہ کردگاپ میں بھی رہتے ہیں۔ چھوٹا قبیلہ ہے لہٰذا اثر و اختیار کے لحاظ سے بہت کم حیثیت رکھتا ہے۔ایک بکھرا ہوا قبیلہ ہے جس کے افراد قلات، خضدار، کردگاپ، مستنگ، نوشکی، پنجگور، حتیٰ کہ سندھ اور افغانستان میں آباد ہیں۔ شیہک زئی، دینارزئی، زاروزئی، اور سمالزئی اس کی ذیلی شاخیں ہیں۔

رئیس، رئیسی

رئیس کیچ، پنجگور، اور باہو میں آباد زراعت سے وابستہ قبیلہ ہے۔اور اس کا حاکم

گروہوں میں شمار ہوتا ہے۔ حالانکہ تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے۔(حاکم گروہ کب تعداد میں اکثریت رکھتا ہے!)

ایک بہت مضبوط دلیل یہ دی جاتی ہے کہ مکران کے رئیس، رئیسی اور کانک و مستنگ و کچھی کے رئیسانڑیں ایک ہی منبع کی شاخیں ہیں۔

رئیسانڑیں

رئیسانڑیں بلوچوں کا تعداد کے لحاظ سے نسبتاً ایک چھوٹا قبیلہ ہے۔ اِن کا اصل پیشہ آباد کاشتکاری ہے۔ کچھ لوگ مویشی بانی بھی کرتے ہیں۔

رئیسانڑیں قبیلہ قلات کی خانی کے عہد میں سراوان کے پورے علاقے کا ایک لحاظ سے انچارج ہوا کرتا تھا۔''سرِ سردارانِ سراوان'' ایک بہت بڑا منصب ہوتا تھا جو اِن کے سرداروں کو حاصل تھا۔ کانک،مستنگ ،کچھی اور کوئٹہ ان کے علاقے ہیں۔ زیادہ تر زراعت سے وابستہ یہ قبیلہ بہت بکھرا ہوا ہے اور ہر ذیلی فرقہ بذاتِ خود ایک الگ اور مکمل قبیلہ لگتا ہے۔اس کے ذیلی طائفے ہیں؛ روشان زئی، جمال زئی، سیاہی زئی، راؤسین زئی، رستم زئی، سراج زئی۔ کانک اس قبیلے کے فیوڈلوں کا صدر مقام ہے۔

ریکی یا نوتیزئی

رخشانڑیں کا ذیلی فرقہ ریکی زاہدان کے جنوب مغرب میں آباد ہے اور ان کا آباد علاقہ تفتان کے پہاڑوں کے شمالی دامنوں تک پھیلا ہوا ہے۔ لادیز اس قبیلے کا مرکز ہے جہاں ریکیوں کا موروثی سربراہ رہتا ہے۔ان کی اکثریت مویشی بانی، شتر بانی اور قالین بافی سے متعلق ہے۔ یہ لوگ جماز نامی اچھی نسل کے اونٹ پالتے ہیں۔ عورتیں عمدہ قالین بُنتی ہیں۔ ان کا جو حصہ لادیز، گل خار اور مہر آباد کے زرخیز میدانوں میں آباد ہے، وہ کاشت کاری کرتا ہے۔ یہ بتیس قبائلی گروپوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ان کے ذیلی طائفے ہیں؛ بالوزئی، ہاشم زئی، بردگوئی۔

ایران، افغانستان اور پاکستانی بلوچستان میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ نوتیزئی بھی کہلاتے ہیں۔ بڑا قبیلہ بھی ہے اور تین ملکوں کے بیچ سرحدی قبیلہ بھی۔ لہٰذا اُس تناظر میں اُس کی بڑی اہمیت ہے۔

زرکانڑیں (بگٹی)

ایک تھیوری یہ ہے کہ ایران میں دریائے بگ کی وادیِ کے تعلق سے اس قبیلے کا نام بگٹی پڑ گیا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔مگر اس قبیلے کا ایک اور (اور شاید اصل) نام ''زرکانڑیں'' بھی ہے۔یعنی: زر کی معدنی کان۔ یہ بات سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔ زر اور بگٹی ؟ ان کا تو آپس میں دور دور کا واسطہ نہ رہا۔سوئی گیس کے ذخائر کا اُس زمانے میں پتہ ہی نہ تھا جب اِس قبیلے کا نام ''زرکانڑیں'' پڑا تھا۔کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ قبیلہ ''زرک'' نامی شخص سے منسوب ہو؟

اُدھر مری قبیلے کا ایک اور پڑوسی قبیلہ ''زرکانڑ'' ہے۔جو بلوچی جیسی پشتو بولتے ہیں صرف آخری حرف ''ی'' نے دو قبیلوں کی نسل ،زبان اور ثقافت میں فرق کر ڈالا۔کتنا دلچسپ ہے انسان،اور کتنی دلچسپ ہیں اس کی حکایتیں! زرکانڑ موسیٰ خیل قبیلے کی ایک شاخ بتائے جاتے ہیں۔

بلوچی کلاسیکل شاعری میں بگٹیوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ بھی ،مری قبیلے کی طرح ابھی ماضی قریب میں تشکیل پانے اور منظّم قبیلے کی صورت اختیار کرنے والا مضبوط قبیلہ ہے۔مشرقی بلوچستان میں گو کہ پُژ' رندوں کی اکثریت مری کے علاقے کے پہاڑوں میں بس گئی اور بالآخر مری بن گئی۔مگر میر چاکر کا چچا زاد جیاندارا اپنے عزیزوں اور حامیوں کے ساتھ جنوبی گرم تر علاقے میں آ گیا جو بگٹی کا علاقہ بنا۔اس قبیلے کی بڑی شاخ جیاندار کے بیٹے راہیجہ کے نام سے منسوب ہے۔مگر جناب عزیز بگٹی راہیجہ کو بجار کا بیٹا اور میر عالی کا پوتا لکھتا ہے۔اُس کے خیال میں بگٹی میر عالی کی آل اولاد ہیں۔(9) جس کا ایک ذیلی فرقہ ''بیورغ زئی'' ہے جو کہ زرکانڑیں کا حکمران گھرانہ ہے۔بگٹی قبیلے کی شاخوں کے نام میر چاکر کے عزیزوں کے ناموں سے منسوب ہیں؛ پیروزانڑیں (پیروز)،کلپر (کلپر)،راہیجہ (راہیجہ)،موندرانڑیں (موندر) وغیرہ۔مسوری' بگٹی کی مشہور شاخ ہے۔ دیگر اہم قبیلوں میں نوثانڑیں، پھونگ، شمبانڑیں، سلاماں زئی، سوبھازئی،سندرانڑیں، پاہی،نوہکانڑیں شامل ہیں۔

بگٹی ابتدائی دور میں ایک چھوٹا قبیلہ تھا۔ اِس کے موجودہ علاقے میں بلیدی آباد ہوا کرتے تھے۔بگٹی کی بعد کی تاریخ تقریباً مری اور دیگر سلیمانی قبائل کی تاریخ جیسی ہے۔

بگٹی قبیلہ عمدہ گھڑسوار اور لڑاکا رہا ہے۔1845ء میں چارلس نیپئر نے اس قبیلے پر حملہ کیا تھا مگر اُسے کوئی کنٹرول نہیں کر سکا۔بس سنڈیمن اپنی سنڈیمنی کی وجہ سے کچھ عرصہ تک اس قبیلے کو چلاتا رہا۔

بیورغ کو زرکانڑیں کے حکمران گھرانے کا جدامجد تصور کیا گیا ہے۔(بگٹی کے بیورغ نامی تین سردار ہوئے)۔سکھوں نے مشرقی قبائل پہ زبردست حملے کیے۔بگٹی نے انھیں شکست دے دی اور ان کے طبلِ جنگ (ڈُھل) بھی قبضے میں لے لیا(جو،اب سوہری کے دربار میں رکھا ہوا ہے)۔بیورغ، سلام ہان، غلام مرتضٰی ،گہنور خان، شہباز خان، محراب خان، اکبر خان اس قبیلے کے بالترتیب سردار ہوئے۔جو آں سال، بگٹی کا بہت بڑا مفکر اور شاعر ہو گزرا ہے،جبکہ پیر سوہری روحانی پیشوا ہے۔

اپنے ہی باپ کے خلاف ''محراب گردی'' نامی پمفلٹ لکھنے والا ،اور نامی گرامی سامراج دشمن جمہوری راہنما میر عبدالرحمٰن بگٹی اسی مردم خیز خطے سے تھا۔پاکستان کو بیش بہا دولت بخشنے والی قدرتی گیس اسی قبیلے کی ملکیت ہے۔

بلوچستان کے علاوہ سندھ میں بھی بگٹیوں کے کئی گاؤں موجود ہیں۔دیگر قبائل کی بہ نسبت، ہندو بڑی دیر تک اس قبیلے کے ساتھ رہے۔مشرف حملے میں شہید ہونے والے بگٹیوں میں ہندو بگٹی بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔

ڈیرہ بگٹی (دراصل ڈیرہ بیورغ بگٹی) بگٹیوں کے سردار کی جائے رہائش ہے جہاں 1983ء میں بجلی آئی۔حال کی صدی میں بگٹی کا مشہور سردار،نواب اکبر خان رہا جو ایچی سن کالج سے جونیر کیمبرج کرنے کے بعد 1950ء کی دہائی میں سکندر مرزا کی حکومت میں وزیر بن گیا۔ اور نشیب وفراز بھری اپنی متنازع زندگی کے آخری حصے میں پاکستانی افواج سے لڑتے ہوئے شہید، اور ہم سب کا محترم ہو گیا۔

زھری

یومِ شہدائے بلوچستان اسی قبیلے کے بھاری اور عزت دار نام سے منسوب ہے جہاں نواب نورورخان زرکزئی نے اپنے خانوادے کے ساتھ بلوچ قومی حقوق کے لیے ایسی قربانیاں

دیں کہ اکثر نے سکھر جیل میں پھانسی پائی اور بلوچوں کے ہیڈ کوارٹر قلات کا شاہی قبرستان اِن شہیدوں کا مزار بنا۔

یہ رند بلوچ ہیں (ہیتو رام: صفحہ 309)۔خضدار اِن کا مرکز ہے۔مگر یہ بہت وسیع علاقوں میں پھیلا ہوا قبیلہ ہے۔سندھ میں بھی زہری رہتے ہیں۔

قلات کی خانی کے زمانے میں جھلاوان کا انچارج قبیلہ ہوا کرتا تھا۔ قلات ریاست میں ''سرِ سردارانِ جھلاوان'' انھی کے سرداروں کا مقام و لقب تھا۔سرداری اصل میں موسیانڑیں کے پاس تھی اور ہے،مگر شہرت وتوقیر رفتہ رفتہ زرک زئی کو منتقل ہوئی۔اب زرک زئی اس قبیلے کو سردار مہیا کرتا ہے۔

زہری کا نام اپنی جائے سکونت کی وجہ سے زہری پڑا۔مگر ہیتو رام کے بقول موسیانی سردار کا نام زہری تھا۔اس لیے قبیلے کا نام یہی ہوا۔(ہیتو رام: صفحہ 309)اسی طرح اس کے ذیلی فرقے نیچاری، پندرانڑیں اور ساسولی بھی اُن کی رہائش کے علاقوں کی وجہ سے اِن ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔

زہری کے ذیلی فرقے یوں ہیں؛ موسیانڑیں، نیچاری، زرکزئی، پندرانڑیں، جتک، ڈایہ، رئیس، سیدزئی، ساسولی، خدرانڑیں، باجوئی، محمودانڑیں، لوٹھانڑیں، تراہسانی، ستّاڑی۔

اب تو اِن ذیلی قبائل میں سے بہت نے خود الگ اور آزاد حیثیت کے قبائل کی شکل اختیار کر لی۔

ساٹک زئی

بہت چھوٹا اور بہت بکھرا قبیلہ ہے جو مچھ میں آباد ہے۔کوئلہ کی کان کنی تو بس نام کی ہوتی ہے،مویشی بانی ہی اصل پیشہ ہے۔

ساجدی

یہ ایک قدیم قبیلہ ہے۔مرکزی طور پر گریشہ میں آباد ہیں۔مگر وسطی بلوچستان کی اور بہت سی جگہوں پر بھی موجود ہیں۔یہ ایک کوہستانی قبیلہ ہے۔مویشی بانی میں مصروف سچے، سُچے لوگ۔

سرپّرہ

یہ قدیم بلوچ قبیلہ پرّ کانڑیں کے ساتھ پرانی تاریخوں میں مذکور ہے۔کردگاپ اِس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔مگر باجرہ کے بیج کی طرح بہت جگہوں میں بکھرا قبیلہ ہے۔لہٰذا کوئی اجتماعی اثر ونفوذ بلوچستان میں نہیں رکھتا۔خشک آبے کی زراعت اور مویشی بانی سے وابستہ رہے ہیں۔ براہوئی مادری زبان ہے مگر بہت سے لوگ بلوچی بھی بولتے ہیں۔

سمالانڑیں

تعداد میں نسبتاً چھوٹا قبیلہ ہے۔کوئلہ مائننگ یا کھیتی باڑی بہت معمولی ہے۔کوئٹہ اور مچ کے بیچ کے پہاڑوں میں مویشی بانی کرتے رہتے ہیں۔ جہاں بارش لے جائے، جہاں گھاس پھونس لے جائے، جہاں بھیڑ بکریاں لے جائیں۔

سنجرانڑیں

سنجر کے نام سے منسوب یہ قبیلہ پورے بلوچستان اور سندھ و پنجاب میں بکھرے انداز میں آباد ہے۔خواجہ علی، چہار برجک اور چاغی کے علاقے اس قبیلے کا مسکن ہیں۔

افغانستان میں ہلمند اور نیمروز میں آباد ہیں۔چاغی کے خانہ بدوش لوگ تھے جو اب آباد کاشتکاری بھی کرتے ہیں۔ایرانی بلوچستان تک پھیلا ہوا یہ قبیلہ میٹھی رخشانی بلوچی بولتا ہے۔کچھ لوگ ڈیرہ غازی خان اور جنوبی پنجاب میں اسی نام کے ساتھ شناخت رکھے ہوئے ملتے ہیں۔اسی طرح اس قبیلے کے لوگ ترکمانستان میں بھی آباد ہیں۔میر گل خان نصیر کہیری کو سنجرانڑیں کی شاخ قرار دیتا ہے۔شیہہ مرید کے علاوہ ابھی ماضی قریب کے شیہہ حسن (بلانوش)، شیہہ حسین (نورانی) اور دیگر کئی روحانی شخصیات اسی قبیلے سے ہوئیں۔

افغانستان میں جان بیگ ان کا سربراہ تھا جو ہلمند میں اپنے قبیلے کی قیادت کرتا تھا۔ اس نے اپنے ایک بیٹے شاہ پسند کو چاغی میں چھوڑ دیا تھا۔اسی شاہ پسند کی اولاد آج بھی چاغی میں آباد ہے۔

سنگور

لسبیلہ میں نسبتاً ایک چھوٹا قبیلہ ہے، یہ لوگ مویشی بانی ، اور کہیں کہیں خشکابہ کی زراعت کرتے ہیں۔

سید

اصولی طور پر سارے سید بلوچستان سے باہر کے ہیں ۔ البتہ بلوچوں کے ہر قبیلے میں اپنا بزرگ اور پیر خانہ جیسا گھرانہ بھی ہوتا ہے۔ مگر ''ٹک وار'' سید سارے باہر کے، بالخصوص سندھ کے ہوتے ہیں۔ البتہ کراڑی کے سید، بالخصوص مری قبیلے کی سیدی کرتے ہیں۔ اور ہماری سیدی ہوتی کیا ہے؟ ہماری مردم کش دشمنیوں کے بیچ پڑنا، ہماری قحط سالی کو دور کرنے کی دعائیں کرنا، بیٹا پیدا ہونے اور مال مویشی میں برکت کی دعا کرنا۔

شاھوانڑیں

یہ صرف سریاب اور مستنگ میں نہیں بلکہ پورے بلوچستان میں بکھرے ہوئے ہیں۔

یہ رند بلوچ ہیں۔ بنیادی طور پر یہ سراوان کا قبیل ہے۔ شاہوانڑیں خانِ قلات کا بیرک (پرچم) بردار رہا ہے۔ چنانچہ سراوان میں خان قلات کے دربار میں رئیسانڑیں کے بعد دوسرا بڑا درجہ شاہوانڑیں کا تھا۔ نصیر خان اول کے دور کا محمد خان شہوانڑیں اُس سے ''یارِ وفادار'' کا لقب پا گیا تھا۔ مستنگ ، قلات اور کوئٹہ انھی کی قدیم آبادیاں ہیں ۔ جنگوں، قحط سالیوں اور نقل مکانیوں نے البتہ انھیں کہاں کہاں نہیں پہنچایا۔

مری قبیلہ میں ایک قبیلہ شیہوانڑیں موجود ہے ۔ بزدار میں بھی شاہوانڑیں ایک الگ طائفہ تشکیل کرتے ہیں۔ پنجاب میں بہت سے علاقوں میں شاہوانڑیں آباد ہیں۔

اس کے ذیلی طائفے ہیں؛ حاجی زئی، راوت زئی، شاذیہاں زئی، چناروزئی، میروزئی، شیرزئی، خواجوزئی، شاہوزئی، کلوزئی، حسنی، سوری زئی، ہومرانی۔

شر

شر قبیلہ شکار پور سندھ میں بڑی تعداد میں موجود ہے ۔ یہ لاشار سے اپنا تعلق بتاتے ہیں۔ کچھ تعداد میں نصیر آباد اور جعفر آباد میں بھی موجود ہیں۔

شیدی

سندھ میں لاکھوں کی تعداد میں رہتے ہیں۔ اُن افریقیوں کے آباؤاجداد کو پہلے عربوں اور بعد میں یورپیوں نے غلام بنایا اور تالپور عہد میں انھیں مسقط کے راستے یہاں لایا گیا۔ یعنی وہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں یہاں گھسیٹ لائے گئے غلاموں کی اولاد ہیں۔ زنجیبا ریا مومباسا کے لوگ۔

شیر خان زئی

انیسویں صدی کے شروع میں اس قبیلہ کے لوگ بمپور پہ قابض ہوئے مگر بعد میں انھیں ایرانیوں نے وہاں سے بھگا دیا اور وہ گہیہ، فانوج اور بنٹ میں آباد ہوئے۔

عومرانڑیں

یہ سندھ و بلوچستان میں بکھرا ہوا قبیلہ ہے ۔ سبی ، قلات ، پٹ فیڈر اور اس کے ملحقہ سندھ کے علاقوں میں رہنے والے اس قبیلے کے نام پہ مزاری، گورشانی، اور لیغاری میں ذیلی طائفے بھی موجود ہیں۔ یہ قبیلہ نہری زراعت میں بلوچ کا سب سے بڑا فیوڈل طبقہ تشکیل دیتا ہے۔

غلام بولک

سیوی اور اس کے ملحقہ علاقوں میں آباد ہیں ۔ یہ تعداد میں بہت چھوٹا قبیلہ ہے۔

کاشانی

افغانستان میں ہیلمند دریا کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں ۔ ایرانی بلوچستان اور پاکستانی بلوچستان کے مکران میں بھی خال خال موجود ہیں۔

کلاچی

ایک تھیوری یہ ہے کہ شاید مکران میں کلانچ نامی علاقے سے انھوں نے یہ نام پایا ہے۔ (کلانچ سے کلانچی) یہ لوگ ڈیرہ اسماعیل خان میں رہتے ہیں ۔ اور کچھ لوگ ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ ،گھوٹکی، لاڑکانہ اور کراچی میں تنہا ٹکڑیوں کی صورت آباد ہیں ۔ کراچی کا اپنا نام انھی سے منسوب ہے۔

کلمتی

یہ لوگ چاہ بہار، دشت، جیوانی، باہو، گوادر، پسنی، حب، لیاری، ملیاری، ٹنڈو آدم اور حیدرآباد میں آباد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ''چوکنڈی'' اور حب کے مشہور قبرستان اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی بلوچستان میں ماوند کے مقام ''باغار سر'' میں اُن کے کھنڈرات کی موجودگی اور کلاسیکل شاعری میں اس کی تصدیق کی گئی ہے۔ ڈیمز کلمتی اور مری کے مابین جنگ کا تذکرہ کرتا ہے۔ ہماری اپنی شاعری اور اورل روایتوں میں موجود مری علاقے میں کلمتی اور بلمتی (بلفتی ؟) کی لڑائی موجود ہے جس کا انگریز محققین نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔

ہوتمان کلمتی مشہور شاعر گزرا ہے جس نے بقول مولائی شیدائی، حمل کلمتی اور پرتگیزیوں کے بیچ مشہور جنگ کو بیان کیا ہے۔

کُلوئی

اِدھر اُدھر بکھرا بہت چھوٹا قبیلہ ہے۔ اس کے لیے اپنی قبائلی الگ شناخت رکھنا محال ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ دھیرے دھیرے اپنے اپنے علاقوں کے بڑے اتحادیوں میں ضم ہوجانے کی طرف رواں دواں ہے۔

کمبرانڑیں

یہ قبیلہ بلوچستان کے خوانین قلات کی تشکیل بھی کرتا ہے۔ البتہ یہ خوانین سے ہٹ کر بھی بلوچستان بھر میں جا بجا بکھرا ہوا قبیلہ ہے۔ مختلف جگہوں میں یہ قبیلہ بلوچی، براہوئی، فارسی اور سندھی زبانیں مادری قومی زبانوں کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔

کلات اور کوئٹہ سریاب میں براہوئی اور بلوچی بولنے والے اس قبیلے کا ایک ہم نام قبیلہ مری قبیلہ کے لوہارانی میں شامل ہے۔ چھوٹا قبیلہ ہے۔ پٹ فیڈر اور کوئٹہ میں رہتا ہے اور سلیمانی بلوچی بولتا رہے۔ وہی رسم، وہی رواج اور وہی انداز جو بقیہ مریوں کا ہوتا ہے۔

کوسغ

کوہِ سلیمان میں ڈی جی سیمنٹ فیکٹری سے لے کر مبارکی اور بغلچر تک کا علاقہ

کوسغوں کا ہے۔ اس کے علاوہ کوسغ سندھ میں بھی رہتے ہیں۔ شکار پور اور سکھر کے درمیان کے علاقے سے لے کر تھر پارکر اور روجھان کے مشرقی علاقے تک آباد ہیں۔ جیکب آباد کے علاوہ بلوچستان کے پٹ فیڈر میں بہت بڑی نہری زمینوں کے مالک بھی اسی قبیلے کے فیوڈل ہیں۔ سبی میں بھی کوسغوں کے دو چار گاؤں ہیں۔ یہ لوگ ایرانی بلوچستان اور مکران میں بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔

روایت ہے کہ کوسغ دراصل کیچ کے باسی رند قبیلے سے وابستہ قبیلہ ہے۔ اس قبیلے کو اہلِ یونان، عرب اور چینیوں نے اپنے تذکروں میں یاد کیا ہے۔ بازنطینی انھیں ''کورز'' کہتے ہیں۔ کھوسہ خود کہتے ہیں کہ اُن کا نام اُن کی گرم اور لڑاکا طبیعت کی بدولت کھوسہ ہے۔ (مگر بلوچی زبان میں گرم طبعیت کو ''کھوسہ'' یا ''کوسغ'' نہیں کہتے)۔

چوں کہ یہ قبیلہ انگریز کے خلاف چھاپہ مار جنگوں میں مصروف رہا اس لیے انگریز کی تحریروں میں کوسغ ہمیشہ چور اور ڈاکو رہا ہے۔ والکر کی سندھی ڈکشنری میں کھوسغ کا معنی رہزن یا ڈاکو لکھا ہوا ہے۔ 1859ء میں میجر پولاک نے لکھا: ''کوئی ایسا کوسغ شاذونادر ہی ملتا ہے جو مویشی چوری کے جرم میں جیل نہ کاٹ چکا ہو یا اس کا مستحق نہ ہو......''۔(10)

(ایک اور بیان یہ ہے کہ کوہ سغ: کوہ ئے سگ یعنی پہاڑ کا کتا (رکھوالا) ہے۔ ایک اور حکایت میں کھوسو کو لفظ کوہسار سے بتایا گیا ہے۔ ایک آدھ جگہ تو کھوسو کو کاشغر نامی شہر کے باشندے بتا کر کاشغر سے ہوتے ہوتے کھوسو بنا دیا گیا)۔

مجھے ایک بلوچ محقق، میر الفت نسیم کی بات بھی یہاں نقل کرنی چاہیے۔ اس نے ایک خط میں مجھے لکھا؛

''کوسغ'' بلوچی میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کی داڑھی ابھی ابھی نکلی ہو، یا محض ٹھوڑی پر معمولی داڑھی ہو اور باقی چہرہ صاف ہو۔ کہتے ہیں کہ کوسغ کے جدامجد کا نام ''دلیر'' (Daleer) ہوت تھا۔ جس کے معنی ''عقل وفہم'' کے ہیں۔ اُس کا چہرہ کم داڑھی رکھتا تھا۔ اسی نسبت سے اُس کا اور بعد میں اُس کی آل اولاد اور قبیلے کا نام کوسغ پڑا''۔

1857ءمیں انگریز کے خلاف جنگ آزادی میں کوسغ کا تذکرہ نہ کرنا بلوچ کی تاریخ کو مسخ کرنا ہوگا۔جیکب آباد کا دل مراد خان کوسغ، دریا خان جکھرانی سے مل کر گوریلا کارروائیاں کرتا رہا۔ دونوں نے جیکب آباد کی ایک کھلی کچہری میں جان جیکب کو مارنے کا منصوبہ بنایا تھا۔مگر جاسوسی ہوئی اور دونوں گرفتار ہوئے۔ دل مراد کو کالا پانی کی سزا ہوئی۔ اور ہمارے اس جلا وطن ہیرو کی لاش تک نہ ملی۔

کوسغ کی ذیلی شاخوں میں جنگیل، بلیل، جندانڑیں، جروار، مہروانڑیں، امرانڑیں، حملانڑیں، بابلانڑیں اور عیشانڑیں شامل ہیں۔

بلوچوں میں موسیقی کا بہت بڑا استاد، ارباب خان، کوسغ قبیلہ سے تھا۔

بلوچوں کا ایک محسن اور سامراج دشمن راہنما سردار محمد امین کھوسہ، جناب یوسف عزیز مگسی سے لے کر میر غوث بخش بزنجو کے عہد تک بلوچ بہبود کے لیے سرگرم رہا۔

کورائی

ماضی کا یہ مشہور قبیلہ بطور ایک منظّم قبیلہ اب سلامت نہ رہا۔ اور اب یہ ''مرکز گم کردہ[[لوگ مظفر گڑھ، ملتان اور ڈیرہ اسماعیل خان میں بکھرے ہوئے انداز میں ملتے ہیں۔غلام رسول کورائی، یوسف عزیز مگسی کے ساتھیوں میں سے تھا۔آل انڈیا بلوچ کانفرنس میں بہت متحرک تھا۔کتنی اچھی بات ہے کہ اسی سامراج دشمن غلام رسول کے نام پر ایک شہر موجود ہے: رسول پور۔

کرد

ایران کے علاوہ بولان، مرو، دشت گوینڈین اور کوئٹہ کے علاوہ بہت سارے علاقوں میں آباد ہیں۔ یہ قبیلہ ریاستِ کلات کے امور میں سرگرم حصہ لیتا رہا ہے۔ بعد کے بلوچستان کی سیاست میں پچھلی صدی کی تیس کی دہائی سے اس قبیلے کا نام درج ہوا۔میر عبدالعزیز کرد کا نام لیے بغیر آپ کو جدید بلوچ سیاست بالکل ادھوری لگے گی۔

یہ بلوچی کے علاوہ بلوچوں کی دوسری اہم قومی زبان، براہوئی بولتے ہیں۔خانہ بدوش مویشی بانی کے علاوہ زراعت سے وابستہ ہیں۔ کچھ لوگ کوئلہ کی مائننگ بھی کرتے ہیں۔

اس کے ذیلی قبیلوں میں مدے زئی، کرموں زئی، زردا رزئی، شُدن زئی، مسودانی، شادی زئی، ساتکزئی شامل ہیں۔(ہتو رام۔صفحہ 305)

کیترانڑ (کھتران)

یہ قبیلہ ایک طرف تو لیغاری اور بزدار سے سرحد بناتا ہے، تو دوسری طرف مری اور بگٹی سے گلے ملتا ہے۔کوہِ سلیمان کے مشرقی دامن میں کیترانڑ وھووا میں رہتے ہیں جہاں ان کی زمینداری ہے۔اکبر بادشاہ نے ان کے بڑے حصے کو وہاں سے بے دخل کیا۔تب انھوں نے لیغاری پہاڑوں کے علاقہ بارکھان میں پناہ لی۔

کیترانڑ کھیتی باڑی اور مویشی بانی کرتے ہیں۔اِن کی اولین زبان کیترانڑیں ہے۔ اور دوسری زبان بلوچی ہے۔ اصطلاحات، استعارات اور کلچر سب کچھ اپنے پڑوسی مری، بگٹی، بزدار، لیغاری قبائل جیسا ہے۔ پڑوسی قبائل کے ساتھ تلخ و شیریں تعلقات بھی اس قبیلے کا خاصہ رہے ہیں۔

میر مصری خان کیترانڑ انگریز کے خلاف بہت بے جگری سے مزاحمت کرتا رہا۔وہ اپنے ترقی پسند نظریات کی وجہ سے بلوچ سامراج دشمن تحریک کے اولین راہنماؤں میں شامل تھا۔وہ سامراج دشمنی کی تحریک کو سوشلزم سے قریب گردانتا تھا اور اسی سلسلے میں وہ اُن اولین بلوچوں میں سے تھا جنھوں نے (1918ءمیں) سوویت یونین میں پناہ لی تھی۔

کیترانڑ چھ ذیلی بڑے قبیلوں میں تقسیم ہوتا ہے: دھڑے وال، گرینی، ایسانڑیں، لوہارانی، پلیات اور سیلاچی۔

مزارانڑیں ذیلی طائفہ (بارکھان، رکھنڑیں اور ببرٹک) ان کے لیے سردار مہیا کرتا ہے۔ یہ قبیلہ بہت ہی متفرق نسل کے طائفوں کے آن ملنے سے بنا۔اسی نام سے مری میں ایک ذیلی شاخ ہے۔اسی طرح جہانانی قبیلہ یہاں بھی ہے اور بزدار میں بھی۔

مری، بگٹی، بزدار، لیغاری اور حسنی کی طرح چاکر و گوہرام کے معلوم دور تک کیترانڑ قبیلے کا کوئی تذکرہ موجود نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قبیلہ بھی بہت بعد میں تشکیل پایا۔

رڑکن کے ہسنڑیں گو کہ ابھی تک خود کو کیترانڑوں سے الگ بتاتے ہیں مگر اُن کے انضمام وادغام کا پراسیس جاری ہے۔

ہسنڑیں دراصل 19 ویں صدی کے قریب سارے وسطی اور شمال مشرقی بلوچستان میں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں پھیل گئے ۔(11) آج یہ گروپ نہ آپس میں رابطے میں ہیں نہ ان کے خاندانی یا تنظیمی تعلق رشتے ہیں ۔ یہ ایک زمانے میں بڑا طاقتور قبیلہ ہوا کرتا تھا۔ ہسنڑیوں کو مری اور خان قلات سے 1780ء میں دھولا ونگا کے مقام پر شکست ہوئی۔(12) اور قبیلہ مکمل تاراج ہوگیا۔

ہسنڑیں ٹکڑیوں کی صورت بلوچستان میں آباد ہے۔ ایک تو رڑکھن کے وسیع علاقے میں آباد ہے ۔ دوسری ٹکڑیاں کچ ،تل چوٹیالی (پنی کوٹ)، سبی (گلوشہر) اور کیترانڑ قبیلے (حسنی کوٹ) میں بکھر گئیں ۔(13) اس قبیلے کی ذیلی شاخیں اس قدر بڑی ہیں ، یا، دور بکھری ہیں کہ وہ الگ قبیلے بن چکی ہیں ۔مثلاً شیلا چی سبی کے ہسنڑیں ہیں اور مری قبیلے میں سالارانی میں شامل ایک ذیلی شاخ کے بطور بھی موجود ہیں۔

کاھیری (کھیری)

کاہیر (کھیر) نامی درخت سے منسوب یہ اچھا خاصا قدیم قبیلہ ہے ۔ کچھ کچھ کرامتیں اس سے جوڑ دی جاتی ہیں ۔ پٹ فیڈر اور سندھ میں بکھرا یہ قبیلہ اب بڑا قبیلہ تصور نہیں ہوتا۔ اس کی اہمیت بلوچی قدیم شاعری کی بدولت ہی ہے۔

کِیاّزئی

یہ بکھرا قبیلہ ایرانی اور پاکستانی بلوچستان میں واشک کے علاوہ سندھ میں بھی بکھرے انداز میں آباد ہے۔ کہیں الگ و آزاد انداز میں، اور کہیں ماما سنی کی ذیلی شاخ کے بطور۔ یہ دیگر بڑے قبیلوں کے ذیلی شاخ کے بطور بھی موجود ہے۔

کیسرانڑیں

کوہِ سلیمان کا یہ قبیلہ شمال میں لزدان گاؤں سے لے کر مشرق میں بروٹ مندوانی اور جنوب میں دُرگ نالہ کے ساتھ ساتھ لورالائی اور موسیٰ خیل تک پھیلا ہوا ہے ۔ یہ لوگ ڈیرہ غازی

خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کی سرحدوں کے آس پاس کے علاقہ میں رہتے ہیں۔اس طرح اس قبیلے کی سرحدیں بلوچستان، خیبر پختونخواہ اور پنجاب، تینوں صوبوں سے ملتی ہیں۔

یہ قبیلہ بھی پندرہویں سولہویں صدی تک وجود نہیں رکھتا تھا۔ بعد میں تشکیل پانے والے اس رند قبیلے کی سات شاخیں ہیں؛ لشکرانڑیں ،خوب دین ،بوذانڑیں ،وسوانڑیں ،لیغاری، جرواراور، رسانڑیں۔ 1853ء میں شیرانی مہمات سے فارغ ہو کر انگریز نے کیسرانڑیوں کا علاقہ تاراج کیا تھا۔ سردار کوڑا خان کیسرانڑیں انگیزوں کے لیے سر کا درد رہا۔

یہ قبیلہ ایک طرف سے خیبر پختونخواہ کے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان اور دوسری طرف سے تونسہ شہر سے ملتا ہے۔ تمن قیصرانی کے علاقوں میں وہووا، ٹبی کیسرانڑیں، کوٹ کیسرانڑیں، ناڑی، جھوک بودو شامل ہیں۔ کیسرانڑیں قبیلہ مری میں بھی ایک ذیلی طائفہ کی صورت شامل ہیں۔

گبول

کہتے ہیں کہ یہ قبیلہ رند و لاشار جنگ (1456ء تا 1486ء) میں چاکر کی طرف سے خوب لڑا۔(وہ سب قبائل جو چاکر کی طرف سے لڑے، رند کہلاتے ہیں)۔ یہ قبیلہ چاکر کے ساتھ ہی بلوچستان چھوڑ کر پنجاب گیا تھا۔

گبول منٹگمری میں سکھوں کے ساتھ لڑائی کے نتیجے میں پنجاب بھر میں بکھر گئے۔ علاوہ ازیں یہ سندھ تک پھیل گئے اور کراچی تک آ گئے ۔

بلوچستان ،(جھٹ پٹ اور لہڑی) سندھ (بالخصوص کراچی کے لیاری) اور ڈیرہ غازی خان میں پایا جانے والا بہت چھوٹا قبیلہ ہے ۔ مسٹر لیچ نے 1835ء سے 1837ء کی اپنی رپورٹ میں بلوچستان اور سندھ کی سرحد پر واقع پہاڑوں میں رہائش پذیر بلوچوں کا ذکر کیا۔ اسی رپورٹ میں وہ گبول قبیلے کا ذکر یوں کرتا ہے؛ ’’گبول اپنے رہائشی علاقوں کی نسبت سے سرائیکی، سندھی اور بلوچی (سلیمانی) بولتے ہیں۔ اسی پہاڑ میں گبولوں کا ایک سٹیشن ہے جس کا نام ’کچروخ‘ ہے۔‘‘

گچکی

پنجگور میں واقع وادی گچک نے اس قبیلے کو اپنا نام عطا کر دیا۔ یہی کچھ اس قبیلے کے

اصل بلوچ ہونے کے لیے کافی شافی ہے۔عجیب وغریب تصورات جنم دینے والا یہ قبیلہ بلیدیوں سے حکمرانی پرلڑلڑکر طویل عرصے تک مکران کا حاکم بھی رہا۔گچکی قبیلے کے بڑوں نے جام لسبیلہ،خان قلات اور مینگل سرداروں میں رشتے کیے۔دینارزئی (مشہور ملک دینار گچکی کے نام سے منسوب)اورعیسیٰ زئی اس کے دو طائفے ہیں۔عیسیٰ زئی پنجگور اور دینار زئی تربت میں رہتے ہیں۔تیسرا حصہ قاسم زئی ہے۔

یہ قبیلہ اپنی بہادری میں اپنی مثال آپ رہا ہے۔سرحدی علاقے کے حاکم کے بطور انھیں نادر شاہ سے لے کر انگریزوں تک سے لڑنا پڑا۔

گشکوری

(گیش کَور سے گشکوری؟) مکران میں گَش کور (دریا) سے ان کا نام منسوب ہوا۔ یہ لوگ بیورغ رند کی اولاد اور گشکور سے گشکوری بھی بتائے جاتے ہیں۔

یہ قبیلہ ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان، کوٹ ادو، مظفر گڑھ کے علاوہ ملتان میں بھی بکھرا ہوا ہے۔(14) سبی میں نسبتاً مرکز بنا کر اور اجتماع میں رہتے ہیں۔علاوہ ازیں منگولی میں بھی کچھ گشکوری رہتے ہیں۔وگرنہ باقی جگہوں میں بکھرے ہوتے ہیں۔یہ لوگ بلوچی کا تقریباً ہر لہجہ بولتے ہیں، بالخصوص سلیمانی لہجہ۔اس کے علاوہ اس کے بکھرے ٹکڑے سندھی اور سرائیکی بھی مادری زبانوں کے بطور بولتے ہیں۔

گمشاد زئی

گمشادزئی کے قبائلی فرقے یہ ہیں: دودخودزئی، مزار زئی، محمد زئی، درگشت، کریم زئی، جہانگیر زئی، مراد زئی، گیدوزئی، خاکی زئی، تلخ کوہی۔ان کی بڑی تعداد کاشت کاری کرتی ہے۔یہ سارے ایرانی سرحدی علاقہ میں سکونت رکھتے ہیں۔

اس قبیلے کا نام بہت ہی دلچسپ، اور ادبی جمالیات بھرا ہوا ہے:"غم، شاد، زئی"۔

گوپانگ

چاکری عہد کا قدیم قبیلہ ہے۔کلاسیکل شاعری میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔مظفر گڑھ،

ملتان، ڈیرہ غازی خان اور ٹھٹھہ میں پایا جانے والا یہ قبیلہ بہت بکھرا قبیلہ ہے۔کچھ لوگ کچھی میں بھی آباد ہیں۔اسی طرح سندھ میں بھی کچھ گوپانگ آباد ہیں۔

گورشانڑیں

یہ قبیلہ بہت بعد میں تشکیل پایا۔ ڈیرہ غازی خان میں ہڑند کے قریب لعل گڑھ ان کا دارالخلافہ ہے۔گورشانڑیں کوہِ سلیمان کے ماڑی اور دراگل نامی پہاڑوں کے مالک ہیں۔اس کے علاوہ سندھ اور بلوچستان میں بکھرے بکھرے انداز میں اس قبیلے کی ٹکڑیاں آباد ہیں۔ان میں موجود سیاہ پاذرند ہیں، دوسرے طائفے بھی مختلف درختوں کی شاخیں ہیں جنھوں نے وہاں سے علیحدگی لی اور اس نئے اتحادیے میں شامل ہوئے۔

ان کے بارے میں روایت ہے کہ یہ قبیلہ میر دودا خان لاشار کے بیٹے گوریش کی اولاد ہے۔اس قبیلے کی گیارہ ذیلی شاخیں ہیں، جن میں اہم یہ ہیں؛ درکانڑیں، شیہکانڑیں، شاخلانڑیں، ہوتوانڑیں، قاسمانڑیں، جوگیانڑیں، چانگ، دُرکانڑیں، گبول، لاشاری، پیتافی، جسکانڑیں اور سبزانڑیں۔مٹھلوانی، میلوہڑ، صغروانی، زومیرانی بھی اس قبیلے کی شاخیں ہیں۔

تاریخ میں گورشانڑیں اور سکھوں کی کبھی مفاہمت نہ ہوسکی۔اس قبیلے کی ماردھاڑ کو روکنے کے لیے رنجیت سنگھ نے ہڑند کہنہ کے کھنڈرات سے اینٹیں نکلوا کر قلعہ تعمیر کروایا۔گورشانی مصری خان کیترانڑ اور مریوں سے مل کر 1918ئمیں انگریزوں کے خلاف بھی جی داری سے لڑے۔

گورمانڑ یں

ہم بلوچوں سے یہ نام گم ہو چکا ہے۔مگر کوٹ ادو، ملتان اور لیہ کے یہ لوگ خود کو بلوچ کی وسیع تھالی میں شریک گردانتے ہیں۔ان کے نام سے مظفر گڑھ کے قریب ایک ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔آج کل ان کے پڑھے لکھے لوگ خود کو گُرمانی بولتے ہیں۔کیا اس قبیلے کا نام "گورم" سے گورمانڑیں پڑا؟!

گورگیژ

یہ قبیلہ اصل میں زاہدان کے علاقے میں آباد ہے۔ان کا سردار بھی وہیں رہتا ہے۔اس

کے علاوہ یہ چاغی، سبی، سندھ اور پنجاب میں بھی آباد ہے۔ اور مویشی بانی کے علاوہ زراعت سے وابستہ ہے۔

بلوچ تاریخ میں گورگیژ قطعاً فراموش کرنے والے لوگ نہیں رہے۔ ایک زمانے میں یہ موجودہ مری بگٹی علاقے کا بہت زور آور قبیلہ ہوا کرتا تھا۔ بالخصوص بالاچ کا نام تو بلوچ روایتوں، شاعری، ضرب الامثال اور روز مرہ کا حوالہ ہے۔ بالاچ گورگیژ کی قبر بگٹی علاقے کے مقام سنگسیلا میں نمایاں طور پر موجود ہے۔

موجودہ مری بگٹی علاقے میں گورگیژوں اور بلیدیوں کے بیچ خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ مولائی شیدائی نے لکھا کہ مری اور کھیتر انڑ نے گورگیژوں کا ساتھ دیا۔ (15) مشرقی بلوچستان سے بلیدیوں کے اخراج کی وجہ بھی یہی جنگیں ہیں۔

گورگیژ لوگ سبی میں اب بھی ہیں مگر بہت کم تعداد میں۔

گولہ

یہ بلوچ قبیلہ بلوچستان، سندھ اور پنجاب میں بکھرے ہوئے انداز میں موجود ہے: جعفرآباد، نصیرآباد، سبی، کمبر، جیکب آباد اور لاڑکانہ میں۔ صحبت خان گولہ نے بہت سے علاقوں میں سرائے تعمیر کرائے۔ یہ سرائے جیکب آباد، نصیرآباد، جعفرآباد اور سبی میں بنوائے گئے۔ اِن مسافر خانوں میں رات بسر کرنے والوں کو کھانا اور رہائش مفت فراہم ہوتا تھا۔

اس قدیم قبیلہ کے لوگ زیادہ تر بلوچی زبان بولتے ہیں مگر بہت سے بلوچوں کی طرح گولہ لوگ بھی سندھی اور سرائیکی کو بطور مادری قومی زبان استعمال کرتے ہیں۔

لاشاری

(ایرانی بلوچستان کے علاقہ لاشار سے؟)۔ لاشاری کلاسیکل اور فوک شاعری میں جانے پہچانے لوگ ہیں۔ لاشاری کے ساتھ ساتھ اسے صرف لاشار کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔

لاشاری اور رند، دراصل دو ایسے سرچشمے ہیں جن سے سارے بلوچ قبائل خود کو منسوب کرتے ہیں۔ یعنی بلوچ صرف پانچ سو سال سے موجود قوم ہے۔ یہ غلط مفروضہ ہے۔ یہ بات بھی

غلط ہے کہ بلوچستان کی طرف مہاجرت کرتے ہوئے گوئہرام، لاشاری کی سربراہی کرتا ہوا، اور چاکر رندوں کی سربراہی کرتا ہوا باہم، خانہ جنگی کرتا رہا۔

درست بات یہ ہے کہ بلوچ، چاکر و گوئہرام سے ہزاروں سال پرانی قوم ہے۔ اسی طرح ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ بے شمار قبائل اور ان کے ذیلی طائفے بہت بعد میں تشکیل پائے۔ بلاشبہ بلوچوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ دونوں سرچشمے بلوچوں کے آباؤ اجداد ہیں۔ اور بے شمار قبائل اپنی شناخت رند یا لاشار کے انہی سرچشموں سے کرتے ہیں۔ مگر پہلے پہل تو فردوسی نے اسے غلط قرار دیا۔ پھر سائنس بالخصوص آرکیالوجی کی دریافتوں نے ہمارے مفروضوں کا جنازہ نکال دیا ہے۔

رند و لاشار خود اپنے انھی ناموں سے دو چھوٹے قبیلے اب تک برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

ان میں سے لاشاری دریائے لاشاری کے تاس اور سرباز کی وادی میں رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ بمپور کے جنوبی میدانوں میں رہتے ہیں اور کاشتکاری کرتے ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں لاشاری ملتان، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان اور مظفر گڑھ میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ گوگیرہ اور پاکپتن (منٹگمری) میں بیشتر بلوچ لاشاری ہیں۔ (16) سندھ میں بالخصوص حیدرآباد، بدین، ٹنڈو الہیار، ٹنڈو محمد خان، مٹیاری، نواب شاہ، دادو، کشمور، لاڑکانہ اور جیکب آباد میں بھی بے شمار لاشاری موجود ہیں۔ کچھ لاشاری پٹ فیڈر کے علاقے میں بھی آباد ہیں۔ گاجان ہیڈ کوارٹر ہے۔

اس کے بڑے ذیلی قبیلوں میں سے مگسی، ہے۔ اسی طرح جسکانڑیں بھی لاشاری ہیں۔ بھر گورشانڑیں قبیلے میں لاشاریوں کا ایک طاقتور ذیلی تمن ہے۔

لاسی

لاسی لس بیلہ میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ کاشتکاری اور مالداری کرتے ہیں۔ ساحلی پٹی میں ماہی گیری سے وابستہ ہیں۔ یہ لوگ جہاں اکٹھے رہتے ہیں مستحکم قبائلی حیثیت رکھتے ہیں مگر اس کے وہ نسلی گروپ جو پہلے سے مشرقی بلوچستان میں آباد ہوئے، نسلی امتیاز کے اندھے پن کی بدولت بہت عرصے تک اتنا بلند مقام نہیں رکھتے تھے۔ یہ لوگ بلوچی زبان سے لدی پھندی سندھی بولتے ہیں۔

لانگو

ہمارے اس قبیلے کے نام کا تلفظ ہمیشہ غلط طور پر ادا کیا جاتا ہے۔ یہ Langav ہے، Lango نہیں۔ یہ بہت قدیم قبیلہ ہے۔ چاکر و گوہرام کی آمد سے قبل یہ بلوچستان میں آباد تھا۔

آج کل یہ لوگ کوئٹہ، منگوچر، مستنگ، قلات، نوشکی اور خضدار میں آباد ہیں۔ ان کا شمار ساراوان کے قبائل میں ہوتا ہے۔ یہ ساراوانی قبائل میں شاید سب سے کثیر تعداد والا قبیلہ ہے۔ ڈیرہ غازی خان اور ملتان میں یہ لوگ ایک اور نام، یعنی لنگاہ کے نام سے بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ جنھیں انگریز محقق مسٹر اوبرائن نے "تجارتی مقاصد کے تحت سیوی اور ڈھاڈر سے یہاں آ کر آباد ہونے والا" قرار دیا۔ اِن لوگوں نے ملتان کے علاقے پر تقریباً 80 برس حکومت کی۔ اس زمانے میں وہ سندھ کے ساتھ ساتھ سیت پور سے لے کر کوٹ کروڑ تک آباد تھے۔ (17) ٹھٹھہ کے مقام پر تاریخ کی سب سے بڑی کسان بغاوت شاہ عنایت لنگاہ کی قیادت میں لڑی گئی تھی۔

آج لانگو کہیں الگ اور کہیں کسی اور قبیلے کی ذیلی شاخ کے بطور زندگی گزارتا ہے۔ حالیہ دور میں بھی بلوچستان میں جمہور اور جمہوری جدوجہد میں اس قبیلے کا بہت بلند مقام ہے۔

لُنڈ

سندھ اور ڈیرہ غازی خان میں بکھرا قبیلہ ہے۔ اس کی ذیلی شاخوں میں لُنڈ، کھوسہ، رند، حیدرانڑیں، احمدانڑیں، گورشانڑیں، خلیلانڑیں اور نوہانڑیں شامل ہیں۔ شادن لُنڈ اُن کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس کے علاوہ یہ قبیلہ کالا، رانمن اور سُوری لُنڈ میں آباد ہے۔ یہ قبیلہ بھی رند بلوچ کا ہی ایک قبیلہ ہے۔

یہ قبیلہ سوری کے علاقے پر آباد ہے جس کو سوری نامی رودکوہی سیراب کرتی ہے۔ شادخان لُنڈ نے موجودہ شادن لُنڈ کی بنیاد رکھی۔ شادن لُنڈ کا نامور سردار محمد خان گزرا ہے۔ جس نے سوری اور کنڈی والا میں دو قلعے تعمیر کرائے تا کہ افغانستان سے آنے والے فوجیوں کے حملوں سے بچا جا سکے۔ مگر یہ قبیلہ ابدالی کے حملوں کی وجہ سے پہاڑی علاقوں میں جا کر آباد ہو گیا۔ یہ قبیلہ تحصیل ڈیرہ غازی خان کے شمالی علاقے میں اپنا سیاسی اثر رکھتا ہے۔

گورشانڑیں قبیلہ کے درمیان میں ایک چھوٹا قبیلہ لــونــڈ کے نام سے آباد ہے۔ لونڈ سندھ میں بھی آباد ہیں۔ یہ دو ذیلی طائفوں میں منقسم ہے: ایک سوری میں اور دوسرا ٹبی میں رہتا ہے۔

لہڑی

رند قبیلہ ہے۔ (ہتو رام۔صفحہ 207) اور آج کے ڈومبکی قبیلے کے علاقے لہڑی میں رہتا تھا۔ بعد میں ڈومبکی سے جدا ہوا۔ اور اپنا ہیڈ کوارٹر نرمک کو بنایا۔ اس کے علاوہ بکھری ہوئی صورت میں یہ لوگ کوئٹہ، سبی، ڈھاڈر، مستنگ، قلات، خضدار اور کچھی میں آباد ہیں۔

یہ قبیلہ براہم زئی، میدرزئی، شنگرانی، زہیرانی، شادیاڑی اور خلیچاڑی میں تقسیم ہوتا ہے۔

کلات کی خانی کے زمانے میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر زراعت اور مویشی بانی پہ انحصار کرتے ہیں۔ البتہ شہری درمیانہ طبقے کی تجارتی، اور ٹرانسپورٹ سرگرمیوں، نیز سرکاری ملازمتوں میں بھی بلوچوں کا یہ قبیلہ شامل ہے۔

لیغاری

یہ رند قبیلہ ہے۔ بلوچستان میں رکھنی اور بارکھان، لیغاریوں کے علاقے ہوا کرتے تھے۔ مگر آج یہ قبیلہ بارکھان اور رکھنی کے بجائے کوہِ سلیمان اور اس کے مشرقی علاقوں کا بڑا بھاری قبیلہ ہے۔ یہ قبیلہ درہ کوڑا سے لے کر سخی سرور تک پھیلا ہوا ہے۔ پنجاب بلوچستان شاہراہ اسی قبیلے میں سے گزرتی ہے۔ فورٹ منرو انھی کا تفریحی مقام ہے اور اس سے ملحقہ وادیاں قدرتی حسن کا عظیم عطیہ ہیں۔

اس قبیلے کے چار حصے ہوتے ہیں؛ ہدیانڑیں، آلیانڑیں، بگلانڑیں اور ہیوتانڑیں۔ آلیانڑیں سردار کا گھرانہ ہے۔

لیغاریوں کے فیوڈل سردار چوٹی نامی جگہ میں رہتے ہیں۔ اس قبیلہ کے افراد ڈیرہ غازی خان، ملتان، راجن پور اور کوہِ سلیمان پر اور مظفر گڑھ کے علاوہ کوہِ سلیمان کے دوسرے سرے پر ڈیرہ اسمٰعیل خان اور سندھ خصوصاً حیدر آباد میں رہتے ہیں۔

سندھ کے **تالپر** بھی اصل میں لیغاری ہیں۔ایک عرصے تک سندھ پہ حکمرانی کرنے والے اس قبیلے کے دور ہی میں صوفی شاہ عنایت کی المناک شہادت ہوئی تھی۔خوانینِ قلات کے ساتھ ان کی ناچاقی بھی بہت مشہور ہے۔مگر بیسویں صدی کے اوائل میں یوسف علی مگسی کا ساتھ دینے والے ان لوگوں کا بلوچ تاریخ میں ہمیشہ نام لیا جاتا رہے گا۔مجموعی طور پر یہ قبیلہ مویشی بانی اور کاشتکاری سے وابستہ رہا ہے۔

پتہ نہیں کس درجے کا احساسِ کمتری ہے اُن دانش وروں میں جو"لیغاری" کو"لغاری" بنا دینے کے درپے ہیں۔اس "ی" نے اُن کا کیا بگاڑا ہے جسے وہ قبیلہ بدر کرنا چاہتے ہیں۔موجودہ نام کے ساتھ اس قبیلے کی قبیلوی تشکیل کلاسیکل شاعری سے بہت بعد کے زمانے میں ہوئی۔

ماما سنّی

کچھ لوگ اسے"محمد حسنی"، لکھتے ہیں۔یہ بہت ہی قدیم بلوچ قبیلہ ہے۔شاید آبادی اور رقبے میں بلوچوں کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔یہ لوگ افغانستان ایران اور پاکستان کے بلوچوں کا سنگم بناتے ہیں۔سندھ میں بھی ان کے طائفے ملتے ہیں۔یہ لوگ رخشانی بلوچی بولتے ہیں۔براہوئی اور سندھی بھی ان کی مادری زبانیں ہیں۔اُن کا سردار گھرانہ (کلمی زئی) مشکے میں رہتا ہے۔اس کے ذیلی طائفے ہیں؛ شیخ حسینی،مزارزئی،مرداں شئی،شہداد زئی،کوراچی،سُمائیلی،رنگیانڑیں،شاہی زئی،یوسفی،شیروزئی،زیرکانڑیں،دُرک زئی،عیدوزئی،یاغی زئی،کیازئی،منڈازئی،سیاہی زئی،خیرائی،بنگلزئی،شاہوزئی،کلمی زئی۔

مامشّئی

یہ بھی مامَسّنی کی طرح ایک قدیم قبیلہ ہے۔رند بلوچ ہیں(ہتو رام۔صفحہ 303)۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لوگ محمد شاہ کی اولاد ہونے کی نسبت سے محمد شہی کہلاتے ہیں۔یہ قبیلہ مستنگ میں کوہک،کابو اور کوہِ ماران کے نواح میں آباد ہے۔نسبتاً کم تعداد والا قبیلہ ہے۔مویشی کے علاوہ بارانی (اور کہیں کہیں کاریز وٹیوب ویل والی) کاشتکاری کرتے ہیں۔اس کے ذیلی طائفے یوں ہیں: سمائی،سورو،بنگلا،ہزرانڑیں۔

مری

یہ قبیلہ اس وقت پاکستانی بلوچوں میں سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ان کا سوتیلا اور عاق کردہ علاقہ،کوہِ سلیمان کے جنوب میں خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش آبادی والے علاقے کے طور پر آباد ہے۔اس کے پہاڑ مشرقی بلوچستان کے دوسرے تمام قبیلوں کی طرح کوہِ سلیمان کی اترتی ہوئی کھردری، بے ترتیب اور دشوار چٹانیں ہیں جن کا جھکاؤ میدانوں کی جانب ہوتا ہے۔جاندرانڑ، بانبور، رسترانی، تمبیل، اور سونڈھ کو چھوڑ کر ندی نالوں سے پھٹے ہوئے اس کے پہاڑ نہ صرف درخت وسبزہ سے عاری ہیں بلکہ بے مہر بھی ہیں۔ان پہاڑوں کے درمیان البتہ کہیں کہیں اچھی چراگاہیں موجود ہیں۔وادیوں میں بکھرے ہوئے زرعی قطعات پہاڑوں کے اندر رنگین پیوند کی مانند لگتے ہیں۔بلوچستان کی طرح اس قبیلے کا رقبہ بہت وسیع اور آبادی کم ہے۔

مری علاقہ مغرب میں سبی،مشرق میں کیترانڑ،شمال میں دکی لورالائی اور جنوب میں بگٹی قبائل سے گلے ملتا ہے،کبھی قہر میں کبھی مہر میں۔اپنے اس آبائی علاقہ کے علاوہ مری قبیلہ کے کچھ طائفے مکمل اور کچھ جزوی طور پر سبی،نصیرآباد،اندرونِ سندھ،جھالاوان،کوئٹہ،ژوب،مکران،سبی حتیٰ کہ افغانستان اور خلیج میں بھی آباد ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ پورا مری قبیلہ اب کوئی معاشی اتحاد یہ نہ رہا۔روٹی کے حصول کی سرگردانی،خانہ جنگی اور حکومتوں کے ساتھ جنگوں نے اُسے باجرے کے بیج کی طرح بے دردی سے پوری قوت کے ساتھ پوری دنیا میں چھڑک ڈالا ہے۔چنانچہ اب مری قبیلہ ہر بلوچ علاقے میں پایا جاتا ہے۔سندھ کا بھی تقریباً ہر ضلع مری سے آشنا ہے۔مری کہیں پہ سرمایہ دارانہ نظام میں رہ رہے ہیں،کہیں فیوڈل نظام میں اور کہیں سر قبیلوی نظام میں۔مگر خواہ وہ جہاں بھی ہوں،جس پیشے سے بھی منسلک ہوں،اُن کے دل اپنے قبیلے،اپنے علاقے اور اپنے پہاڑوں کی بھی کھونٹیوں کے ساتھ مضبوطی سے بندھے ہوتے ہیں۔

مری1839ء میں انگریزوں کے ساتھ اُس وقت واسطہ میں آئے جب انگریز بولان کے راستے افغانستان پر قبضہ کرنے جا رہا تھا۔مگر وہ بھلا سلامت کیوں جاتا؟ دوسروں پر ناجائز قبضہ کرنے مری اُسے کیوں کر چھوڑتے؟ چنانچہ اُس نے جان کین کی اس فوج پر حملہ کر کے طویل مری

وانگریز جنگوں کا آغاز کردیا۔مری،انگریز حملہ آوروں کے خلاف بے شمار چھوٹے گوریلا حملوں کے علاوہ باقاعدہ پانچ بڑی جنگیں لڑ چکا ہے۔ایسی جنگیں جہاں بہادری، سامراج دشمنی، وطن دوستی اور آزادی پسندی اپنی ممکنہ انسانی عروج پر نظر آتی ہیں۔

مری میں، دوسرے بلوچ قبائل کی بہ نسبت غیر مریوں کو اپنے اندر ضم کرنے کی زبردست صلاحیت اور رجحان موجود رہا ہے۔یہ سلسلہ کبھی نہیں رکا۔

مری میں بجار کی موت کے بعد اس کا بیٹا آزاد خان سردار بنا مگر وہ لاولد فوت ہوگیا۔اور سرداری بجار کے بھائی درویش کو منتقل ہوگئی مگر اُس سے سرداری وزیر خان آلیانی نے لے لی۔پھر سرداری مختلف ذیلی شاخوں میں منتقل ہوتی رہی ، تا آنکہ گزین پہ آکر یہ سرداری موروثی ہوگئی۔(19)

ماوند کے پہاڑوں میں آباد ہونے اور بعد میں مری کا نام وضع کرنے کے بعد اس قبیلے کے لوگوں نے مشرقی جانب کا علاقہ حسنڑیں سے قبضہ کیا اور شمال میں کوئٹ منڈاہی کا علاقہ باروزئیوں سے لے لیا اور یہاں آباد ہوگئے۔

انگریز کی تاریخ کی کتابوں میں مری علاقے سے مراد تھا: منڈاھی، ماوند، کاہان اور نیساؤ۔سبی گزٹیئر کے صفحہ نمبر 264 میں یوں بیان یا گیا ہے: ''مری کا علاقہ تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے؛

1۔کاہان (2353 فٹ)۔

2۔ تدڑی، ڈاھو، بانبور، پیلاوغ کا ایک حصہ، نیساؤ، اور جنتلی (2847 فٹ)۔

3۔ماوند (2600 فٹ) اور گمبولی۔

کوہلو وادی کو مری نے کہیں جا کر جولائی 1878ء میں کمزور اور کم تعداد میں رہ جانے والے زرکانڑ قبیلے سے قبضہ کرلیا۔اور اسے آپس میں، چار حصوں میں تقسیم کرلیا۔جس کے تحت گزینی مری نے اروا، ونگا، پشت، ماڑ اور باہر لے لیے۔لوہارانڑیں نے ناڑیال، کالی کڑ، سوار اور میدار۔ اور بجارانڑیں، اور زرکانڑ نے باغ، بھر، زیارت اور سونڑی لے لیے۔گلوگوز و سردار مہر اللہ خان کو

سرداری میں مل گیا۔(20)

مری قبیلہ تین حصوں میں منقسم ہے۔تین کو بلوچی میں سہ، یا، سئے کہتے ہیں۔اس طرح تین حصوں میں سے ہر ایک تہائی کو ''سئے یک'' کہتے ہیں۔مری تین سہ یکّوں میں تقسیم ہوتا ہے جو یہ ہیں؛ گزینی، لوہارانڑیں، بجارانڑیں۔

لوھارانڑیں: یہ چار ذیلی شاخوں میں تقسیم ہے؛ لوہارانڑیں، شیرانڑیں، مہمدانڑیں، شاہانڑیں۔

لوہارانڑیں کی ذیلی شاخیں ہیں؛ جنڈو، سارنگ، دُرک، ولیداذ۔

شیرانڑیں (لوہارانڑیں) کے چار فرقے ہیں؛ جنڈوانڑیں، سارنگانڑیں، درکانڑیں، میلوھڑ۔ شاید میلوھڑ میں گڈ، شکلانڑیں، بنگوار، رند کانڑیں، قویلانڑیں، اور، گندل گوئر آتے ہیں۔ڈینس برے نے (1911) کمبرانڑیں کو بھی لوہارانی سے منسلک قرار دیا۔

گزینی: کے ذیلی فرقے ہیں؛ نوذبندغانڑیں، بھاولان زئی، لانگھانڑیں، عالیانڑیں، مہکانڑیں، ٹینگیانڑیں، مہمدانڑیں، ژنگ، عیسوانڑیں، چلگری، ژنگ، مہندانڑیں، مزارانڑیں، لوڑی کُش، کُوہے چی، بڈّانڑیں، ہلیلیانڑیں، چُوری، مُرگیانڑیں، جروار، کیہہ واڑ، کہورخاں زئی، اور ہڈوار۔

بجارانڑیں: بجارانڑیں کی پانچ ذیلی شاخیں ہیں۔اس لیے کہ بجار کے پانچ بیٹے تھے: سالار، سومر، پیڑداذ، کلندر، کُنگر۔چنانچہ سالارانڑیں، سومرانڑیں، پیرداذانڑیں، کلندرانڑیں، اور کنگرانڑیں۔ان پانچ شاخوں کو ''بُنڈ بجارانڑیں'' کہتے ہیں۔

بجارانی میں باہر سے آنے والے قبائل ہیں: رامکانڑیں۔شاہیجو۔ پوادی کوہِ سلیمان سے آیا، کیسرانڑیں سب سے بعد میں آئے۔چانڈھے بھی باہر سے آیا۔شیلاچی بھی۔

ذرا بجارانڑیں کی ذیلی شاخوں سے بھی واقف ہوجایئے:

سالارانڑیں: بجارانڑیں میں سالار کا بیٹا تھا سوزل۔جس کے بھتیجے کا نام کمال

تھاجہاں سے کمالہانڑیں اوربڑ یانڑیں بنے۔سالار کے بیٹے سوزل کے چھ بیٹے تھے؛ لودھاڑ ،رحیم خان، روحیل،لودی، یارخان،شیھک۔

سالارانڑیں میں باہر سے آ کرشامل ہونے والے ذیلی طائفے یہ ہیں: بابیانڑیں (مزاری سے آئے ہیں)،موسیٰ زئی،شیر خان زئی (علاقہ باڈور سے آئے ہیں)،شیلاچی (حسنڑیں سے آیا ہے)،رندہاں زئی ،بڑ یانڑیں (ونٹر پچی سے آیا ہے جسے سوزل کے بھتیجے کمال نے پالا)۔کچھ کہتے ہیں کہ لودی زئی بھی باہر سے آئے ہیں اور سوزل کا چھٹا بیٹا لودی نہیں بلکہ روحیل ہے۔

سومرانڑیں: سومر کا بیٹا تھا وزیر (اول)۔اُس کے چار بیٹے تھے: وشہال،پُلو،گلو، شاد یہان (اول)۔ پلو کے تین بیٹے تھے: بہار خان ،جلالہان اور علی گل ۔جلالہاں کا بیٹا تھا مست توکلی کا گہرادوست بہارخان جس کے دو بیٹے تھے آدواور جہاں خان ۔ جہاں خان کے دو بیٹے تھے: عمر خان اور صاحوان ۔صاحوان کے دو بیٹے کریمواور جلالہان تھے۔جبکہ عمر خان کے دو بیٹوں کا نام تھاحمل اور بہار خان ۔ بہار خان کا بیٹا عمر خان تھا۔

شاد یہان اول کے تین بیٹے ہوئے؛ دلیل (اول)، دولتان اور بلوچاں۔

دلیل اول کا بیٹا ہوا شاد یہان (دوئم) جس کا بیٹا ہوا دلیل (دوئم)۔جس کے دو بیٹے تھے زرخان اور وزیر دوم۔(میں اسی وزیر کا پوتا ہوں)۔جس کے بیٹے تھے میاں خان، بختیار خان، سحراب خان، بہرام خان،محمد مراد (میرا والد)۔

سومرانڑیں میں باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں: سومرازئی اور گوہرام زئی۔

کُنگرانڑیں: کُنگر سے کنگرانڑیں بنا جس کے ذیلی فرقے ہیں: عالیانڑیں،حسوزئی، وڈیرہ زئی اور شکلانڑیں۔ بزداراور کھوسہ باہر سے آ کر کنگرانی میں شامل ہوئے۔

کلندرانڑیں: کلندر سے منسوب قبیلہ ہے جس کے دو بیٹے تھے: باران اورنہالان۔ باران سے باران زئی کے چار ذیلی فرقے ہیں :رند کانڑیں ،نور خاں زئی، وڈیرہ زئی،گلوزئی۔ کلندرانڑیں میں بعد میں شامل ہونے والے فرقے ہیں؛ باراں زئی، ڈانگیانڑیں،گریانی،شیلاچی، محستانی،مصری زئی،ملگزارزئی اور میاں خاں زئی۔

نہالان کے بیٹے کرم خان کے چار بیٹے تھے؛شربت ، مڑز یہان، بہار خان اور سیدہان۔شربت کے دو بیٹے ہوئے: تورخان ،نورمحمد۔جبکہ فتح خان کے پانچ بیٹوں کے نام تھے: ھذابشک ،ہذاداذ، بیورغ،نہالان ، باہر۔

چانڈھے اور سیلاچی نہ صرف مری قبیلے میں بکھرے انداز میں موجود ہیں بلکہ بہت سارے دیگر قبائل میں بھی ہیں۔

کلوانڑیں: مری قبیلے میں آبادی میں سب سے بڑا یہ طائفہ پانچ ذیلی فرقوں میں تقسیم ہوتا ہے: وڈیرہ زئی، پیری زئی، گرانی، ڈاھی زئی، مہروزئی۔کلو سے منسوب اس قبیلے کی ،شاہو سے منسوب شاہیجو سے نزدیکی ہے،اس لیے کہ یہ دونوں افراد باہم بھائی تھے۔

رامکانڑیں: اس کوہستانی قبیلے میں آج شامل قبائل ہیں: بوڑوزئی،للوانڑیں، پروئی، لال خان زئی۔

مریٹہ

کچھ محققین کہتے ہیں کہ یہ نسلاً ہندوستان والے مرہٹے ہیں جو 1761ءمیں نصیر خان کی قیادت میں پانی پت جنگ کے نتیجے میں جنگی قیدی بنا کر لائے گئے تھے۔اور جنھیں بلوچ اشرافیہ نے باہم مال غنیمت کے بطور تقسیم کیا تھا۔

ہمیں ابھی کنفرم کرنا ہوگا کہ پانی پت کے نصیر خانی جنگ میں مری بگٹی کے دستے شامل بھی تھے یا نہیں۔بہرحال اگر ''مرہٹہ تھیوری'' درست ہے تو یہ پتہ لگانا پڑے گا کہ مریٹہ کب مسلمان ہوگئے اور کب بلوچ بن گئے۔اب تو وہ خود بھی نہیں جانتے کہ اُن کا شجرۂ نسب کیا ہے۔اورآیا وہ ایک نسل سے ہیں یا الگ الگ ممالک اور علاقوں سے لائے گئے ہیں۔اب اُن کے نام، رسوم، زبان عقیدہ سب کچھ بلوچوں کا ہے اور وہ اپنے آج کے مرکزی قبیلے کے ساتھ انھی کے رواج تلے زندگی گزارتے ہیں۔اور وہ قبیلے کے ذیلی فرقے کے فیوڈل کی گھریلو خدمت گزاری کرتے کرتے اب آزادانہ معاشی سرگرمیاں کرتے ہیں۔

اِس کے باوجود کہ بلوچستان میں غلامی انگریز حکومت نے ختم کردی تھی، اوراس کے بھی

باوجود کہ اسلام اور بلوچییت برابری کی بات کرتے ہیں۔مگر مریٹہ کا مقام عام بلوچ سے بہت کم تر جانا جاتا تھا۔راجی زمین میں مریٹہ حصہ دار نہیں ہوتا تھا۔سیاہ کاری یا قتل ہونے کی صورت میں اس طبقے کا خون بہا وغیرہ بھی دوسرے بلوچ راج سے کم تر مانا جاتا ہے۔(21)

مریٹہ بالخصوص بگٹی ، مری اور جکھرانی قبیلہ میں ہوتے ہیں۔اور وہاں خانہ بدوشی کے بجائے اپنے فیوڈل کی خدمت گزاری میں دیہات و شہر میں رہتے رہے ہیں۔گوکہ اب اُن کا ''مالک'' اُن کی کفالت کے قابل نہیں رہا ہے اور مریٹہ کو اپنی روٹی روزی کا انتظام خود کرنا پڑتا ہے مگر سماجی امتیاز اُسی طرح جاری اور ساری ہے۔بگٹی کے مریٹہ خوب تعلیم پا گئے۔بڑے بڑے افسر بنے۔بہت سے مریٹے سوئی گیس کمپنی میں ملازم اور افسر ہوئے۔

مریٹہ بلوچ میں بدترین ذات پات کی علامت ہیں۔جو لوگ اِس سخت گیر نظام سے بھاگ کر شہروں میں آباد ہوئے انھیں کچھ کچھ شہری حقوق میسر ہوگئے۔اسی طرح کسی کسی خاندان میں ایک آدھ نچلے درجے کی سرکاری نوکری سے بھی آسودگی آئی۔وگرنہ کتنے بھی سماجی سیاسی اور امن امان کے ہلچل آئے مگر سماج خود سے چمٹے اس غیر انسانی اور شرمناک علت کو جھٹک نہ سکا۔

ماما عبداللہ جان جمالدینی بتایا کرتے تھے کہ ایسے ہی جنگی قیدی اُن کے خاندان کے بڑوں کو بھی ملے تھے۔

مزاری

یہ قدیم بلوچ قبیلہ مزار یعنی شیر سے منسوب ہے۔اس بارے میں عوام کے اندر بہت دلکش روایتیں موجود ہیں۔

مزاری ڈیرہ غازی خان کے جنوبی علاقہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ان کا علاقہ جیکب آباد تک پھیلا ہوا ہے اور شمال میں یہ عمرکوٹ اور پٹک درہ تک پھیلا ہوا قبیلہ ہے۔ان کا ہیڈ کوارٹر روجھان مزاری کہلاتا ہے۔بالاچانڑیں ان کا حکمران طائفہ ہے۔مزاری (بالاچانڑیں، رستمانڑیں)1836ء سے لے کر 1838ء تک حملہ آور سکھوں کے دانت توڑتے رہے ہیں۔

ہر بلوچ قبیلے کی طرح مزاری بھی اپنے رسم ورواج پر بنیاد پرستی کی حد تک قائم ہے۔

مزاری قبیلہ پڑوسیوں کے ساتھ خونیں جنگوں میں الجھا رہا ہے۔

کشمور کا قلعہ میر نصیر خان نے مزاریوں کو قابو کرنے کے لیے بنوایا تھا۔(جب میر گل شیر خان 1764ءمیں اپنے والد کی وفات کے بعد سردار بنا اور میر نصیر خان نے مزاریوں پر حملہ کر کے گل شیر کو قتل کر دیا)۔

میدانی اور سرگانڑیں اس قبیلے کے بڑے طائفے ہیں۔

مستوئی

سندھ، ڈیرہ غازی خان ، اور پٹ فیڈر میں ہیں۔یہ ایک مخلوط، چھوٹا اور بہت بکھرا ہوا قبیلہ ہے۔یہ لوگ بلوچ کی ایک اور زبان، سرائیکی بولتے ہیں۔موجودہ نام سے اِس قبیلے کی قبائلی تشکیل بہت حالیہ ہے۔بلوچی کلاسیک میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

مغربی دامانی

یہ لوگ خود کو مری سمجھتے ہیں۔یہ مغربی (ایرانی) بلوچستان میں بمپور دریا کے تاس میں آباد ہیں۔وہ اناج اور کپاس وتمباکو کاشت کرتے ہیں۔

مکرانی

اس نام سے ہندوستان کے گجرات میں ایک بکھری بلوچ آبادی رہتی ہے۔ان کے ساتھ بلوچوں کا ایک اور گروہ بھی رہتا ہے ''سلیمانی'' کے نام سے۔گجرات کے ان مکرانی بلوچوں کی ذیلی شاخوں کے نام ہیں: آسکانی، بلوچ، عمرزئی، رند، مُلکاجی اور گڈیازئی۔

مگسی

نسبتاً ایک مضبوط تھیوری یہ ہے کہ مگسی قبیلے کا نام مغربی (ایرانی) بلوچستان کی مگس وادی کے نام سے متعلق ہے۔

یہ قبیلہ لاشار کی اولاد ہے۔جن بلوچوں کو لاشاری کہا جاتا ہے یا گوہرام کی اولاد سمجھا جاتا ہے ان میں مگسی قبیلہ نمایاں ہے۔اولاد والی بات شاید درست نہیں ہے۔اس لیے کہ گوہرام اپنے

وقت کے ہزاروں لاشاریوں کا باپ نہیں تھا۔ وہ اُن کا سردار تھا۔ اسی طرح چاکر ہزاروں رندوں کا سردار تھا، باپ نہیں۔

مگسیوں کا ذکر کلاسیکل بلوچی شاعری میں ملتا ہے۔ مگسی قبائل کھیتی باڑی بالخصوص کھجور، اناج اور صنعتی فصل یعنی کپاس کی کاشتکاری کرتے ہیں۔ یہ لوگ گنداواہ اور جھل کے علاقے میں بھی رہتے ہیں جہاں ان کے فیوڈل (سردار) رہتے ہیں۔ مگر یہ قبیلہ سندھ میں ایک بڑے قبیلے کے بطور موجود ہے۔ اسی طرح میں نے اندرونِ پنجاب میں بے شمار مگسی آبادیاں دیکھی ہیں۔ ایرانی بلوچستان میں بھی مگسی آباد ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مشرقی قبائل میں صرف مگسی اور ڈومبکی نے خان قلات کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ اور اُن کی تاریخ خواتینِ قلات کی تاریخ کے ساتھ چلتی ہے۔ خان کے دربار میں مگسی قبیلے کا شمار جھالاوان کے قبائل میں ہوتا تھا۔ جہاں خان کے بعد مگسی قبیلے کا سیکنڈان کمانڈ سرِ سردارانِ جہلاوان ہوا کرتا تھا۔

ہر بڑے بلوچ قبیلے کی طرح مگسی بھی ایک جغرافیائی نیم خودمختار قبیلہ تھا۔ اُس کا ہیڈکوارٹر، جَھل خود ایک طرح سے ریاست تھی۔ اس کا اپنا عدالتی نظام، تعلیمی نظام، جیل، جرگہ اور یادگاری ٹکٹ موجود تھا مگر یہ جہلاوان کے چیف (زرکزی) کی بڑائی میں قلات سٹیٹ کا حصہ تھا۔

قبیلہ مگسی کے ذیلی فرقوں کے بارے میں میں نے ادھر اُدھر بہت پڑھا، سنا۔ مگر مجھے تفصیلی اور شاید زیادہ معتبر بات مرید حسین مگسی کی لگی۔ اُس نے اپنی کتاب ''تاریخِ مگسی قبائل'' میں مگسی قبیلے کی مفصل تاریخ دی ہے۔

اُس نے دلچسپ انداز میں مگسی قبائلی کی ذیلی شاخوں (ٹکر) کو پہلاٹکر، دوسراٹکر، تیسرا۔۔۔ میں تقسیم کیا ہے۔

پہلاٹکر: وہ پہلے ٹکر کو ''ٹٹانڑیں'' کا نام دیتا ہے۔ جس میں بھوتانڑیں، روتانڑیں، مرزانڑیں اور رنندانڑیں نامی ذیلی شاخ شامل ہیں۔ وہ اس ٹکر میں کھوسہ قبیلہ کی بلیلانڑیں (اس کی ذیلی شاخیں عرضیانڑیں، فڈانڑیں، گھمڑانڑیں، میوانڑیں، حدوانڑیں، فریدانڑیں، جیٹھانڑیں، مالوانڑیں،

پلیانڑیں، بہرانڑیں، درخانی، بڈانڑیں، دلاوانڑیں، مالمانڑیں، بھاریانڑیں) کو بھی شامل کرتا ہے۔

دوسراٹکر: مرید حسین دوسراٹکر شمبانڑیں کو قرار دیتا ہے۔ اُس کی دس ذیلی شاخیں سارگانڑیں، بنگلانڑیں، مغلانڑیں، لاسکانڑیں، گنسر، وسدانڑیں، حالوخانی اور سفرانڑیں ہیں۔

وہ پھر سارگانڑیں کی مزید چھ شاخوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ مزارانڑیں، بشکیانڑیں، چاکرانڑیں، واحدیانڑیں، گہنانڑیں اور کیچوانڑیں۔

اسی طرح وہ بنگلانڑیں کے دو ذیلی فرقوں کا نام لیتا ہے: مندوانڑیں اور جانیگانڑیں۔

اس نے مغلانڑیں کو دو حصوں میں بیان کیا ہے: ایک حصہ کے فرقے ہیں: جمالازئی، بگرانڑیں، گولانڑیں، گاجانڑیں، حاجانڑیں اور گاہانڑیں۔ دوسرا حصہ بھی چھ حصوں میں ہوتا ہے:

شیرانڑیں یا شاہل زئی، کمبرانڑیں، ٹھاروانڑیں، موسیانڑیں، ڈاھیانڑیں اور حمدانڑیں۔

تیسراٹکر: مرید حسین مگسی تیسراٹکر عیسبانڑیں (ہسبانڑیں) کو قرار دیتا ہے۔ بیڑاکانڑیں میں انگلانڑیں، ساہوزئی، سارگانی اور دوستدانی نامی ذیلی شاخیں ہیں۔ سیاہانی میں بیرانی، کلانی، جمالانڑیں، جوگانڑیں اور میڑانڑیں شاخیں ہیں۔ اس ٹکر میں تیسرا شاخ لوئی ہے جس کی ذیلی شاخیں بڈھانڑیں، ممدانڑیں، ہڈیانڑیں، کیجانڑیں اور وھدانڑیں ہیں۔ عیسبانڑیں کی چوتھی شاخ بجرانڑیں ہے۔

چوتھاٹکر: مگسی کا چوتھا ٹکر ساکھانڑیں ہے۔ اس کی شاخیں ہیں: باؤٹھانڑیں، ننگرانڑیں، جامانڑیں، باگڑانڑیں، سایانڑیں، مندوستانڑیں اور گگڑانڑیں۔

پانچواں ٹکر: پانچواں ٹکر ہے: کاتیر۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے حمدانڑیں میں زیرکانڑیں، خیرانڑیں، بالوانڑیں اور حلوانڑیں نامی ذیلی شاخیں آتی ہیں۔ دوسرا حصہ آدمانڑیں ہے اور اس کی ذیلی شاخیں ہیں: لونگانڑیں، حنانڑیں، احمدانڑیں، جودہانڑیں اور آریانڑیں۔

چھٹاٹکر: یہ ٹکر حسرانڑیں اور راہیجہ میں منقسم ہے۔ حسرانڑیں کی ذیلی شاخیں جانی گانڑیں، پیرکانڑیں، محبتانڑیں، پلیانڑیں، میہانڑیں، جنیدانڑیں اور نوثانڑیں ہیں۔

راہیجہ مالھینی، سنجرانی، ممدانی اور جودہانی میں تقسیم ہوتا ہے۔

بھوتانڑیں ،مگسیوں کوسردار سپلائی کرنے والا طائفہ ہے۔ان کے پاس بے شمار زرعی زمین ہے۔(دلچسپ ہے کہ لسبیلہ میں بھوتانڑیں ایک الگ قبیلے کی صورت رہتے ہیں)۔

(ماخوذ از،تاریخِ مگسی قبائل،مرید حسین خان مگسی،سالِ طبع اور پبلشر ندارد،صفحہ 49)

ملغانڑین

میر ملّغ خان سے منسوب یہ قبیلہ اصل رند قبیلہ ہے۔ڈیرہ غازی خان کا علاقہ اِن کا سب سے بڑا مسکن ہے مگر اپنے دیگر بلوچ قبائل کی طرح یہ بھی سندھ کے مختلف اضلاع میں بھی موجود ہیں۔ یہ قبیلہ سردار اسلم ملغانڑیں کی قیادت میں انگریزوں سے بھڑ گیا تھا۔آج صورت حال یہ ہے کہ ملغانڑیں تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور روایتی کاشتکاری کے ساتھ ساتھ ملازمتوں پہ فائز ہیں۔

مید

مید ہمارے پاک ماہی گیر ہیں۔اُن محنت کش ہاتھوں میں ساحلی آبادی کی روٹی روزی کا انحصار ہے ۔سمندر اُن کا اوڑھنا بھی بچھونا بھی۔ یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک بحیرہِ بلوچ محفوظ ہاتھوں میں رہے گا۔یہ لوگ سمندر کے بارے میں تقریباً ہر بات جانتے ہیں۔مگر پھر بھی نہ فشریز کی وزارت انہیں ملتی ہے، نہ تجارت اور شپنگ کی۔ نیوی کا چیف ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

میرالی

رندی عہد کی بلوچی شاعری اِن کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔آج کہاں ہیں،شاید کہیں بھی نہیں ہیں۔یعنی منظّم قبیلے کی صورت میں یہ لوگ اب وجود نہیں رکھتے۔

میرانڑیں

ایک بکھرا قبیلہ ہے۔ اس کا ارتکاز تو مغربی یعنی ایرانی بلوچستان میں ہے ۔مشرقی بلوچستان میں میرانڑیں بہت کم ہیں۔البتہ یہ لوگ زیادہ تر پنجاب میں آباد ہیں اور دوسرے نمبر پر سندھ کے الگ الگ مقامات میں موجود ہیں۔

میر واڑی

میر واڑی قبیلہ نغاڑ،سوراب میں سکونت پذیر ہے اور یہ احمد زئی خاندان کا جدِ امجد قبیلہ

ہے۔اس نے احمد زئی خاندان کی تشکیل سے پہلے نغاڑ میں سرداری کے فرائض انجام دیے۔میر عمر میرواڑی اس میں مشہور تاریخی شخصیت گزری ہے۔

اس کی ذیلی شاخیں کمبرانڑیں،گرگناڑی،احمد زئی اورالتازئی ہیں۔

مینگل

یہ بکھرا ہوا رند بلوچ قبیلہ افغانستان ، ایران اور پاکستان تینوں ممالک میں آباد ہے۔ (ہتو رام۔صفحہ 329) شاہی زئی ، وڈھ کی طرف ہیں ذگر مینگل نوشکی میں ، جبکہ سمالاڑی اِدھر اُدھر بکھرے ہیں۔اسی طرح ضلع چاغی،اگر پاکستان کی بات کی جائے تو بھی یہ قبیلہ ضلع خضدار، پٹ فیڈر اور سندھ کے مختلف مقامات پر کہیں گنجان اور کہیں چند گھرانوں کے بطور رہتا ہے۔ یہ حیثیت مجموعی یہ قبیلہ بھیڑ اور شتر پالی اور زراعت سے وابستہ ہے۔

اس کے قبائلی فرقے کبھی کبھی تو الگ قبائل لگتے ہیں۔میر گل خان نصیر نے اپنی سوانح عمری میں مینگل کے ذیلی طائفوں کو مندرجہ ذیل انداز میں بیان کیا ہے جو اُس کے بقول خود الگ الگ قبیلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

1۔میروانی یا میرواڑی

(قمبرانڑیں اور احمد زئی اس کی ذیلی شاخیں ہیں)

2۔ذگر

3۔سمالاڑی (سمائیل کی اولاد)

4۔گرگناڑی (گرگین کی اولاد)

5۔قلندداڑی (قلندر کی اولاد)

6۔مینگل زئی (یہ چھوٹا سا طائفہ ہے جو درہِ بولان کے آس پاس رہتا ہے)۔(23)

چھوٹی ذیلی شاخیں ہیں: مرحاجی، پہلواں زئی،حمل زئی، گمشادزئی، ، ذگر، دینار زئی، باران زئی،سمالانڑیں،قلندرانڑیں،گرگناڑی،میروانڑیں،کمبرانڑیں۔(24)

نورا مینگل،عطاء اللہ خان مینگل،گل خان نصیر،لونگ خان، عاقل خان اور گوہر ملک کی

بلوچ قومی وعوامی سیاست ، میں بے مثال خدمات کی وجہ سے مینگل دنیا بھر میں جانے جاتے ہیں۔میر گل خان تو بلوچی کے ملک الشعرا ہیں۔گوہر ملک خوبصورت افسانے لکھتی تھیں۔

ناروئی

ناروئی ایرانی بلوچستان میں رہتے ہیں ، اور تقریباً 23 قبائلی فرقوں میں منقسم ہیں۔ کاشتکاری میں بھی اچھے خاصے ماہر ہیں۔مگر یہ لوگ زیادہ تر مالداری اور شتر بانی کرتے ہیں۔''جرجیم'' نامی عمدہ قالین بناتے ہیں۔

ان کا سردار نصرت آباد میں رہتا ہے۔یہ سیستان وخراسان میں بھی رہتے ہیں۔حتیٰ کہ کچھ لوگ چاغی،کوئٹہ اور پشین میں بھی آباد ہیں۔

ننکانڑیں

(نوشک ،نوشکانڑیں)

تحصیل تونسہ میں آباد قبیلہ ہے جس کا صدر مقام منگروٹھا ہے۔اس کے علاوہ وہ اوستہ محمد، خضدار، نصیر آباد، جھل مگسی اور سندھ کے کچھ علاقوں میں آباد ہیں۔یہ بلوچوں کا نسبتاً ایک چھوٹا، مگر خواندہ قبیلہ ہے۔رنجیت سنگھ دور کے ابتدائی ایام میں اس کا قبائلی تشخص تباہ ہوگیا۔(25) یہ قبیلہ بلوچی کے علاوہ سرائیکی بھی بولتا ہے۔ملغانی جیسا مشہور قبیلہ دراصل اسی کی شاخ ہے جو کہ بعد میں چلتے چلتے ایک الگ قبیلہ بنا۔

ہمارے پاس بہت سے قبائل کے سرچشمہ نام ''نوشک'' کے بارے میں مزید معلومات ہونی چاہئیں۔نوشکانڑیں اور بگٹی کے نوشانڑیں کے ناموں کی تقریباً یکسانیت بھی دلچسپ مطالعہ کا حامل موضوع ہے۔

نظامانڑیں

یہ قبیلہ حیدرآباد میں آباد ہے۔بنیادی طور پر یہ لوگ ڈیرہ غازی خان کے تھے۔یہ نظام الدین رند کی اولاد ہیں۔(نظام الدین کون تھا، معلوم نہیں۔لگتا ہے یہ بہت بعد کا شخص تھا۔اس لیے کہ چاکر کے زمانے میں اس طرح کے نام نہیں ہوتے ہیں)۔غازی خان سے حیدرآباد آ کر یہ

لوگ تالپروں کے ساتھی بنے۔1843ء میں چارلس نیپیئر کی قیادت میں انگریز حملہ آوروں کے خلاف میانی کی مشہور جنگ اس قبیلے کے شہدا کی برپا کردہ تھی۔مری، چانگ، اور گوپانگ قبائل بھی اِن شہیدوں کی متبرک صفوں میں تھے۔

یہ جناب قادر بخش نظامانڑیں کا قبیلہ ہے۔

نوھانڑیں

رند و لاشار عہد کی شاعری میں ان کا ذکر آتا ہے۔ڈیمز نے مغلوں کے خلاف بلوچ لڑائیوں میں ان کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔اب یہ قبیلہ کہاں ہے، اس کے کتنے حصے بکھرے ہوئے اور اب کن کن بڑے قبیلوں کی ذیلی شاخیں بنا چکا ہے، پتہ نہیں۔

نوشیروانی

خاران کے باشندے ہیں۔ایران میں بھی رہتے ہیں۔ایک زمانے میں بہت مضبوط قبیلہ ہوا کرتا تھا۔

ھوت

مکران کا قبیلہ ہے۔ اس کے کچھ گھرانے ڈیرہ اسماعیل خان، جھنگ، ملتان، اور ڈیرہ غازی خان کے علاقوں میں بھی رہتے ہیں۔ہوت، مکران میں تو حاکم بھی رہے ہیں۔ابھی بھی وہاں کافی تعداد میں رہتے ہیں۔یہ لوگ ایران میں بھی موجود ہیں۔

شاہ لطیف نے اس قبیلے کو تا قیامت زندگانی بخشی ہے۔اس لیے کہ اس کی شاعری کی اہم ترین کردار، سسی کا محبوب پنوں، ہوت بلوچ تھا۔

میں نے شاہ لطیف پر لکھی اپنی کتاب میں ہوت قبیلہ اور اس کے بود و باش پہ بہت لکھا ہے۔

یار محمد زئی

یہ لوگ خواش ، ارندگان ، بمپور ، گُشت ، دیزک اور جالک میں آباد ہیں۔ان قبائل کی اکثریت خانہ بدوش مالداری کرتی ہے۔یار محمد زئی مندرجہ ذیل گروپوں میں منقسم ہیں:

سہراب زئی، محمود زئی، شیر زئی اور میر خیل زئی۔

ریفرنسز

1۔نصیر،گل خان۔کوچ و بلوچ۔صفحہ 104

2۔نصیر،گل خان۔کوچ و بلوچ۔صفحہ 117

3- گزٹیئر،کچھی۔دوسرا ایڈیشن۔1986ء۔گوشہ ادب۔صفحہ نمبر 44

4۔گزٹیر کچھی۔1986ء۔گوشہ ادب کوئٹہ۔صفحہ 51

5۔گزٹیر بلوچستان،سبی۔1986ء۔گوشہ ادب کوئٹہ۔صفحہ 55

http://en.wikipedia.org/w/indexphp?title=chandio&oldid=478597990۔6

7۔لیغاری عبدالقادر۔تاریخ ڈیرہ غازی خان۔حصہ دوم۔صفحہ 51

8۔میکلیگن،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا۔2004ء۔بک ہوم۔صفحہ 213

9۔ہتورام/ بگٹی،عزیز۔بلوچ قبائل۔2004ء۔قلات پبلشرز کوئٹہ۔صفحہ 54

10۔میکلیگن،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا،2004ء۔بک ہوم۔صفحہ 343

11۔شُلز فریڈ۔نومیڈزم اینڈ کالونیلزم۔2002ء۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔صفحہ 200

12۔شُلز فریڈ۔نومیڈزم اینڈ کالونیلزم۔2002ء۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔صفحہ 201

13۔شُلز فریڈ۔نومیڈزم اینڈ کالونیلزم۔2002ء۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔صفحہ 202

14۔میکلیگن،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا۔2004ء۔بک ہوم۔صفحہ 360

15۔شیدائی،مولائی۔تاریخ قلات(حصہ اول)۔1983ء۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔صفحہ 171

16۔میکلیگن،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا۔2004ء۔بک ہوم۔صفحہ 381

17۔میکلیگن،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا۔2004ء۔بک ہوم۔صفحہ 390

18۔بزدار،غلام نبی ساجد۔سرقبیلوی نظام۔ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔دسمبر 2007ء۔صفحہ 44

19۔ہتورام۔تاریخ بلوچستان۔صفحہ 80

20۔۔سبی گزٹیئر۔صفحہ 248

21۔بزدار،غلام نبی ساجد۔سرقبیلوی نظام۔صفحہ 44

22۔گزٹیئر۔کچھی۔دوسرا ایڈیشن۔1986ء۔گوشہ ادب۔صفحہ 36

23۔نصیر،گل خان۔ادبار کی چھاؤں میں۔ گل خان نصیر چیئر۔یونیورسٹی آف بلوچستان کوئٹہ۔2014ء۔صفحہ 16

24۔شیدائی،مولائی۔تاریخ قلات(حصہ اول)۔1983ء۔بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔صفحہ 128

25۔میکلیگن،ای ڈی/ایچ اے روز۔ترجمہ یاسر۔پنجاب وفرنیٹر کی ذاتوں کا انسائیکلوپیڈیا۔2004ء۔بک ہوم۔صفحہ 440

قبائلی اور علاقائی اتحادیے

بلوچ قبائل کی ساخت میں بننا بکھرنا اور اُس میں شکست وریخت صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔لہٰذا آج کوئی بھی بلوچ قبیلہ ایسا نہیں ملے گا جس کا کوئی حصہ نکل کر کسی دوسرے قبیلے میں شامل نہ ہوا ہو۔ یا کسی اور قبیلے کا کوئی ٹکڑا اُس میں آ کر نہ ملا ہو۔ ہر ٹکر، باہر سے آنے والے ایک یا ایک سے زیادہ امیگرنٹس کے آن شامل ہونے سے تشکیل پاتا رہا ہے۔ اور ان کا ''اتحادیہ'' مشترکہ دکھ سکھ اور مشترکہ ''شادی غم'' کے فلسفے سے جنم لیتا ہے۔ شجرہ والے ''اصلی'' گروہ اور نئے آنے والے گروپ باہم جذب ہوجاتے ہیں اور مشترک دکھوں سے نمٹتے ہوئے، اور اسی طرح مشترک مسرتوں سے مسرور ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ ایک بھائی چارے والی فضا تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ایک آدھ دن کا پراسیس نہیں ہوتا۔ اس میں سالہا سال لگتے رہے ہیں۔ گو کہ بلوچوں کے قبیلوں میں ہر فرقہ خود کو اعلیٰ و ارفع، اصلی بلوچ اور بہت ہی مقتدر ماضی کا حامل جتاتا ہے مگر اصل میں کوئی کسی سے، کسی صورت افضل نہیں ہے۔ سارے قبائل کی تشکیل اسی ''شادی غم'' کے پراسیس میں ہوئی ہے۔

یہ بات بھی تفصیل کے ساتھ پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ ٹکر کے اسی مرکزیے نے نئے آنے والوں اور پناہ لینے والے (ہمساخ) کو اپنے میں جگہ دی، انھیں چراگاہوں تک رسائی بخشی اور دکھ سکھ میں شریک ہونے والے اِن نوآمدہ لوگوں کو علاقے بخش دیے اور وہ رفتہ رفتہ اسی قبیلے کا ایک فرقہ اور اس طرح مکمل اور سند یافتہ، معزز و محترم بلوچ بن گئے۔

سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قبیلوی اتحاد کے وسیع ہو جانے کا پراسیس بھی چلتا رہا، ایک اور بلند و اعلیٰ تنظیم کی تشکیل کرنے۔ اس قبیلوی اتحاد نے جزوی طور پر ختم ہوکر جس نئی تنظیم کی تشکیل کی وہ ہے، علاقائی اتحاد۔

دوسری بڑی تبدیلی یہ آئی کہ سرداروں کے سیاسی اور اقتصادی اقتدار کے مضبوط ہوجانے سے فیوڈل رشتے مضبوط تر ہوتے گئے۔ فیوڈل کی زمینیں، اس کی چراگاہیں اور اس کے مویشی بڑھتے چلے گئے۔ فیوڈلوں کی معاشی قوت کے بڑھ جانے سے اچھی زمینوں پر قبضہ کرنے کی اُن کی اہلیت بھی بڑھتی گئی۔ پھر موروثی حکمرانی نے تو اُن کو مطلق قوت بنا ڈالا۔

قبائل کے اِس دائمی ''بکھرنے بننے'' کے عام انسانی اسباب ہی ہیں۔ بلوچ کے ہاں اس مظہر کی وضاحت، بھوک کے علاوہ ایک اور وجہ سے بھی ہوسکتی ہے: وہ ہے قبائلی جنگیں۔ یہاں دائمی جنگ و جنگی حالت یعنی یورش وحملہ نے کسی بھی قبیلے کو سابقہ قبیلے کی حالت میں رہنے نہ دیا۔

جنگیں انسانی حیات کی دشمن ہوتی ہیں۔ اس کے سبب قبیلہ روز بروز کمزور ہوتا جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے افراد کو اپنے اندر بخوشی قبول کرلیا کرتا تھا۔ یہ گنجائش ہی نہ تھی کہ نوآمدہ کی نسل اور رنگ کے بارے میں سوچا جاتا۔ اس لیے کہ تفریق کے یہ پیمانے تو پُرامن حالات کی بدبخت خصوصیت ہوتی ہیں۔ اُس زمانے میں جنگیں ہی جنگیں تھیں۔ کوئی یہ منحوس سوال نہیں کرسکتا تھا کہ تمہارا باپ کون ہے؟ بھائی کون ہے؟ کون سی زبان بولتے ہو؟ اور لباس کس طرح کا پہنتے ہو؟ ہر وہ شخص اپنا ہوتا تھا جو قبیلے کے سود و زیاں کا شریک بننے پہ آمادہ ہوتا۔ ہر نوآمدہ شخص لشکر میں جاملا، قبیلے کی جنگ میں حصہ لیا، فتح پائی، غنیمت بانٹی، اور پھر دوبارہ تلاشِ معاش کے لیے ایک اور قبائلی جنگ کے لیے روانگی ہوئی۔ اب اس سارے عمل میں شناختی کارڈ کی ضرورت کہاں تھی۔ اور اس کے لیے فارم ''اے'' اور ''بی'' پر کرنے کی فرصت کہاں تھی؟ انھی جنگی بحرانوں میں مختلف نسلوں، اور زبانوں کے لوگ دوسرے قبائل میں آن ملتے رہے اور قبیلے میں جذب ہوتے رہے۔ یہیں شادی بیاہ اور رشتہ داریاں کرتے رہے اور بلاآخر قبائلی مشترکہ زمین اور چراگاہ کا حصہ دار بن کر ہر طرح کی قبائلی ذمہ داریوں کے شریک اور مالک بن گئے۔(1)

چنانچہ سماج اصل نقل کے چکر میں نہیں پڑا۔ ہر وہ شخص ''اصلی'' اور ''سچا'' بلوچ ہے جو پیداواری عمل میں حصہ لیتا ہے۔ باقی پیمانے تو بس فکری کج روی کے لیے بنائے گئے ہیں۔ مگر اس فکری منافقت کو دور کرنا ہی تو ضروری کام ہے جس کے تحت ''صاف خون''، ''صاف نسل'' اور ''صاف قوم'' کی بے بنیاد تھیوری گھڑ لی گئی ہے۔ اور جس کی آڑ میں بلوچ کے اندر نسلی منافرت اور فرقہ واریت کے جھگڑے پیدا کر کے لوگوں کو ان کی طبقاتی قومی جمہوری جدوجہد سے دور کر لیا جاتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کرد ایک الگ اور معزز قبیلہ ہے مگر مزاری بلوچوں میں بھی ایک ذیلی شاخ اسی نام سے موجود ہے۔(2) اسی طرح بلیدی قبیلہ کی ایک شاخ ''گوش'' ہوا کرتی تھی۔ رند و لاشار لڑائی میں اس شاخ نے بہادری کے اعلیٰ مظاہرے کیے تھے اور بے جگری سے لڑنے کے جوہر دکھائے۔ چاکر نے ان ''گوشوں'' کو صلہ میں کچھ اراضیات اور دریائے ناڑی کے کالے پانی کا تیسرا حصہ بطور انعام بخش دیا جو آج تک ان کے تصرف میں ہے۔ ''گوش'' اب بلیدی کے بجائے نُجک قبیلے کا حصہ ہیں۔(3)

مری جو دراصل بجارانڑیں تھا، گزینی اور لوہارانڑیں کے آن ملنے سے عظیم الشان قبیلہ بنا۔ خود بجارانڑیں میں باہر سے آنے والے، اور چنانچہ اسے مضبوط بنانے والے عظیم قبیلوں میں سے رامکانڑیں، کلوانڑیں، اور شاہیجہ آئے۔ عظیم پوادی قبیلہ کوہِ سلیمان سے نعمت بن کر آیا۔ اور حالیہ زمانوں میں کیسرانڑیں بھی کوہِ سلیمان کی وسعتیں سمیٹ کر مری میں آن بسے۔ چانڈھے بعد میں آ کر اِس اتحادیہ میں شامل ہو گئے۔ جادا، اور مرحوم دلیل سالارانڑیں نے اپنے قبیلے میں نو آمدہ لوگوں کے بارے میں مجھے بتایا کہ ان کے قبیلے ''سالارانڑیں میں مزاری بلوچوں سے بابیانڑیں آن کر شامل ہو گئے۔ موسیٰ زئی بھی نو آمدہ ہیں۔ شیر خان زئی علاقہ باڈور سے سالارانڑیں کا حصہ بنے ہیں۔ شیلاچی، ہسنڑیں بلوچوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ رندھاں زئی بھی بعد میں سالارانڑیں کا حصہ بنے، بژیانڑیں لوگ ونڑیچی پشتونوں میں سے آ کر سالارانڑیں، مری اور بلوچ بن گئے''۔ اسی طرح کنگرانڑیں مری کے اندر دو ذیلی فرقے ہیں جن کے نام بزدار اور کھوسہ ہیں، جب کہ انھی دو

ناموں سے بلوچوں کے الگ الگ اور بڑے بڑے تمن بھی موجود ہیں۔ سومرانڑیں مری میں گوائہرام زئی اور سومرازئی باہر سے آ کر شامل ہوئے۔ قلندرانڑیں مری میں ڈانگیانڑیں، گریانڑیں، شیلاچی، محبتانڑیں، مصری زئی، ملگزارزئی اور میاں خان زئی بعد میں آ کر شامل ہوئے۔ شیرانڑیں، ژوب کے پشتون بھی ہیں اور مری کا ایک معزز قبیلہ بھی ہے۔ خراسان کے بلوچ آ کر مری میں بڑانڑیں بن گئے ہیں۔ یہی بڑانڑیں ڈیرہ غازی خان میں ایک الگ قبیلہ بھی تشکیل کرتے ہیں۔ مری کے مزارانڑیں میں بہت سارے کھیترانڑ عناصر شامل ہیں۔(4) ژنگ بھی بعد میں مری میں شامل ہوئے۔ پیکولین بتاتا ہے کہ میھکانڑیں مری دراصل زرکون ہیں۔ اسی طرح حسنڑیں نے مری قبیلے کو بے شمار لوگ عطا کیے۔ حسنڑیں بلوچ کوہ سلیمان کے جنوبی دامن میں آباد تھے۔ یہ قبیلہ خود بھی بہت سے بلوچ اور ہندی آریائی عناصر سے مل کر بنا ہے۔

یہ سب مخلوط اور مختلف القبائلی گروہ مری نامی بلوچ اتحادیہ میں شامل ہوتے گئے اور آج ''مری'' کے مشترکہ ٹائٹل تلے زندگانی گزار رہے ہیں۔(5) مری قبیلے کے ایک بزرگ اور تاریخ دان جناب محمد خان پیردادانڑیں کا بیان ہے کہ اس کے قبیلے پیردادانڑیں میں ایک قبیلہ ہے مکرانڑیں، جو کیچ سے آیا ہے۔ جروار مری دراصل لیغاری تھے۔ کچ کا دُرکانڑیں دراصل گورشانڑیں ہے جو کوہِ سلیمان سے مری میں آیا اور اب بجارانڑیں میں شامل ہیں اور قلندرانڑیں کے ساتھ ان کا سود و زیاں مشترک ہے۔ مری کا لانگھانی فرقہ ہندی نژاد ہے اور ملتان سے آیا ہے جو ایک زمانے میں سبی کے حاکم تھے۔ مری قبیلے کا شاھیجہ اور ہندی قبیلہ شاھوجہ کئی علما کی نظر میں ایک ہی ہیں۔ (6) 19ویں صدی کی ساتویں دہائی میں مری کے صرف 22 ٹکر (ذیلی فرقے) تھے۔ وہی مری 20 ویں صدی کے شروع میں 35 ٹکر تک بڑھ گیا۔(7)

حسنڑیں بلوچوں نے شاذیھان مری سے شکست کھا کر کھیترانڑ کے ہاں پناہ لی اور اب اس کے اتحادیہ کا حصہ ہیں۔(8) کھیترانڑوں کا ایک حصہ ناھڑ ہے جو شکل و صورت اور تاریخی لحاظ سے باہر سے آئے ہیں۔

بگٹی قبیلہ بھی بعد میں بتدریج دوسرے بلوچ، حتیٰ کہ غیر بلوچ قبیلوں کے مہاجروں یا

پورے کے پورے گروہوں (مثلاً ڈومکی قبیلہ کے چاکرانڑیں گروہ) کے جذب ہوجانے سے وسعت پا گیا۔ ممتاز محقق اکبر ایس احمد کے مطابق مسوری خالص ہندی نسل سے متعلق ہیں۔(9)اس کی اِس بات سے مکمل طور پر تو اتفاق نہیں کیا جاسکتا مگر یہ بات صحیح ہے کہ ان کا ایک حصہ ہندی نسل کا ضرور ہے۔ پیروزانڑیں قبیلہ کو بگٹی کے دیگر فرقے یعنی شلوانڑیں،راھیجہ اورنوثانڑیں سے علیحدہ شدہ چھوٹے گروہ تشکیل کرتے ہیں۔شمبانڑیں بگٹی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دراصل مگسی قبیلے سے آئے ہیں۔

ڈومبکی کے اندر ہندی مہاجروں کی بڑی تعداد شامل ہوچکی ہے۔حتیٰ کہ اس قبیلے کے زیادہ فرقوں کے نام ہندی ہیں۔مثلاً بھانڈ، براھمانڑیں وغیرہ۔ڈومبکی نے کھیری کو سندھ میں دھکیل کراوراس کے باقی ماندہ لوگوں کو اپنے اندر جذب کر کے ان کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔جکھرانڑیں جو آج ایک خودمختار، نامور بلوچ قبیلہ ہے۔خودابھی 1845ء میں ڈومبکی قبیلہ سے جدا ہوگیا۔(10)

اب ذرامگسی قبیلہ کو دیکھئے۔اس قبیلے میں چھوٹے فرقوں کی تعداد انیسویں صدی کے شروع میں پٹنگر نے پندرہ بتائی تھی جو اُسی صدی کے آخر میں بڑھ کر 55 بن گئی۔معلوم نہیں کتنے کتنے لوگ آن کر اس میں شامل ہوتے گئے۔

لیغاری خود ایک بہت بڑا قبیلہ ہے۔مگر تالپور کا نام لیغاری سے زیادہ مشہور اور معروف ہے۔حالاں کہ یہی تالپور،لیغاری قبیلے کی محض ایک شاخ ہے۔یہی تالپور انگریز سے قبل پچاس برس تک سندھ پر حکومت کرتے رہے۔(11)اسی طرح آلیانڑیں بھی لیغاریوں کا ایک ذیلی قبیلہ ہے اوراسی نام سے مری قبیلے کا ایک فرقہ بھی موجود ہے۔جروار مری میں بھی ایک فرقہ ہے اور کھوسہ کی ایک شاخ بھی۔ایشانڑیں کھیترانڑ بھی ہیں اور کھوسے بھی۔جسکانڑیں ایک الگ قبیلہ بھی ہے اور گورشانڑیں کا ذیلی فرقہ بھی۔لاشاری ایک الگ تمن بھی ہے۔اور گورشانڑیں کی ذیلی شاخ بھی۔

بزنجو قبیلہ جو مقامی طور پر''بیـــنـــجـــو'' کہلاتا ہے دراصل چار قبیلوں کا وفاق ہے: حملاڑی،تمراڑی،اومراڑی(اومرانڑی ایک الگ قبیلہ بھی ہے پٹ فیڈر میں)اور سیاہ پاد(سیاہ پاد خاران میں ایک الگ قبیلہ ہے)۔(12)

بجارانڑیں جیکب آباد، کشمور میں ایک الگ اور سالم بلوچ قبیلہ ہے،مگر مری میں ایک ذیلی شاخ بھی ہے۔

ان سارے دلائل سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی قبیلہ،کوئی شاخ ''اصلی تے وڈا'' اور'' خالص وسچا'' نہیں ہے اور نہ ہی ہم بلوچ، یا بلوچوں کے قبیلے، یا قبیلوں کے فرقے محض ایک فردواحد کی اولاد ہیں۔ بلکہ ہم دیگر زندہ انسانی سماجوں کی طرح بہت سے عناصر اپنے اندر جذب کرتے رہے ہیں اور دوسروں کی ساخت میں بھی شامل ہوتے رہے ہیں۔

چنانچہ آج موجود تمام بلوچ اور غیر بلوچ قبیلے دوسرے افراد کو شامل کرتے رہنے کی آسان شرائط کی بدولت پچھلے سوڈیڑھ سو برسوں میں اپنی تعداد بہت بڑھا چکے۔

ریفرنسز

1۔گورڈن، ٹی باؤلز۔دی پیپل آف ایشیا۔1977ء۔ویڈن فیلڈ اینڈ نکلسن ،لندن۔صفحہ 154

2۔لاشاری۔مظہر علی خان۔بلوچ تاریخ کے آئینے میں۔2001۔
علم وعرفان پبلشرز لاہور۔صفحہ 30

3۔ایضاً صفحہ نمبر 69

4۔پیکولین۔صفحہ 186

5۔گنکوفسکی۔پاکستانی قومیتیں۔صفحہ 156

6۔اکبرایس احمد۔درکتاب Marginality And Modernity۔صفحہ 56

7۔پیکولین۔صفحہ 188

8۔لیغاری،عبدالقادر۔تاریخ ڈیرہ غازیخان۔جلد دوئم۔صفحہ 11

9۔اکبرایس احمد۔.... Trail by صفحہ 56

10۔پیکولین۔صفحہ 72

11۔پیکولین۔صفحہ 74

12۔بزنجو،غوث بخش۔تحریک آزادی کا ایک باب۔طاہر بزنجو کی کتاب ''بابائے بلوچستان'' سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ۔
1999ء۔صفحہ 35

بلوچ قبائلی جنگی معیشت

دیگر انسانوں کی طرح جنگ بلوچوں کا من پسند مشغلہ بالکل نہیں رہا۔ یہ جنگ تو سماجی ارتقا کے ایک خاص مرحلے پہ انسان کی ایک مجبوری رہی ۔ یہ بدبخت کام بہت عرصے تک دوسری قوموں کی طرح بلوچوں کی بھی معیشت کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ سرقبیلوی نظام میں شکار کے جانور، اور گھروں میں سدھائے ہوئے جانوروں پہ جنگیں ایک معمول ہوا کرتی تھیں۔ بقول ڈائر'' قبائل درحقیقت لوٹ مار پر گزارہ کرتے ہیں''۔(1) اس لیے اُس دور میں سارای توقیر، سارا احترام جنگ کو حاصل تھا۔ اولیور لکھتا ہے کہ ''حتیٰ کہ (جنگ کے مقابلے میں) زراعت بھی نیچ ہے اور آرٹ وفن کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لکھنے کا فن تو حقارت سے بھی نیچے کا درجہ رکھتا ہے''۔(2) ویسے بھی انسانی تاریخ میں معیشت کا جو بھی وسیلہ ہوتا ہے، اور روزی دینے والا جو بھی پیشہ ہوتا ہے، وہی ہمیشہ انسان کے لیے احترام کا باعث رہا ہے۔

بلوچ جب مال چھیننے (آوار) والی جنگوں پر جاتے تھے تو حاصل شدہ سارے مال و متاع کی قیمت لگا کر لڑائی میں شامل افراد میں تقسیم کرتے تھے۔ سارے مال کا پانچواں حصہ یعنی ''پنچک'' جنگ کے کمانڈر (یا کبھی کبھی سردار) کو دیا جاتا تھا اور بقیہ میں سے جنگ میں شامل ہر فرد کا ایک حصہ، اس جنگ میں شامل لوگوں میں کوئی اگر گھوڑے پر ہوتا تو اس کے گھوڑے کا ایک حصہ اور اگر کسی کے پاس بندوق ہوتی تو نصف حصہ مزید دیا جاتا تھا۔ قبیلہ کی طرف سے جاسوسی کرنے والے

(جاری) کو دو حصے دیے جاتے تھے، اس لیے کہ اس کے کام میں رِسک بہت تھا۔(3) اگر وہ جنگ میں مارا جاتا تو اس کا نصف حصہ اس کے رشتے داروں کے حوالے کیا جاتا تھا۔

لوٹ مار کے سارے مال کی قیمت بیل کی اکائی پر مقرر کی جاتی تھی۔ ایک گھوڑی چار گائیوں کے برابر تصور کی جاتی تھی۔ اس لیے کہ گھوڑی جنگ میں بہت کارآمد ہوتی تھی جبکہ جنگی ماحول میں گائے تو بہت بے کار اور حقیر جانور ہوتی ہے۔(4)

''آوار'' والی جنگ میں حصہ نہ لینے والے کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ اُس کے لیے ''ترکیر'' کا حقیر لفظ استعمال کرتے تھے۔

بلوچ اپنے کوڈ، یا رواج کو استحکام و دوام بخشنے کے لیے بہت ساری مثالوں کا سہارا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ایک دفعہ مری کا لشکر مال لوٹنے کی خاطر جنگ میں گیا تو ان کا مشہور جنگجو کمانڈر دلیل ساتھ نہ تھا۔ وہ دلیل جو صرف اپنی بہادری اور جنگی مہارت کی بدولت غنیمت کا پنچک لیتا رہتا تھا۔

اِدھر جب قبیلے کے بہادر جنگ میں گئے ہوئے تھے تو دلیل اپنے ساتھیوں سمیت علاقے میں حفاظتی اقدام کے بطور گشت کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت کسی قبر کے پاس بیٹھی آہ وفریاد کر رہی ہے۔ دلچسپ بات اُس نے یہ نوٹ کی کہ وہ مگر قبر کافی پرانی تھی۔ دلیل کو شک پڑا کہ غالباً یہ قبر نہیں ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اس بڑھیا کا سر قلم کرنے کا حکم دیا۔ اور پھر جب قبر کھدی تو اُس میں خزانہ چھپا ہوا تھا۔ دلیل نے خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اُدھر جب مری لشکر ''آوار'' کی جنگ سے فتح مند واپس لوٹا تو انہوں نے دلیل کو رواج کے مطابق حصہ دینے سے انکار کر دیا۔

دلیل نے کہا، ''اچھا، تمہارا حصہ تمہارا، اور میرا حصہ میرا''۔

مری جنگجوؤں کو شک گزرا کہ یقیناً دلیل کے پاس بھی کوئی لُوٹ مار کا مال ''آوار'' ہوگا۔

اس لیے انھوں نے کہا؛ ''نہیں، ہمارے مال میں آپ کا حصہ ہے اور آپ والی دولت میں ہمارا''۔

چنانچہ دلیل کو اپنا سونا چاندی اس لیے بانٹنا پڑا تاکہ جنگ میں شامل نہ ہو کر بھی جنگ سے حاصل

کردہ فضول اشیا میں حصہ دار بننے کا اعزاز حاصل کر سکے۔ بات مال کے قدر کی نہ تھی، بات جنگ میں غنیمت والے مال میں حصہ کے اعزاز کی تھی۔ اس طرح پہلی بار ایک بہادر بلوچ نے جنگ میں شامل نہ ہو کر بھی، اپنا حصہ لے لیا۔ جنگی قوانین میں یہ ایک غیر معمولی ترمیم تھی۔

بلوچوں کے تقریباً ہر قبیلے میں، مری قبیلے کے میھکانڑیں فرقے کی طرح، ایک کرامت والا گھرانا موجود رہا ہے جو اپنی ''روحانی طاقت'' سے نہ صرف دشمن کے جادو کو بے اثر کرتا تھا بلکہ وہ خود اُن پر اپنی کرامت کے ذریعے دشمن پہ حاوی ہوتا تھا۔ وہ اپنی کرامت کے ذریعے دشمن کی بندوقیں جام کرتا تھا یا ان کی تلواروں کے ساتھ تیغ بندی کرتا تھا۔ اس لیے اُسے بھی حصہ ملتا تھا۔ اُس کو جنگ کے میدان سے ہمیشہ دور، ایک تیر کش کے فاصلے پر رکھا جاتا تھا تاکہ وہ خود دشمن کے ہتھیاروں سے بچا رہے۔ اس لیے کہ قبیلے کے اِس روحانی کمانڈر کے زخمی ہونے یا مرنے کی صورت میں جادو ٹوٹنے اور قبیلے کو شکست ہو جانے کا خطرہ ہوتا۔

قبیلے کے سردار کو بھی جنگ سے دور رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح دستار بند وڈیرہ اور قبیلے کا قومی شاعر بھی جنگ کی حد سے باہر رکھے جاتے تھے۔ سردار اور وڈیرے جنگی کونسل کا کام دیتے تھے۔ وڈیرہ اپنے سیکشن کا بڑا ہوتا ہے اور اس کا عہدہ موروثی ہوتا ہے۔ اس کا سیکشن اس پہ دستار بندی اسی طرح کرتا ہے جس طرح کہ پورا قبیلہ اکٹھا ہو کر سردار پر دستار بندی کرتا ہے۔ اس لیے وہ ''قبائلی ہیرارکی'' میں اہم عہدیدار ہوتا ہے۔ وڈیرہ کے ساتھ کبھی کبھی ''مقدم'' بھی ہوتا ہے۔ جو اس کے ایگزیکٹو افسر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ وڈیرہ کے احکامات ذیلی شاخوں کے معتبروں تک پہنچائے۔ مقدم کا عہدہ موروثی نہیں ہوتا (5)۔

جنگ کے زمانے میں وڈیرہ کی ڈیوٹی تھی کہ مقرر کردہ فارمولے کے تحت اپنے لوگوں میں سے جنگجو جمع کر کے روانہ کر دے۔ وہی اپنی مہیا کردہ نفری کے لیے پلٹون کمانڈر مقرر کرتا تھا۔ اس طرح قبیلوں کا مکمل طور پر ایک ورکنگ سسٹم اور نیٹ ورک موجود ہوتا تھا۔ فرد سے سفید ریش تک اور سفید ریش سے معتبر اور مقدم تک، مقدم سے وڈیرہ اور پھر سردار تک۔ یہ سارا نیٹ ورک جنگی ماحول اور اس کے تقاضوں کے مطابق بنا ہوا ہے۔ یہی جنگی قبائلی تشکیل آج کے فیوڈل بلوچستان

میں اب تک جاری ہے۔ یہ اس قدر مضبوط اور گہری جڑوں والا ہے کہ زرعی اتحاد یہ آج تک اس کا مکمل متبادل نہ بن سکا۔۔۔ مگر تا بہ کئے؟

جنگی قواعد وضوابط

دنیا بھر میں بالعموم اور بلوچ میں تو بالخصوص جنگ اور اس کی کوئی کارروائی کبھی اصول و ضوابط سے باہر نہیں ہو سکتی تھی۔ چوں کہ بلوچ جنگ کا اسپیشلسٹ ہے اس لیے اس کے جنگی قوانین بہت باریک اور مفصل ہوتے ہیں۔ ہر جنگجو کے لیے لازمی ہے کہ ہمیشہ لڑائی کے اصول وقائدہ کی پابندی کرے، بصورت دیگر وہ بزدل، اور سطحی شخص تصور ہوتا تھا۔ اور اُس پہ ضرب المثل بنتے، اس کے خلاف شاعری ہوتی۔ اور یوں بالآخر جو جنگی سیٹ اپ میں خودکشی یا جلاوطنی پر منتج ہوتا تھا۔

قبائلی نظام بہت خود احتسابی کا نظام ہوا کرتا تھا۔ مسلمہ رواج اور قاعدے کی ذراسی خلاف ورزی سے اُس شخص کے خلاف ضرب المثل بنتے تھے، اُس کے خلاف شاعری ہوتی تھی، اُسے سوسائٹی میں طعنوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور ایک طرح کا توہین آمیز سوشل بائیکاٹ کیا جاتا۔

بلوچوں کے جنگی اصول دراصل بہت قدیم عہد سے چلے آرہے ہیں۔ معقول اور، روایتی بلوچ آج بھی بڑی سختی سے ان پر عمل درآمد کرتا ہے۔ مثلاً انفرادی لڑائی میں حملہ آور کے لیے لازمی ہے کہ بہت دور سے (اُس زمانے کے ہتھیار یعنی تیر کمان، کی مار کے فاصلے سے) دشمن کو للکار کر خبردار کر دے تاکہ اسے اپنے دفاع کا مناسب وقت مل سکے۔ (مگر، آج کے کلاشنکوف، بارودی سرنگ، راکٹ لانچر اور میزائل نے اس اصول کو برباد کر کے رکھ دیا ہے)۔ اسی طرح لڑائی میں کوئی بھی ناجائز طریقہ اختیار کرنا برا فعل تصور ہوتا ہے۔ لڑائی میں آخر تک راست بازی سے کام لینا لازمی ہوتا ہے۔ زہر آلود تیر اور چھپائے ہوئے اسلحہ کا استعمال منع تھا۔ اسی طرح مہمان کو، سوئے ہوئے آدمی کو، قیدی کو، کمسن کو اور پناہ میں آئے ہوئے شخص کو قتل کرنا سخت معیوب کام تصور ہوتا تھا۔ خون کا بدلہ خون ہوتا تھا۔ پناہ میں آئے ہوئے شخص کے تحفظ کے لیے لڑنا حتیٰ کہ اپنی جان تک قربان کر دینا لازمی ہوتا تھا۔ مہمان کے جان و مال کو ہر خطرے سے بچانا اور امانت کی حفاظت حتمی

ہوتی تھی۔سوائے سیاہ کاری کے عورت کوقتل کرناعظیم جرم تصور ہوتا تھا۔ ہندو (مذہبی اقلیت) کو مارنا گویا گناہِ کبیرہ تھا۔شلوار پہننے کی عمر سے کم سن لڑکے کوقتل نہیں کیا جاتا تھا۔ پیر کے دربار یا مسجد میں گھس جانے والے شخص کوقتل سے امان ملتی تھی۔ جس نے جوتے گلے میں لٹکائے ہوں یا جوتا دانتوں میں پکڑا، اُسے بھی قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ تھا بلوچی کوڈ۔جس کی ہر قیمت پر پاس داری کرنا لازمی تھی۔

بلوچی میں دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں، جن کی ادائیگی سے مطلب کچھ سے کچھ بنتے ہیں۔''پلو بندغ'' (Pallav) طرف داری یا جانب داری کو کہتے ہیں۔لیکن ''پلوہ بندغ'' بلوچوں میں ایک عمومی جنگی رواج ہوا کرتا تھا۔ زورآور کی تلوار کے سامنے ایک دوسرے کی قمیصوں کے دامنوں کو گرہ دے کر گویا سیسہ پلائی دیوار بنائی جاتی تھی۔ یہ گویا بہادری، اوراتحاد کی انتہا ہوتی تھی۔ مرنا جینا ایک ساتھ۔سٹالن کے مشہور فقرے No Step back کی عملی شکل۔

بگٹی قبیلے میں ''چیف'' اور مری قبیلے میں ''راہ زن'' انگریزوں کے ہاں ''نائٹ'' کی طرز کے دو ایسے عہدے تھے جو صرف اورصرف جنگی امور میں اہم کردار ادا کیا کرتے تھے۔ جنگ کے میدان میں کمانڈر یعنی وڈیرہ یا سردار کے بعد دوسرا نمبر اُسی کا ہوتا تھا۔سردار کی طرح اس کا ٹائٹل بھی خصوصی اہمیت رکھتا تھا۔ انگریز نے آکر اس کی اہمیت ختم کردی۔ اس لیے کہ ایک تو ذرا سا امن بحال ہوا۔ پھر ویسے بھی بارود نے آکر کئی ادارے تہس نہس کر کے رکھ دیے۔ چونکہ بندوق اور توپ بہت دور سے نشانہ بناتی ہیں اس لیے اب جنگ اُس طرح عزت و وقار کا ذریعہ نہیں رہی جیسے کہ پہلے تھی۔اس ایجاد نے شخصی بہادری وشجاعت پر گہری ضرب لگائی۔(6)

راہزن اور چیف کا عہدہ بہت عرصے تک سردار ہی کی طرح موروثی نہ تھا، مگر بہت بعد میں جائیداد کی طرح یہ بھی وارثت میں منتقل ہونے لگا۔ یہ جنگ کے تمام امور کی نگرانی کے سلسلے میں سردار کا چہیتا شخص ہوتا تھا۔ وہ ایک راہنما کی حیثیت سے گروہ کی راہنمائی کرتا تھا جنگ کے وقت وہ ننگی تلوار لیے آخری صف سے بھی پیچھے کھڑا ہوتا۔ اس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ لڑائی میں شامل افراد میں سے اگر کوئی میدان جنگ سے بھاگ جانے کی کوشش کرتا تو وہ اسے وہیں قتل کردے۔

اگر کسی سردار، رہزن یا وڈیرہ کا بیٹا اپنے باپ کی موت کے وقت کم سن ہو تو اس کی مدد کے لیے قبیلہ کا کوئی معمر یا تجربہ کار شخص مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ شخص اپنے مشیر یا مشیروں کی مدد سے اصل سردار یا وڈیرہ کے بالغ ہونے تک اس کے سارے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

انیسویں صدی کے وسطی زمانے میں خان قلات نے ''قومی عدل'' کا اصول نامہ وضع کیا اور بلوچستان کے سارے قبیلوں کے رسم ورواج کو قانونی شکل دے دی۔(7)

(مگر یوسف عزیز مگسی کی پوری تحریک کے باوجود آج تک بلوچ قوانین کو تحریری شکل نہ دی گئی)۔

ریفرنسز

1۔ڈائر، جنرل/ گل خان نصیر۔ بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار۔1979ء۔نساء ٹریڈرز کوئٹہ۔صفحہ 60

2۔اولیور Across the Border.....Pathan and Baloch ۔1890۔ چیپ مین اینڈ ہال لمیٹڈ۔ لندن۔صفحہ 27

3۔سبی گزٹیئر۔صفحہ 310

4۔اولیور......صفحہ 62

5۔سبی گزٹیئر۔صفحہ 308

6۔مبارک علی۔ جاگیرداری۔1996۔فکشن ہاؤس لاہور۔صفحہ 36

7۔پکولین۔صفحہ 156

بلوچ مویشی بانی

اپنی تاریخ کے ایک بہت بڑے حصے میں بلوچ سماج کے معاشی وسماجی فیبرک کا اہم ترین نیوکلی اُس بہر حال چرواہی معیشت ہی رہی ہے۔اور یہ دورانیہ ابھی بھی ختم نہ ہوا۔فیصدی کے حساب سے بلاشبہ ساٹھ فیصد سے زیادہ تعداد میں بلوچ آج بھی مویشی بانی پہ مشتمل روزگار سے وابستہ ہے۔

اپنے وسیع رقبے کی بنا پر آج بھی پاکستان کی 50 فیصد بھیڑیں اور 28 فیصد بکریاں بلوچستان میں پالی جاتی ہیں۔حتیٰ کہ صنعتی لسبیلہ میں آپ کو بڑی آبادی، لائیوسٹاک سے وابستہ ملے گی۔فیوڈل نصیرآباد وسبی وکچھی میں بھی بعینہ یہی حال ہے۔اور بقیہ بلوچ معاشرہ تو ویسے ہی ماقبل فیوڈلزم میں رہتا ہے جہاں مویشی بانی ایک بڑا ذریعہ معاش ہوتی ہے۔

بارشوں پر منحصر سرزمین، اورشدت بھرے موسموں کے علاقے پہ مویشی بانی چوں کہ ایک جگہ پر آباد ہوکرنہیں ہوسکتی، اس لیے موسموں کے مطابق اور بارشوں کے مختلف جگھوں پر ہونے کے باعث چراگاہوں کی محتاج خانہ بدوشی کرتے رہنا بلوچوں پر مسلط ہوگیا۔(1) اندازہ کیجیے کہ جنوب مغربی بلوچستان کے تقریباً ایک تہائی مویشی سردیوں کی سہ ماہی میں سبی اورکچھی کے میدانوں میں ہجرت کرتے ہیں۔

مویشی بانی ایسا کام ہے جسے بلوچ آٹومیٹک انداز میں کیے جاتے ہیں۔قدیم زمانوں سے ہمارے آباؤاجداد یہ کام کرتے چلے آرہے ہیں ناں، اس لیے۔اورجیسی مویشی بانی وہ قدیم لوگ کرتے تھے، ہم آج بھی بالکل اُسی طرح کی مویشی بانی کرتے ہیں۔اس بارے میں کسی نئی تخلیق کاری اور تبدیلی کی نہ تو ضرورت محسوس کی گئی اور نہ اس کی گنجائش رکھی گئی۔سرکار اور ریاست موجود نہ ہوتو انسانی ارتقا بہت سست رفتار ہوتی ہے۔اپنی مخصوص جغرافیائی ساخت کی بدولت بلوچستان میں مویشی کی نسل بھی وہی ہے جو آباؤاجداد کے زمانوں میں ہوا کرتی تھی۔

بلوچ عموماً بھیڑوں کی مالداری کرتے ہیں۔بکریاں دوسرے نمبر پر آتی ہیں۔تیسرے نمبر پر ان کے پاس اونٹ ہیں۔چوتھے نمبر پر گدھے آتے ہیں جنھیں یہ گھر کی نقل مکانی اور لکڑی پانی کی باربرداری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اوراس کے بعد گائیں آتی ہیں۔گھوڑے رکھنے کا رواج کم ہوتا جارہا ہے۔بھینسیں تو بالکل کم پالی جاتی ہیں۔(3 اگست 1996ء کے روزنامہ ''ڈان'' کے مطابق اتنے بڑے بلوچستان میں صرف ایک لاکھ بھینسیں تھیں)۔

بھیڑوں میں مشہور نسلیں ہیں؛ ہرنائی، بیورغ، رخشانی اور بلوچی۔

بیلوں میں مشہور نسل بھاگ ناڑی ہے۔

بلوچستان میں بھیڑ بکریاں ہماری اپنی اندرونی ضرورت سے زائد ہیں اور ہم ہر سال تقریباً دوملین مویشی یہاں سے باہر فروخت کرتے ہیں۔1986ء کے سینسس کے مطابق مری کے ضلع میں بڑے جانوروں کی کل تعداد ایک لاکھ سولہ ہزار تھی۔بھیڑوں کی سرکاری تعداد چودہ لاکھ دو ہزار تھی اور بکریاں چھ لاکھ چھیاسٹھ ہزار تھیں(2)۔1996 میں چاغی میں چار لاکھ بھیڑیں، دولاکھ بکریاں، ساڑھے سترہ ہزار بیل گائے، اور ساڑھے تیئس ہزار اونٹ تھے۔(3) ضلع پشین میں 1996ء میں تین لاکھ بھیڑیں، ڈیڑھ لاکھ بکریاں، بیس ہزار بڑی سنگیوں والے جانور، ڈیڑھ ہزار بھینسیں اور تین سو اونٹ تھے۔(4) پاکستان کے لائیوسٹاک کی آبادی کا 40 فیصد بلوچستان میں ہے۔یہاں تقریباً گیارہ ملین بھیڑیں ہیں، دس ملین بکریاں، 5 ملین پولٹری ہیں۔

تقریباً سوالاکھ کو بھیڑ پال لوگ مویشی بانی سے اپنا گزر بسر کرتے ہیں۔(5)

ریفرنسز

1۔سٹڈیزان براہوئی۔۔۔صفحہ 71

2۔لائیوسٹاک سینسس رپورٹ۔1985ء

3۔چاغی ڈسٹرکٹ پروفائل،صفحہ نمبر 41

4۔ڈسٹرکٹ پروفائل،پشین،صفحہ نمبر 37

5۔پیہرسن۔صفحہ 41

پہلا چیپٹر

بھیڑ......بلوچ کی روزی روٹی

بھیڑ بلوچ کی روزی کا وسیلہ ہوتی ہے، روٹی اور کپڑا مہیا کرتی ہے، دکھ درد کی محافظ ہوتی ہے، جرمانہ اور تاوان کا درمان ہوتی ہے، چادر اور چار دیواری کی نگہبان ہوتی ہے، اور شادی، لب اور غم کے وقت کی کرنسی ہوتی ہے۔ اور بارٹر تجارت میں زرِ مبادلہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے بھیڑ کو بلوچ معاشرے میں کرامت اور برکت والا بھی سمجھا جاتا ہے اور بختاور بھی۔ سردار کے سر کی قسم کے بعد ہماری بڑی قسم ہوا کرتی تھی:

''میشانی سریں''(قسم ہے بھیڑوں کی)

یہ عجب ہے کہ انگریز بھیڑ کو احتجاج نہ کرنے والی، غلام اور بے ہمت مخلوق سمجھتے ہیں۔ اسے جتنا مارو پیٹو، گھسیٹو یا ذبح کرو، یہ کچھ نہیں کہتی، کوئی فریاد نہیں کرتی۔ بغیر احتجاج اور بے نوائی میں دکھ جھیلتی رہے گی۔ اسی لیے انگریز بھیڑ کو بزدلی کی علامت سمجھتے ہیں اور بزدل آدمی کو بھیڑ کی طرح ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ جب کہ بلوچ بھیڑ کو ولی اللہ سمجھتے ہیں۔

بلوچ شاید چیخنا چلانا فریاد کرنا اچھا نہیں سمجھتے۔ اسی لیے وہ ہمہ وقت فریادیں کرتی بکری کی بالکل بھی عزت نہیں کرتے۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔

بھیڑ پال لوگ اپنے مویشی کو ٹولی یا یونٹ کی صورت میں ترتیب دیتے ہیں۔ ہر یونٹ کو ''مُہر''(ریوڑ) کہتے ہیں۔ ایک مُہر میں عموماً ساٹھ مویشی ہوتے ہیں۔ بھیڑوں کے مُہر کو ''میگڑ'' کہا

جاتا ہے اور بکریوں کے مُہر کو ''رمغ''۔ اونٹوں والے کو ''بگ'' اور گائیوں کے رم کو ''گورم'' کہتے ہیں۔

بھیڑ بکریوں کے ایک مُہر کو ایک شخص سنبھالتا ہے،۔ وہ اسے چراگاہوں تک چرانے لے جاتا ہے، اور اس کی سلامتی اور بہبود کا خیال رکھتا ہے۔ اُس شخص کو ''پہوال'' کہتے ہیں۔

بھیڑ پال معیشت میں طبقاتی درجہ بندی

بلوچستان میں بھیڑ پال معیشت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک جگہ ٹک کر آباد ہونے نہیں دیتی۔ انسان ہر وقت بال بچوں سمیت چارہ، اور پانی کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ اور ایک مسلسل خانہ بدوشی کی حالت مسلط ہوتی ہے۔

مویشی بانی کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس میں ایک جگہ ٹک کر رہنا نصیب نہیں ہوتا۔ بارشوں، گھاس اور چراگاہوں کے پیچھے بھاگنا پڑتا ہے۔ کچھ دن رہ لیے، چراگاہ چَر لی۔ اور جب یہ گھاس ختم ہوئی تو پھر نئی چراگاہ کی تلاش میں۔ یہ بے منزل، مستقل، اور ابدی خانہ بدوشی کے سفر عذاب ہوتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے مویشی کے ساتھ رہنا اور ریوڑ کے پیچھے پیچھے گھسٹ کے چلنا ہی انسان کو حیوان بنا ڈالتا ہے۔ ہتھیلیوں کی نزاکت، جسم کا سڈول پن اور پیروں کی نازک اندامی سب کا سب غارت ہوجاتی ہیں۔ انتہائی سردی ہو، یا سورج کی جلتی شعاعیں، موسم کی یہ شدت مرد اور عورت کی شکل کو سیاہ کر دیتی ہے۔ جوتے صرف اس لیے ہی خستہ حال نہیں کہ غربت ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ مال مویشی والا ہر روز شہر کے سپاٹے تو نہیں کر سکتا۔ سال چھ ماہ بعد کہیں شہر جانا ہوتا ہے اور وہ بھی راشن وغیرہ کی سنگین ضرورت ایسا کرواتی ہے۔ پھٹے پرانے اور اَن دھلے کپڑے محنت کشوں کی زندگانی کا عکس ہوتے ہیں۔ استری، مایا،

اور سرف صابن چرواہی معیشت کا تقاضا ہی نہیں ہوتے ۔ خانہ بدوشی کے سفر کے ایک ہی پڑاؤ میں فہم سے زیادہ مشقت جھیلنی پڑتی ہے۔کبھی پیہرسن کی کتاب ''سوشل آرگنائزیشن آف مری بلوچ'' کے صفحے تو پلٹ لیں۔

چراگاہ کے پیچھے پیچھے خاندان کے ساتھ سفرِ خانہ بدوشی کو بلوچی میں ''لڈو بوژ'' کہتے ہیں۔اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دور کہیں بارش ہوئی مگر اتنی زیادہ نہیں کہ پورے خاندان سمیت چار پانچ ماہ کے لیے وہاں شفٹ ہوا جائے ۔تب دو چار چھڑے چانک بغیر فیملی کے ریوڑ وہیں لے جاتے ہیں۔اپنی روٹی چائے خود پکاتے ہیں اور جونہی وہ پانی اور ڈھلی ہوئی جھاڑیاں اور گھاس ختم ہوجاتی ہے تو ریوڑ واپس لاتے ہیں۔عورتوں بچوں کے بغیر چراگاہ اور تازہ بارش کے نتیجے میں میٹھے پانی کے لیے ریوڑ لے جانے کی اِس عارضی مسافری کو کاشر (کاہ چر) کہتے ہیں۔

بہت زیادہ بھیڑیں رکھنے والے شخص کو''بھاگیا'' کہتے ہیں۔پیہرسن کے مطابق یہ ہندی لفظ''بھاگ'' سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے:''اِدھر اُدھر بھاگنا''، جہاں بارش ہوئی بھاگیا دوڑ کر وہاں پہنچا''۔(1) مگر میرے خیال میں اس کا دوسرا مطلب زیادہ درست ہے ۔سنسکرت لفظ گ سے مراد قسمت اور مقدر ہے۔یعنی بھاگیا: خوش قسمت۔سرپلس پیداوار پہ پلنے والے لوگ بھاگوان یعنی قسمت والے کہلائے۔ بھاگوان سے بھگوان کا لفظ بنا جس کا مطلب ہے سب سے بڑا قسمت والا اور دوسروں کی قسمتیں بنانے والا۔

اندازہ ہے کہ بلوچستان میں بڑے بڑے بھاگیاؤں کے پاس مویشیوں کی فی کس تعداد کی آخری حد پانچ ہزار ہے۔مویشی بانی سے وابستہ یہ لوگ خود بھی مالداری کرتے ہیں اور ایسا کرنے کے لیے چرواہے (پہوال) بھی رکھتے ہیں۔دونوں صورتوں میں گھر کے سارے افراد بھیڑوں کی خدمت میں جتے رہتے ہیں۔

پہوال

مویشی بانی کا مرکزی آدمی تو دراصل چرواہا ہوتا ہے۔وہ نہ صرف محنت کرتا ہے، نہ صرف اکثریت میں ہے بلکہ اگر وہ باہم قریب قریب ہوں اور اگر انھیں تنظیم میسر ہو تو وہ بلوچ ثقافت،

سیاست اور معیشت میں بنیادی تبدیلیوں کے عنصر سے بھرپور طبقہ ہو۔آیئے ذرا چرواہے کی زندگی کو تفصیل سے دیکھیں۔

پہوال (چرواہے) کی حالت بہت گری ہوئی ہوتی ہے۔اس لیے کہ اُسے نہ صرف معاوضہ بہت کم ملتا ہے بلکہ اُس کا کام (اوقات اور شرائط دونوں اعتبار سے) بہت دشوار و مشقت آمیز ہوتا ہے۔

ذرا اِس کی قسمیں بھی ملاحظہ ہوں:

دوسروں کے مویشی چرانے والے کو تو ''پہوال'' کہتے ہیں جب کہ اجرت پر دوسروں کی گائیں چرانے والے کو''گوآل'' کہتے ہیں۔اونٹ چرانے والا''جت'' یا''بگجت'' کہلاتا ہے۔ ''گلپان'' البتہ گھوڑے چرانے والے کو نہیں بلکہ سردار اور وڈیرہ کے گھوڑے کو زین پہنانے، گھوڑے کو بنانے سنوارنے اور سردار کے خدمت گار کے بطور اصطبل کے کام کرنے والوں کو کہتے ہیں۔

مویشی، گائے اونٹ اور گھوڑوں کا مالک''بھوتار'' ہوتا ہے۔

ایک غیر شہری اور خانہ بدوش حیاتی میں مرد و زن، حتیٰ کہ بچوں کے لیے بھی کوئی آرام و سکون میسر نہیں ہوتا۔کوئی''سبت'' کوئی گزیٹڈ چھٹی نہیں، کوئی''وقفہ برائے نماز'' نہیں۔کام کی نوعیت ایسی ہے کہ یہ ہمہ وقت ہنگامی صورتِ حال کا تقاضا کیے رہتا ہے۔

انسان کی محنت کرنے کی خصوصیت جبلی بھی ہے اور شعوری بھی۔ہمارے مالداری کرنے والے خانہ بدوش خاندان کے اندر کام، مقدار میں زیادہ اور مشقت میں شدید ہوتا ہے۔ مالداری سماج ایک کھردرا سماج ہوتا ہے۔اور یہ کھردرا پن سماج کی گستاخ حالت کا نتیجہ ہے۔آپ کی ٹائمنگ مقرر نہیں ہوتی۔ خانہ بدوش مالداری میں''ورکنگ آورز'' نہیں ہوتے۔آپ چوبیس گھنٹے ''آن ڈیوٹی'' ہوتے ہیں۔

چرواہی معیشت میں خاندان کی مشترکہ مشقت کے علاوہ کچھ کام مرد الگ کرتے ہیں، عورتیں الگ، اور بچے الگ۔البتہ ایک خصوصی بات یہ ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں عورت صرف اپنے

ریوڑ کی چرواہن ہوتی ہے۔وہ کرایہ، یا معاوضہ پر دوسروں کے ہاں ملازمت نہیں کرتی۔

ہماری مویشی بان عورت جب شام کو گھر لوٹتی ہے تو اُس کے برکت بھرے سری بند(پیٹھ) پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ سامان ضرور لدا ہوتا ہے۔اس کے ہاتھ میں پشم کاتنے والا ''دیخ'' ہوگا، یعنی وہ پشم کاتتی جاتی ہے۔ یا آٹا سٹور کرنے کے لئے دنبے کی کھال کو نرم بنانے کے لیے دن بھر مروڑنے کو ساتھ لیتی ہے۔علاوہ ازیں وہ ضرورت یا آمدن کی جڑی بوٹیاں اکٹھی کرتی رہتی ہے مثلاً ہینگ کے خوبصورت اور جاذبِ نظر پودے کا شیرہ نکالتی ہیں ۔یعنی عورت بہ یک وقت مویشی بھی چراتی ہے اور گھر کے لیے کوئی دوسرا کام بھی کرتی ہے۔رسی بُنتی جاتی ہے۔مویشی چَراتی جاتی ہے۔شام کو جب خیمے میں واپس آتی ہے تو میٹھے پانی کا مشک بھر کر لا چکی ہوتی ہے، دو تین رسے رسیاں بھی بُن کر لا چکی ہوتی ہے، پشم کی ایک ڈھیری کات چکی ہوتی ہے۔۔۔۔اور یوں وہ ہمارے کلچر کو بھی بقا اور ترقی دیتی رہتی ہے۔

اسی طرح مرد چرواہا جب واپس جب آتا ہے تو اس کے کندھے پر جلانے والی لکڑی کا موٹا اور بھاری تنا لدا ہوگا۔دو ایک دنبی نے دن کے وقت جو بچہ جنا ہوتا ہے، اُس نے وہ بھی اٹھائے ہوتے ہیں۔

ان دونوں چرواہوں کی ڈیوٹی محض طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے درمیانی وقت تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ بلا مبالغہ آدھی رات کو اٹھ جاتے ہیں اور دوسری رات گئے تک مسلسل کام کرتے رہتے ہیں۔یعنی بلوچ چرواہی معیشت کے بالغ مرد وزن روزانہ تقریباً 17 گھنٹہ کام کرتے ہیں۔

دوسری مصیبت یہ ہے کہ مویشی بانی کے یہ سارے کام مختلف نوعیّتوں والے نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی طرح کے بور کرنے والے بے کیف کام ہوتے ہیں!! مرد کے اکتا دینے والے کاموں کا تذکرہ تو ہم کر چکے۔اب دیکھیے ہماری محنت کش عورت کیا کیا عذاب جھیلتی ہے۔

''ڈش واشنگ'' کا غلیظ شیطانی چکر کبھی ختم نہیں ہوتا (گو کہ ہمارے برتن تعداد میں زیادہ نہیں ہوتے)۔اسی طرح ''درش و پش'' (آٹا پیسنا اور پکانا) بھی ایک جدی پشتی اور ہمہ وقتی اکتا دینے والا ابدی اور روزانہ کا کام ہوتا ہے۔

بلوچ عورت آدھی رات کو میٹھی نیند کی شادمانیوں سے محروم ہوکر چکی کا دستہ (دستغ) سنبھالتی ہے ' چلو بھر بھر کر خود ہی صاف کیا ہوا غلہ چکی کے ''گرغ'' میں ڈالتی اور ''تورک'' کی مدد سے ''شفشک'' (لوہے والی کیل) کے گرد گھومنے والے پتھر کے اوپر والے پاٹ (پڑ) کو گھمانے پہ اپنی ساری توانائی خرچ کرتی جاتی ہے۔دو ڈھائی گھنٹہ کے Monotonous اور پھیکی محنت، اتاہ تنہائی، تاریکی اور آنکھوں پہ لاکھوں من وزنی نیند کا بوجھ لیے اس بے کیف مشقت کے بعد خاندان کے لیے دو وقت کے آٹے کا بندوبست ہوجاتا ہے۔ یہ پسا ہوا آٹا ابھی تک کھانے کے قابل نہیں ہوتا بلکہ اسے چھاننی (گیشن) کے ذریعے چھاننا جانا لازمی ہوتا ہے اور اب باریک آٹا، پکانے کے لیے الگ کیا جاتا ہے۔چکی کا دستہ (دستغ) شروع شروع میں ہاتھوں میں چھالے ڈالتا تھا مگر بعد میں یہ دستغ ہاتھوں کو پکا کر دیتا ہے ۔اور ہاتھوں میں نال پیدا ہوتے ہیں اور نرم، مخروطی اور پتلی انگلیوں کا حسین تصور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجاتا ہے۔عورت کے ہاتھ کاک کی طرح سخت اور زمستان کی چٹانوں کی طرح سرد ہوجاتے۔

چکی صبح صادق تک پیسی جاتی ہے اور اس کے بعد کنبے کے لیے پینے کے پانی کا بندوبست کیا جاتا ہے۔پانی جو دور دراز سے مشکیزہ کے ذریعے لایا جاتا۔اسی دوران جھاڑ و اٹھا کر گھر کو صاف کرنا بھلایا نہیں جاتا (عورت صرف جھاڑو دیتی نہیں، وہ جھاڑو بناتی بھی خود ہے)۔''نشہ پتہ'' (چائے) پکانا بھی عورت کا کام ہوتا ہے۔امیر کا ''چاہ و بورا'' (شکر چائے) اور غریب کا ''ترخ و پیالہ'' گڑ والی چائے)۔دنیا بھر میں گیس اور بجلی نے آگ جلانے کی اشک آور مشقت ختم کردی لیکن بلوچ عورت کی اکثریت ابھی تک اسی مصیبت میں گرفتار ہے۔

گھر کے نئے پرانے بستر اٹھانے اور بچوں کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد گھر میں رکھے ہوئے پالتو جانوروں کی جانب بھی توجہ کرنا پڑتا ہے۔مرغیوں کا ڈربہ کھولنے کے بعد مویشی کو کھولنا باندھنا، گائے کا دوھنا، گدھے گھوڑے کا ''جُھل وٹپر'' کھولنا اور انھیں چارہ ڈالنے کے ضروری کام کرنے ۔دودھ کو دودھ کر، ''سنبھانڑ'' اور دہی بنانا، پھر دہی کو بلونا اور مکھن نکال کر حفاظت سے رکھنا بھی روزمرہ کے کام ہوا کرتے تھے۔اوپلے بنانا، مویشی کے لیلوں کو

سنبھالنے کے بعد کھانا پکانا۔ کھانا پکا کر گھر کے افراد کو کھلانا اور پھر بھاگ کر جانا پانی بھرنے کے لیے۔ لاغ، کھر، سربار، مشک و در بند، دم چیین وترنگڑ' نہانڑ و نیم مشک اور اشکیلغ نامی سارے کام کرنے ہیں۔

آیئے دیکھیں کہ پہوال کا طرزِ معاش، طریق وشرائطِ کار، اور اِس کی قسمیں کیا ہیں۔

(1) چیار کوئی پھوال

چیارک بلوچی میں چوتھائی کو کہتے ہیں۔ یعنی چیار کوئی والے معاہدے کے تحت بھوتار (مالک) اپنا مال چار سال کے لیے پہوال کو دیتا ہے۔ اس طرح کہ مویشی، مالک کے بجائے پہوال کے گھر میں ہوتے ہیں۔ اس لیے پہوال اکیلا کام نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر اُس کا سارا گھرانہ چار سال تک کُل وقتی طور پر مشقت کرتا ہے۔ پہوال چار سال تک یہ مال چراتا ہے اور جب یہ مدت پوری ہوتی ہے تو وہ بھوتار کے ساتھ مویشی بانٹ لیتا ہے۔ پہوال کا حصہ اس کے چَرانے والی ساری مادہ بھیڑ بکریوں پر چوتھائی ہے۔ نر البتہ (دنبہ یا بکرا) چار سال کے بجائے ہر سال تقسیم کیا جاتا ہے۔ بھیڑ کے نر بچوں میں پہوال کا حصہ ایک تہائی ہوتا ہے۔ جبکہ بکری کے نر بچوں میں اس کا حصہ نصف ہوتا ہے اور مادہ بھیڑ بکریاں جب چار سال بعد تقسیم ہوتی ہیں تو پہوال کو ایک چوتھائی حصہ مل جاتا ہے۔

بڑے جانوروں یعنی گائے بیلوں میں ''چیار کوئی'' کی صورت میں ''گوآل'' کو چار کے بجائے آٹھ سال تک یہ بیل گائے چَرانے پڑتے ہیں۔ تب وہ چوتھائی کا حق دار بن سکتا ہے۔ گائے کے نر بچے کو گوآل ایک سال تک اپنے ہل میں جوت سکتا ہے جس کے بعد بھوتار اُسے چیارک پہ تقسیم کرتا ہے۔ چوں کہ بڑے جانوروں کے مقابلے میں چھوٹے مویشی زیادہ رکھے جاتے ہیں اس لیے بڑے جانوروں کا ''چیار کوئی'' بھی زیادہ نہیں ہے۔

(2)۔ سیٹکوئی پھوال

پہوال اور بھوتار کے مابین معاہدے کی یہ صورت چھوٹے قسم کے مویشی میں بھی موجود ہوتی ہے، اور گائے اور اونٹنیوں میں بھی۔ یہاں بھوتار اپنے حیوان بہت مہنگے داموں پہوال

کو فروخت کرتا ہے۔ جانور خریدنے والا اگر اس تقریباً دگنی قیمت کا نصف ادا کرے تو وہ مویشی کے آدھے حصے کا حق دار بن جاتا ہے۔ اگر وہ مویشی سے پشم یا نر بچے کے فروخت کرنے سے قیمت کی رقم بھوتار کو دے دیتا ہے تو جس وقت وہ ساری رقم کی ادائیگی مکمل کر پائے تب وہ نصف حصہ کا حصہ دار بن جاتا ہے۔ یعنی پشم اور نر بچے پہوال کے ہیں۔ وہ انہیں بیچتا جاتا ہے اور پیسہ بھوتار کو دیتا جاتا ہے۔

(3) نیم غوئی پھوال

گھوڑے، گائیں اور مرغیاں' نیم غوئی (نصف نصف۔ نیم نیم) پر دی جاتی ہیں۔ مرغیوں کا معاملہ ذرا مختلف ہے مگر گھوڑے اور گائیں جب نیمغوئی پر دی جاتی ہیں تو اس میں گوآل قسطوں پر آدھی قیمت ادا کرتا ہے۔ وہ پہلے یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک مقررہ تعداد میں بچے دینے تک وہ مال تقسیم نہیں کریں گے۔ جس وقت آدھی قیمت کی ادائیگی مکمل ہو جائیگی، مال کو نر اور مادہ دونوں صورتوں میں آدھو آدھ کیا جاتا ہے۔

مرغی کا قانون یہ ہے کہ اصل مرغی مالک کی ہوتی ہے اور مرغی کی آل اولاد نصف نصف بانٹ دی جاتی ہے۔ لیکن پولٹری اتنی زیادہ پاپولر نہیں رہی ہے۔ اس لیے کہ بڑے پیمانے پر پولٹری خانہ بدوشی کی چیز ہی نہیں ہوتی۔

(4) کریھہ واری پھوال

(کرائے والا چرواہا)

الف۔ سالانہ کریہہ واری پہوال: یہاں پہوال کو پورے ایک سال تک مال چرانا ہوتا ہے اور معاہدہ کے مطابق اُسے ادائیگی مقررہ تعداد میں مویشی کے بچوں کی صورت میں کی جاتی ہے۔

ب۔ ماہانہ کریہہ واری پہوال: یہاں ہر ماہ نقدی کی صورت میں معاوضہ پہ مال چرانا ہوتا ہے۔ یہ معاوضہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ تنخواہ ضروریاتِ زندگی کی مہنگائی نہیں بلکہ چرواہوں کی بہتات یا کمی کے تناسب سے عموماً بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ ڈیمانڈ اینڈ سپلائی!!

ج۔ دروڑ کا پہوال: یہاں پہوال کو پورے سال تک مال چرانا ہوتا ہے۔ اُسے معاوضہ میں معمولی رقم بھی ملتی ہے، نیز سال کے بعد مویشی کے نر بچوں کا تیسرا حصہ بھی۔ اسی طرح وہ مادہ بچوں کا ستارہواں حصہ، پشم میں چھٹا حصہ، کپڑے کا ایک جوڑا، جوتے کا ایک جوڑا، سر پر لگانے کے لیے سرسوں کے تیل کی ایک بوتل، دووقت کی روٹی (زیادہ تر روکھی، اور وہ بھی عموماً سستے ترین اناج کی) پاتا ہے۔ اُسے ماہانہ تین دن کی چھٹی ملتی ہے۔

ایک بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مویشی کے چھوٹے بچوں کو انسان کا بچہ ہی چَرانے لے جاتا (یا لے جاتی) ہے۔ اگر دو یا تین ''مُہر'' (ریوڑ) ہوں تو عورت بھی مال چَراتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے ہاں پہوال مرد بھی ہوتے ہیں، عورت بھی اور نوعمر بچے بھی۔ مڈل کلاس کا ''متبرک'' اور ''پاک'' پردہ موجود نہیں ہے۔ برقع، جسمانی کام نہ کرنے والے ''بابوؤں'' کی بیگمات کے تواہمات ہیں، محنت کش انسانوں سے اس کا کیا تعلق ہے کہ وہاں تو کام ہی اتنا ہوتا ہے کہ ایسے چونچلوں کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

لائیوسٹاک میں ہماری محنت کرنے والی یا کاشتکاری سے وابستہ عورتوں کے عناصرِ ترکیبی شہر اور فیوڈل سماج کی عورتوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ نزاکت، کمزوری، ڈر، خوف، چھپکلی چوہے کو دیکھ کر چیخیں مارنا، پانی کا جگ اُٹھا کر کمر دوہری ہو جانا، موسموں کے شدائد اور جذبات کی گرمی میں پگھل پگھل جانا، عورت پر آئے سارے الزام بھلے رومانوی سہی لیکن کم از کم ستر فیصد عورتیں اِس کلیے کی یکسر نفی کرتی ہیں''۔(2)

****

پہوال تعداد کے لحاظ سے بلوچستان کا بہت بڑا طبقہ ہے۔ یہ نچلا طبقہ ہے، دکھوں میں لپٹا، بے دولت و بے زر، لٹا ہوا، اور استحصال شدہ طبقہ۔ اس طبقے کے ساتھ جو سب سے بڑی زیادتی کی گئی وہ یہ ہے کہ آج تک اس کا طبقاتی وجود تسلیم نہیں کیا گیا۔ ہوٹلوں، ہاسٹلوں اور سیکریٹریٹ میں براجمان ہمارے دانش ور، سیاسی لیڈر اور نظریہ دان ہمیشہ یہ واہمہ پھیلاتے رہے ہیں کہ بلوچستان ایک غیر طبقاتی معاشرہ ہے۔ مگر سامنے والا اگر اُن کے اس فقرے کو نہ مانتا تو وہ فوراً جھینپ کر اس

میں اس طرح ترمیم کرتے: ''بلوچستان میں طبقات 'واضح' نہیں ہیں''۔ (ہم کن کن میکاولیوں، سائیسر ووؤں اور چانڑکاؤں کی شیطانی چالوں بھری گُنگ راہ پہ چلتے رہے ہیں!!)۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بھیڑ پال اور فیوڈل معاشرے میں نہ صرف یہ کہ طبقات موجود تھے بلکہ پہوال اس طبقاتی سماج میں نچلاترین طبقہ رہا ہے۔ یعنی یہ طبقہ نچلے طبقے کا سب سے بڑا حصہ تشکیل کرتا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہوال ایک دوسرے سے بہت دور دور رہتے ہیں، انھیں کسی نے کوئی شعور نہیں دیا ہوتا، کسی نے ان کی سادگی کو علم کی روشنی عطا نہ کی۔ اور یہ ہمیشہ نقل مکانی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ سیاسی و تنظیمی طور پر سب سے غیر منظّم طبقہ ہے۔ اس کے اکٹھ کی اب تک کوئی صورت نہ بن سکی۔ اسے تواہمات میں رکھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس طبقہ میں کسی قسم کا منظّم طبقاتی شعور نہیں پہنچا۔

خواہ خود انہیں اپنے طبقے کے وجود اور اپنے مسائل کا شعور ہو یا نہیں، یا خواہ سیاست کار اور ان کے ہم زبان دانش ور انھیں نچلا، اور خود کو بالائی طبقہ تسلیم کرتے ہوں یا نہیں۔ اور خواہ وہ بطور نچلا طبقہ متحد و منظّم ہوں نہ ہوں اُن کی زندگی میں اِسی سماج میں رہتے ہوئے بھی بہت ساری آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ حتیٰ کہ فارمنگ کا نظام بنا کر اُن کی حالت کو بلند کیا جاسکتا ہے۔ گذشتہ کچھ سالوں میں زراعت میں معمولی سی ترقی ہوئی ہے۔ مگر پھر بھی مجموعی طور پر مویشی بانی معیشت میں بنیادی ذریعہ ہے۔ اور پہوال اس معیشت کا سب سے نچلا حصہ ہے۔

آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ پہوال صرف چھ گھنٹے ہی کام نہیں کرتا بلکہ وہ رات دن مشقت کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ سوتا بھی ریوڑ کے اندر ہے۔ اسے کسی قسم کے انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ اسے نہ تو ہل الاؤنس ملتا ہے اور نہ یونیفارم کے لیے رقم۔ وہ نہ تو ہڑتال کرسکتا ہے نہ اُسے روزگار کے تحفظ کی ضمانت حاصل ہے۔ وہ مالکن کے لیے ہر شام لکڑی کا گٹھا بھی جمع کر کے سر پر اٹھا کر لاتا ہے۔ درندوں سے، چوروں سے ریوڑ کی چوکیداری بھی کرتا ہے۔ (گوکہ شدہ مویشی کو ڈھونڈ نے بھی وہی جاتا ہے اور درندوں کی ''جبڑا بندی'' کا دَم بھی وہی کراتا ہے۔ مگر بھوکے یا پھر بدعادت انسان (چور) کے جبڑے کو کوئی بند نہیں کرسکتا۔ اُسی سے بھی مویشی کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔

پہوال کواپنے بھوتار کے مہمان کی خدمت بھی کرنا ہوتی ہے۔

اسے کوئی گزیٹڈ چھٹی نہیں ملتی۔اس کا کوئی اجلاس اپنے دوسرے پہوال ساتھیوں سے نہیں ہوسکتا۔اس کے لیے نہ عید ہے نہ بڑا دن۔

پہوال کے یارِ غار دو ہوتے ہیں: اس کا مددگار کتا اور ریوڑ میں سے اس کی سب سے پیاری بھیڑ جسے وہ ''سربز'' کہتا ہے۔

پہوالوں کے پاس جانا اور اِن دور دور بسیرا کرنے والے پہوالوں کو منظّم کرنا کتنا مشکل مگر کتنا اہم کام ہے!۔

حوالہ جات

1۔ Balochistan. Conflicts and Players 2009.Pak Institute for Peace Studies Islamabad۔صفحہ 26

2۔ طاہرہ اقبال۔دیہی عورت اور ہڑپہ کی قدیم تہذیب۔۔ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔اکتوبر 2011۔صفحہ 48۔

تیسرا چیپٹر

اون اور منڈی کا پھندا

بھیڑوں کا پشم سال میں دو بار اتارا جاتا ہے۔دنبے کے پورے جسم کی اس حجامت کو ''چین'' (Chain) کہتے ہیں۔یہ موقع بالکل ویسا ہی ہوتا ہے جیسے کہ کاشتکار کے فصل اٹھانے کا ہوتا ہے اس لیے یہ قرض خواہوں، شادی بیاہ کے اخراجات کرنے، اور دیگر لین دین کرنے کا موسم ہوتا ہے۔بالکل اسی طرح جیسے کہ کسان اپنی ضروریاتِ زندگی فصل اٹھاتے وقت پوری کرتا ہے۔

چین سے قبل مویشی کو دھو کر صاف کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ جب پشم اتاری جائے تو یہ صاف اور اجلی ہو۔مویشی کے ریوڑ کے اِس اجتماعی غسل کو ''دھوپ'' (Dhop) کہتے ہیں۔

ایسا ہوتا ہے کہ دھوپ کے موقع پر مالک یعنی بھوتار کے نزدیکی عزیز اقارب اور کام کرنے والے توانا جوان اکٹھے ہو جاتے ہیں اور نزدیک ترین جھیل پر چلے جاتے ہیں۔

مویشی دھونے یعنی ''دھوپ'' کا دن پہلے سے مقرر کیا جاتا ہے اور دھوپی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں دن فلاں کے مویشیوں کے ریوڑ کا ''دھوپ'' فلاں جگہ پر ہوگا۔دھوپ کے دن گوشت خوری (گوژدواری) بھی کی جاتی ہے۔(ایک یا دو دنبے، دھلنے والی مویشی کی تعداد کے مطابق کاٹے جاتے ہیں)۔آدمی لانگ باندھتے ہیں اور بھیڑ کو بازوؤں پر اٹھاتے ہیں اور جھیل کے پانی میں ڈبکی لگواتے ہیں۔

بھیڑ کو بہت زیادہ دھونا نہیں پڑتا۔محض ہاتھ پھیرنے سے پشم جھاگ بن جاتی ہے اور یہ

پشم خود بخود فوراً اجلی ہو جاتی ہے۔

اِس دوران ایک دو آدمی کھانے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ رواج یہ ہے کہ کوئی مسافر، اور راہ گیر گزرتے ہوئے اگر گوشت خوری کرنا چاہے تو وہ یہ حق رکھتا ہے کہ بغیر اجازت لیے ایک بھیڑ کو اٹھائے اور جھیل میں ڈبکی دے کر دھو ڈالے۔ اس طرح وہ کھانے کی برابر مقدار کا شریک تصور ہوگا۔ اگر کوئی راہگیر کھانے کا خواہشمند نہ ہو، یا تکلف سے کام لے مگر بھوتار قسم کھا کر اُسے کھانے پر مجبور کرے تب بھی اُسے رواجاً ایک بھیڑ پکڑ کر دھونا ہوگا (خواہ یہ بھیڑ ابھی ابھی دھوئی گئی کیوں نہ ہو) تبھی وہ خوبصورتی سے حق کے بطور روہاں کھانا کھا سکے گا۔

پشم اتارنے یعنی "چین" کا دن اس لیے بھی پہلے سے مقرر کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ علاقے میں بھیڑوں کے پشم اتارنے والے ماہر "لاوا" تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں جبکہ موسم کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے لاوا سے پہلے ہی ٹائم لینا پڑتا ہے۔ لاوا عموماً دو یا تین آدمی ہوتے ہیں جن کے پاس قینچی کی طرح کے تیز بہت لمبے ہتھیار ہوتے ہیں۔ اس قینچی نما اوزار کو "ہرل" (Harrul) کہتے ہیں۔ چٹائی پر بھیڑ کے چاروں پاؤں باندھ کر اسے لٹایا جاتا ہے اور کام شروع۔ ماہر اور اچھا "لاوا" کام تیز بھی کرتا ہے اور پشم بھی بڑی خوبصورتی سے اتارتا ہے۔ خاص کر وہ پہوال کی محبوب بھیڑ کی پشت پر تو بہت خوبصورت چوٹی بناتے ہیں۔

"لاوا" ٹیم کی خدمت زبردست طور پر کرنا پڑتی ہے وگرنہ ایک تو وہ سارے علاقے میں مالک کی کنجوسی کی شکایت کرتے پھریں گے اور دوسرا اس لیے بھی کہ اگر اچھی خدمت نہ کی تو وہ دنبے کی پشم یوں اتارے گا جس طرح اُسے چیچک لگا ہو۔ "لاوا" بلڈوزر کے ڈرائیور کی طرح مرغی کھلانے کا ایک الگ گیئر چلاتا ہے اور آلو کھلانے پر اس کا گیئر دوسرا ہوتا ہے۔

بھیڑ بے چاری جب ہرل کے نیچے آتی ہے تو وہ مسکین اتنی کنفیوز ہو جاتی ہے جیسے چھوٹے بچے کو سکول لے جایا جائے۔ اور جب پشم اتر جائے اور جب اُس کے پاؤں کھول دیے جاتے ہیں تو وہ بھاگ کر اس خوارستانی سے خود کو دور کرتی ہے، ننگی ننگی، بدصورت بدصورت، بدلی بدلی سی۔ وہ بہت دیر تک اپنے پشم کی غیر حاضری اور اس تبدیلی کے بارے میں کنفیوز کنفیوز، شرمیلی

شرمیلی اور پریشان پریشان گھومتی ہے۔

"لاوا" کے قریب ایک دو دوسرے ماہر افراد بیٹھتے ہیں۔ وہ اتارے گئے پشم کو گول گول دائرہ نما شکل میں باندھتے جاتے ہیں جسے "گوڑی" کہتے ہیں۔ وہ یوں کہ، ایک بھیڑ سے اتارے گئے پشم کو لمبائی میں بچھا دیا جاتا ہے۔ پھر اس کے اوپر پیش کے ایک دو سبز پتے لمبائی میں بچھاتے ہیں۔ پھر اس لمبائی میں رکھے گئے پشم کو تہہ کرتے ہیں اور بڑی مہارت سے اس طرح بل دیتے ہیں کہ پیش کے پتے نظر نہ آئیں۔ انہیں پھر پگڑی کی طرح لپیٹ کر اُس کا سرا اسی میں اڑس دیتے ہیں۔ اس طرح گوڑی بن جاتی ہے۔ پیش کا پتہ پشم کو اکٹھا رکھنے اور مضبوطی سے گوڑی کی شکیل دینے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

بہر حال دھوپ اور چین لوازمات اور روایات سے بھرے ہوئے ہیں جنھیں بہت عرصے تک پورا کرتے رہنا بہر صورت ضروری ہے۔ سرکار ہمت کرے یا پھر کوئی سرمایہ دار اپنے سینے پر ہاتھ مار کر چین کے لیے ایک کارخانہ لگا دے تو نہ ضرورت پڑے لاوا کی، نہ گوڑی بنانے کی، اور نہ وقت کے ضیاع کی۔

پشم کا سودا عموماً لوگ پہلے سے طے کر بیٹھتے ہیں۔ جس طرح فروٹ کے باغات کی فصل کا سودا ٹھیکیدار پہلے جا کر لگا آتے ہیں، اسی طرح مویشی کے پشم کا سودا بھی بہت پہلے سے لگایا جاتا ہے۔ پشم کے سوداگر یا تو مقامی ہوتے ہیں یا پھر ڈیرہ غازی خان ملتان اور دیگر قریبی شہروں کے تاجر ہوتے ہیں۔ مقامی سوداگر "گوڑی" کے حساب سے پشم خریدتے ہیں نہ کہ تول کے حساب سے۔ قیمت عموماً نقد نہیں ملتی بلکہ دکان کے سامان کی صورت میں دی جاتی ہے جس میں دکاندار کی عیاشی ہوتی ہے۔ وہ پشم لیتا سستا ہے اور اپنا سودا سلف مہنگا بیچتا ہے۔ بلوچ شہری مخلوق تو ہے نہیں، وہ شہر جانے اور وہاں اپنے پشم کو اچھے نرخ پر بیچنے سے ہچکچاتا ہے۔ لہٰذا وہیں مقامی لوگوں کے ہاتھ بیچ کر اپنی جان چھڑاتا ہے۔ دکاندار فضول چیزوں سے اُسے لاد کر روانہ کر دیتا ہے۔ دکاندار بعد میں آٹھ دس خالی بوریوں کو کھول کر دوبارہ جوڑ کر ایک بہت بڑا بورا بنا لیتے ہیں۔ اُسے "انڈا" کہتے ہیں۔ اِن بڑے انڈوں میں پشم ڈال کر ٹریکٹر یا ٹرک میں ڈال کر بڑے شہر لے جاتا ہے۔ جہاں

کیپٹل ازم والی منڈی پہلے ہی سے دانت تیز کیے اُس کے انتظار میں ہوتی ہے۔ وہاں پشم، من کے حساب سے پشم فروخت ہوتی ہے۔

پہوال سے لے کر بھوتار تک اور پھر مقامی سوداگر تک کسی کو بھی معلوم نہیں کہ یہ پشم بالآخر جاتی کہاں ہے۔ مارکیٹ میں اُس کے ریٹ کون سی قوتیں مقرر کرتی ہیں۔ بڑے سوداگر کو کتنا منافع ہوتا ہے اور اس کی پشم کا آخری استعمال کیا ہے؟۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس ارزاں فروخت کردہ پشم سے بے شمار چیزیں کارخانوں میں بنتی ہیں اور پھر دوبارہ خود انہی پر (یا ان کی طرح کے لوگوں پر) مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔

چوتھا چیپٹر

جلو اور سات

Jalav & Saath

نقدی، پیسہ، روکڑ، یا کرنسی بہت ساری مصیبتوں کو دور کرنے والی جادوگرنی ہے۔ اس کا وزن، حلیہ، جُثہ اور ڈیل ڈول تو اتنا نہیں ہوتا مگر اس کا اختیار بہت زیادہ ہے۔ اس کے حصول کے لیے یار یاروں سے بے وفائیاں کرتے ہیں، آدم زاد آدم زاد کو قتل کرتے ہیں، مما لک دوسرے ملکوں پہ قبضے کرتے ہیں۔ اور اب تو یہ سارا قتل قتال، جنگ اور قبضہ وغیرہ کیے بغیر صرف سٹیٹ بنک اور وزارتِ خزانہ کو کنٹرول کرنے سے عالمی کپٹلزم اپنی تجوریاں بھرتا جاتا ہے۔ اور غریب اور محتاج ملکوں کے حکمران اپنے عوام پہ ٹیکسوں کے بوجھ لا دلا د کر آئی ایم ایف کے مما لک کو اربوں کھربوں کے حساب سے پیسہ بھیجتے ہیں۔ پیسہ چلے تو لوگ کام دھندا چھوڑ کر ارمان سے اُسے تکتے ہیں، اگر کم ہو تو اُسے زیادہ کرنے کی تگ ودو میں ہوتے ہیں۔ اگر زیادہ ہو تو مزید زیادہ کرنے کا جنون سوار ہوتا ہے۔ ہزار پتی۔۔۔ لکھ پتی۔۔۔ کروڑ پتی۔۔۔ ارب پتی۔۔۔ گورکی کے بقول ''ارب پتی بننا بذاتِ خود ایک نشہ ہے''۔

پیسہ.......... جب بولتا ہے تو لوگ سنتے ہیں۔

معاشرہ میں کرنسی یا پیسہ کے گھس آنے سے پہلے لوگ اپنی ضرورت سے اضافی کماڈٹی

دے کر اپنی ضرورت کی چیزیں لے لیتے تھے۔ مثلاً ایک بھیڑ دے کر ایک بوری گندم، ایک لیلا کے بدلے کپڑے کا جوڑا یا ایک مزدور سارا سال کام کر کے آٹھ بھیڑیں لے لیتا تھا۔ پھر سونے کا سکّہ بنا۔ اُس کے بعد کاغذ کا نوٹ۔ اسی نوٹ سے اشیا کی قدر ناپی تولی جاتی ہے۔ یہی نوٹ اب اشیا کے تبادلے کا ذریعہ ہے۔ اسی نوٹ کی شکل میں اشیا کا ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ اسی نوٹ سے ادائیگیاں کی جاتی ہیں۔

پیسہ ایجاد ہونے کے بعد چیزوں کے تبادلے کے بجائے ان کی قیمت مقرر ہونے لگی۔ اور یوں پیسہ پہ اپنی چیزیں فروخت کرنے اور ضرورت کی چیزیں خریدنے کا رواج ہوا۔ اس طرح پیسہ اور سرمایہ اکٹھا کرنے، زیادہ کرنے اور مزید زیادہ کرنے کی طرف ساری توجہ مبذول ہوگئی۔ اس نے دنیا کے اندر ایک نیا تماشا پیدا کر دیا، جسے کپٹلزم کہتے ہیں۔ لیکن ہم ابھی تک مکمل طور پر اپنے پرانے معاش سے نکل نہ سکے اور مکمل طور پر اس نئی پیچیدگی میں داخل نہ ہو سکے۔ ہم سرمایہ داری کی عمومی عالمی فضا میں سانس بھی لے رہے ہیں اور فیوڈل باقیات کو بھی گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ شہر جو سرمایہ داری کے ارتقا کا ممتاز مظہر، نتیجہ اور سبب ہوتے ہیں، بہت عرصے تک ہم نے انھیں اپنے لیے ممنوعہ علاقے قرار دیے رکھا۔ ہم شہروں، سرمایہ اور سرمایہ داری سے بہت دور پہاڑوں میں مویشی بانی کرتے رہے ہیں۔ جب ہمارا راشن آٹا ختم ہو جاتا، اور تن کا لباس بہت خستہ ہو جاتا تو ایک آدھ بکری سینگوں سے پکڑ کر منڈی میں جا کر بیچتے اور اُس نقدی سے کپڑا لتا اور دیگر ضرورت کی چیزیں خرید کر تیزی سے واپس اپنے سماج میں جاتے۔

مویشی کو منڈی (پڑی) لے جانے کے لیے آس پاس کے پڑوسیوں کو اطلاع کی جاتی اور گروہ کی صورت میں ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق ایک ایک، دو دو بھیڑ بکری ساتھ لیتا۔ اور یہ گروپ پڑی (منڈی) کی طرف رواں ہو جاتا۔ منڈی جس قریبی شہر میں ہوتی وہ کم از کم تیس چالیس میل دور ہوتا تھا۔ یہ لوگ اپنے موٹے تازے مال کے ساتھ پیدل تین چار دن لگا کر بالآخر اپنی منزل تک پہنچتے۔ اس کارواں کو ’’جلوٗ‘‘ (Jalav) کہا جاتا تھا اور کارواں میں شامل لوگوں کو ’’جلوی‘‘۔

جلو اور سات کے کارواں کے لوگ راستے میں جہاں رات پڑتی لکڑیاں جلا کر دہکتے کوئلہ کے گرد ’’کاک‘‘ پکاتے۔ ہوتا یوں تھا کہ گول پتھر، مُشت پُری سائز (جو مٹھی میں آجائے) کو آگ میں ڈال کر خوب گرم کیا جاتا تھا۔ سخت اور گاڑھے انداز میں گوندھے ہوئے آٹے کو بہت موٹی روٹی کی طرح چپٹا کیا جاتا۔ اُس گرم پتھر کو اُس آٹے پر رکھا جاتا اور وہ آٹا اس کے گرد یوں لپیٹا جاتا کہ سوراخ تک نہ رہے۔ اب اس گول چیز کو دھکتے کوئلوں کے پاس رکھا جاتا۔ اندر سے گرم پتھر اور باہر سے کوئلوں کی تپش اسے پکا دیتی۔

کاک کی تاریخ محض ایک آدھ ہزار سال کی نہیں ہے۔ یہ تو گیارہ ہزار قبل مہرگڑھ میں بھی دریافت ہوا ہے۔

جلوی کاک پکاتے ہوئے، مویشی چراتے ہوئے، اُن کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے کم کم مسافت طے کرتے ہوئے، مویشی کو ہانکتے، قصے کہانیاں سناتے ہوئے، گیت اور ڈیہی گاتے ہوئے جب پڑی پہنچ جاتے تو پھر۔۔۔ ہٹی رب دے حوالے۔

سوداگر نہ تو مانتا ہے پیر فقیر کو، نہ دم درود کو، نہ ہی قسم قرآن کو۔ وہ تو ڈیمانڈ کا، سپلائی کا، منافع کا بیٹا ہوتا ہے۔ اگر مویشی منڈی میں بہت زیادہ آئے تو قیمت کم ہو جاتی ہے اور اگر مال کم ہے تو قیمت میں کچھ اضافہ ملتا ہے۔ مصنوعی کمی بیشی تو بہر حال سرمایہ داری نظام کا امرت دھارا ہوتی ہے۔

مویشی فروخت ہونے کے بعد گھر کی ضرورت والی اشیا کی شاپنگ شروع ہو جاتی۔ کھانے کے لیے غلہ خریدنا ہوتا جسے گھر والی نے ادھ راتوں کو اپنی نیند تلخ کر کے صبحوں تک پیسنا ہو گا۔ آٹا اس لیے نہیں خریدا جاتا کہ اونٹ پر دو دن دورات کے سفر میں آٹا تو سارا تھیلوں سے نکل نکل کر بے برکت اور کم ہو جاتا ہے۔

غربت اتنی ہوئی تھی کہ غلہ ایک زمانے میں جوار اور باجرہ ہوتا تھا مگر اب کچھ دہائیوں سے لوگ عموماً گندم کھاتے ہیں۔ اور گندم کی روٹی تو خود سالن ہوتی ہے، اللہ کی رحمت ہوتی ہے، نور ہوتی ہے۔ لہٰذا سالن وغیرہ کا رواج کچھ زیادہ نہیں تھا۔ دودھ دہی ہوتا تو ٹھیک ورنہ گندم کی

روکھی روٹی خود نعمت خداوندی تھی۔

چینی، پتی خریدنا البتہ ضروری تھا۔ مہمان، مسافر، بیماری، بارش، سردی...... پھر عادی ''چائے نوش'' کی تسکین کے لیے چائے پکانا ہر خیمہ، ہر گھر کا عمومی خاصہ بن کر رہ گیا تھا۔ تھکاوٹ دور کرنے یا پُر کیف پسینہ بخش نشہ کرنے کے لیے گڑ منہ میں ڈال کر چائے کی چسکیاں لی جاتیں جسے ''ترخ'' کہا جاتا تھا۔ جبکہ فضول خرچی یا شوشا اور یا پھر، بیمار، یا مہمان کے لیے چینی والی چائے پیش کی جاتی۔ مختصر یہ کہ کھانے سے زیادہ خرچ آج بھی چائے پر اٹھتا ہے۔

سگریٹ نوشی بھی بڑھتی جارہی تھی حالانکہ:

حقه و چلم پوڑانی
درمانه نواں دورانی
هشکیں شوشغ ایں جوڑانی

ترجمہ:

حقہ اور چلم
کسی درد کا درمان نہیں ہیں
یہ تو محض ہونٹ جلانے کا سامان ہیں

مگر یہ سٹیٹس سمبل جیسی بات بھی تھی۔ تقریباً جو بھی شخص علاقے سے باہر گیا اور کوئی شہر قصبہ دیکھ آیا، وہ سگریٹ سے ضرور آشنا ہو گیا۔ (سولائزیشن کی پہلی نشانی کس قدر بدصورت ہوتی ہے!!)۔ اب چلم، پوڑ، تمباکو کی تھیلی، اور، لوہے اور پتھر کی رگڑ سے چنگاری پیدا کرنے والا سامان'' پڑزا اور آژگیژ'' غائب ہوتے جارہے ہیں۔

جلوی لوگ گھر کے افراد کے لیے جوتے خریدتے۔ کپڑا، پوشاک تو ایسی چیز ہے جو ستر ڈھانپنے اور موسمی اثرات سے دفاع کے لیے لازم ہوتی ہے۔ اس لیے یہ مرد اور عورت دونوں کے لیے خریدے جاتے۔ ہاں شونک (شوق) کی بات البتہ اور تھی۔ کبھی کبھی نوجوان بہت احتیاط اور قرینے سے دل کے حُب میں ایک انگوٹھی یا مصری کا ٹکڑا ایک ''منتظر دل'' کے لیے خرید لیتا، اُسے

کئی پوشوں میں ڈال کر جیب میں ڈال دیتا۔

ارزاں قیمت پر اگر کوئی نڑمل جاتا تو وہ اپنے یا اپنے ناڑی ساتھی کے لیے ضرور خرید لیتا۔ بندوق کے لیے کمر بند خریدنا تو ایسا جرمانہ تھا جو بہرحال بھرنا پڑتا تھا۔

یوں ایک دو دن غلیظ شہر کی سالن خوری سے پیٹ کا جہنم بھرنا پڑتا تھا۔ پھر اپنے گراں بہا، گراں مایہ، تعیش اور ضرورت کی ساری چیزوں کے ساتھ فلک بوس پہاڑوں اور دشوار گزار دروں کی طرف واپسی کا سفر۔

غلہ خریدنے کے لیے جانے والے لوگوں کے قافلے کو جلو نہیں کہتے بلکہ ''سات'' کہتے تھے اور قافلے میں شامل لوگوں کو ''ساتی''۔ بالخصوص اگر اُس قافلے میں غلہ شامل ہوتا۔ اور ان ساتیوں کے اندر بہرحال ایک جوان تو ضرور ہوتا جس کی جیب میں ''کسی'' کو ساتی (زیور پوش) بنانے کے لیے ایک انگوٹھی ہوتی۔

جی بلوچیئے کارواں۔

جانوروں کا قتلِ عام

بلوچ کے مویشی ہمیشہ چھری کے نیچے ہوتے ہیں ۔صرف بلوچ ہی نہیں بلکہ چھری اور مویشی کا ساتھ شاید مالداری کے اولین دن سے شروع ہوا ہوگا۔ اور یہ ساتھ شاید ابد تک چلے گا۔ بیماری یا حادثہ سے مرنے والی بھیڑ پر چھری پھیرنا تو خیر مجبوری ہے کہ دوسرا کوئی چارہ نہیں مگر دوسرے مواقع پر بھی چھری عموماً اُن کے گلے پہ بے نیام رہتی ہے۔

قبیلوی رواج کے تحت نرینہ اولاد کی پیدائش یعنی ''بیشن'' کے موقع پر مویشی ذبح کرنا پڑتا ہے۔اُس کے بعد جب وہ بچہ تھوڑا بڑا ہوجاتا ہے تو اس بچے پر نام رکھنے (شغان) کے وقت جشن بپا جاتا ہے ۔ یہ جشن تو مویشی کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے ۔غریب سے غریب آدمی بھی دس بارہ دنبوں کے سر کی قیمت پہ یہ خوشی مناتا ہے ۔ آس پاس پہاڑوں کے سارے لوگ اس جشن میں شرکت کرتے ہیں۔

پھر اسی بچے کا ختنہ کرنا ہوتا ہے ۔اس میں بھی شغان جتنا جشن ہوتا ہے۔ پھر بچے اُس کی منگنی کا وقت آجاتا ہے تو ایک بار پھر گوشت خوری ہوتی ہے ۔مگر یہ جشن نسبتاً محدود اور چھوٹا ہوتا ہے۔

ہاں شادی انسان کی زندگی میں سب سے بڑا جشن ہوتا ہے۔ بالائی متوسط طبقے میں تو اس جشن میں سو،سو دنبے تک ذبح کیے جاتے ہیں۔

موت پہ خیرات میں مویشی کے ساتھ کیا ہوتا ہوگا، تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ یہی حال برسی کا ہوتا ہے۔

مہمان اور مہمانداری قبائلی زندگی کی ضرورت بھی ہے اور خوبی بھی ۔ضروری اِس لیے کہ قبائلی معاشرے میں ہوٹل اور سرائے تو نہیں ہوتے ۔لہذا ہر خیمہ اور گھر مسافر کے لیے ایک ٹائم کے کھانے کے لیے حاضر ہوتا ہے ۔ بیابان میں کسی آدم زاد سے ملنا تو ویسے ہی ایک خوش بختی ہوتی ہے ۔مگر بلوچ کے علاقے میں مہمان سیاسی ، سماجی ، معاشی ، تجارتی ،نشانہ بازی ،اور گھر دوڑ کی خبریں تفصیل سے لاتا ہے اور میزبان کی پوری برادری کو باخبر کر دیتا ہے ۔ حال شریکی کے علاوہ کبھی کبھی ناڑی سُری مل جاتے ہیں تو سارے گھرانے کے نرینہ افراد کی روح کو غذا میسر ہوجاتی ہے ۔ تاریخ دان مہمان ، رند و لاشار کی جنگ ،مست و سمو کی محبت اور انگریز کے خلاف جہدِ آزادی کے قصے بیان کرتے ہیں ۔ یوں واقعتاً مہمان خدا کی ایک نعمت ہوتا ہے۔

میزبان اپنے مہمان کی سماجی حیثیت اور اُن کی تعداد کے حساب سے کاٹنے کے لیے ایک یا زیادہ مویشی اُن کے سامنے لاتا ہے ۔ جاندار میزبان، مویشی لاتے ہی طلاق کہہ دیتا ہے اور مہمان سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی درخواست کرتا ہے، تاکہ پس و پیش کی نوبت ہی نہ رہے ۔اگر وہ طلاق نہ کہے تو مہمان کے مویشی کاٹنے یا انکار کرنے کے لیے گویا ''مذاکرات کی گنجائش'' چھوڑ دیتا ہے ۔ دوسری طرف مہمان یا تو طلاق کہہ کر مویشی کاٹنے سے منع کرتا ہے ، یا طلاق کہہ کر کٹ جانے والے مویشی کی تعداد کو کم کرتا ہے وگرنہ زبانی جمع خرچ کے بطور مویشی کاٹنے کا خرچہ ''نہ'' کرنے کا فقرہ بول دیتا ہے ۔ کچھ گوشت خور مہمان تو فوری طور پر دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

بہر حال مہمانداری کی مد میں مویشی کی ایک اچھی خاصی تعداد قربان ہوتی ہے ۔ مہمان کو البتہ ایک تکلیف کرنا پڑتی ہے کہ اُس نے دنبہ خود ذبح کرنا ہوتا ہے اور گوشت خود ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہوتا ہے ۔ لکڑی خود چُن کر لانا پڑتی ہے اور رواج کے مطابق سجی بھی خود پکانا پڑتی ہے ۔ ۔ ۔تاکہ میزبان کے کام کو شیئر کیا جاسکے۔

مہمان میزبان کو کھانے میں شریک کرتا ہے ۔ دوسرے کچھ نرینہ افراد بھی مہمان کے

ساتھ بیٹھ کر کھا لیتے ہیں۔ وگرنہ گھر کے عام افراد مہمان کو کھانا کھلا کر گھر جا کر خود کھانا کھا لیتے ہیں۔

اسی طرح سماج میں بڑے دن آتے رہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کوہستانی علاقے میں زردہ پلاؤ نہیں ہوتا تھا۔ تب چُھری کو تیز کرنے والے پتھر پہ رگڑا اور کھینچ لائے ایک دنبہ۔ بڑے دن، دونوں عیدوں والے دن ہیں، سال میں دو پیشیندغ ہیں، دھاگ کا دن ہے، ہزاری اور خدائی ہیں، اسی طرح رسول کی پندرھویں ہے، جہاں پر کہ مال خیرات کیا جاتا ہے۔

مَنت اور نذرانہ مال کُشی کا ایک اور موقع ہوتا ہے۔ ''پیر صاحب! میرے ریوڑ کا فلاں مویشی تمہارے نام پہ خیرات ہے اگر میرا فلاں کام ہو جائے......''

مویشی بلا دُور کرنے والا میزائل بھی ہوتا ہے۔ اگر کوئی برا خواب دیکھا تو سویرے ڈھیر کر دو ایک بکری، خیر ہو جائے گی۔ کوئی بیمار ہو تو ایک دنبہ ذبح کر دو، دکھ آسان ہو جائے گا۔ گہانچ نامی پرندہ بائیں جانب بیٹھا بول رہا ہو تو ایک بکری ذبح کر دو، یہ براشگون نیوٹرل ہو جائے گا۔ کوئی جن وغیرہ تنگ کرے تو مویشی کا خون بہا دو، جن بھاگ جائے گا۔ کافرا سپرین اور ٹیٹرا سائیکلین اگر کام خراب نہ کرتے تو جسم کے درد اور نمونیا جیسی بیماریوں کا علاج مویشی کا چمڑا چڑھانے سے ہو جایا کرتا تھا۔ مویشی ذبح کرو اور اس کی کھال مریض کو پہنا دو، شفا کا دیوتا بچانے آن پہنچے گا۔ ایک کھال سے گزارہ نہ ہو تو دوسرا، ورنہ اگلے دن پھر ایک۔ ایک کھال صبح چڑھا دو، ایک شام۔ یہ ڈوز ہوتا ہے۔ میں نے بیس بیس کھال چڑھانے کا بھی سنا ہے۔ ایک مویشی اگر کم از کم دس ہزار روپے قیمت کا ہو تو بیس کھالیں پہنانے پر دو لاکھ روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ یہ بہت گراں بہا علاج ہے۔ اب بلوچ بہت کم رفتاری کے ساتھ دس پندرہ روپے کی انٹی بائیوٹکس پر جانے کا سوچ رہا ہے۔

مریض کے لیے کھال استعمال کیے جانے والے مویشی کا گوشت بے ذائقہ اور بے مزہ ہوتا ہے۔ کئی لوگ یہ گوشت کھاتے ہی نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ اگر بے خبری سے کھانا پڑے بھی تو وہ پہلے ہی نوالے میں بتا دیتے ہیں کہ اس مویشی کی کھال مریض کو چڑھائی گئی ہے۔ ایسے لوگ اگر یہ گوشت کھا بھی لیں تو بیمار ہو جائیں گے۔ الٹی کر کے اُسے نکال دیتے ہیں۔ اس کا سائنسی سبب معلوم نہیں کیا ہو گا، بہر حال یہ مظہر موجود ہے۔

بیمار مویشی کو ذبح کرنا ویسے ہی ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح درندے کے حملے کے نتیجے میں زخمی کردہ بھیڑ کو کون حرام ہونے دیتا ہے؟ اس کے علاوہ مویشیوں کی بیماریاں اتنی زیادہ ہیں کہ ہماری چُھری کو کند ہونے دیتی ہی نہیں ہیں۔ مثلاً مویشیوں کا چیچک، اسہال، بینزارو، چرواہے کا پتھر لگ جانا، مویشی کا پہاڑ سے پھسل کر گرنا وغیرہ۔

دلچسپ ہے کہ بلوچی میں ذبح کرنے کا الگ لفظ موجود نہیں ہے۔ ہماری ساری کلاسیکل اور فوک شاعری میں لفظ ''حلال'' بھی استعمال نہیں ہوا۔ ایک ہی لفظ: کُشتہ۔ کاٹ دینا، مار دینا۔ فارسی میں بھی ایسا ہے۔ میں یہاں بھی کاٹ دینا ہی استعمال کروں گا۔

اچھا، ایسا تو فارسی میں بھی ہے۔ رومی کو دیکھیے:

در مِسلخِ عشق جز نکورانه کُشند
روبه صفتان زشت خُو رانه کُشند
گر عاشقِ صادقی زکُشتن مه گریز
مردار بود هر آنکه اورانه کُشند

بلوچ، گوشت خوری بہت کرتا ہے۔ پہاڑ اور درّوں کے اندر پکوان و سالن بنانے کی بڑی سہولتیں موجود نہیں تھیں۔ خانہ بدوشی میں زیادہ برتنوں کا رواج نہیں ہوتا۔ بس ضرورت کا ایک آدھ برتن ساتھ رہتا ہے۔ اس لیے گوشت کو زیادہ تر ننگی آگ پر ہی پکاتے تھے۔ جسے سجی کہتے ہیں۔ کبھی کبھی گوشت کو ابالا جاتا ہے، مٹی کے دیگ (دیز) میں۔

ہر کام قاعدے قانون کے مطابق

مویشی کو ذبح کرنے سے پہلے اُسے لازماً پانی پلانا ہوتا ہے، اُس کا سر شمال کی جانب رکھ کر قبلہ رُو لٹا کر اسے ذبح کرنا ہوتا ہے، اس کے ٹھنڈا ہونے کے انتظار کے بعد اُس کی کھال اتارنا، رواج کے عین مطابق، اُس کے گوشت کے ٹکڑے بنانے ہوتے ہیں، سب کچھ قاعدے قانون کے مطابق۔ مال ذبح کرنے کا طور طریقہ مقررہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے یار چرواہے کے

پاس اگر چاقو نہ ہو تو نوک دار پتھر ہی چُھری ہوتا ہے۔ مویشی کو لٹایا، چُھری پھیر دی اور گردن میں ریڑھ کی ہڈی کے اندر والے سفید مغز کو کاٹ دیا اور مویشی چھوڑ دیا ''ٹھنڈا'' ہونے کے لیے۔

ہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ غیر ہنگامی حالت میں کٹ جانے والا مویشی پیاسا نہ ہو۔ دوسرا یہ یقینی بنانا ہوتا ہے کہ دوسرے جانور اور مویشی اُس وقت آس پاس موجود نہ ہوں تا کہ اپنی نسل کے ممبر کو تڑپتے نہ دیکھ پائیں۔ وگرنہ وہ واقعتاً بہت تکلیف میں ہوتے ہیں۔ دکھی ہو کر دھاڑیں مارنے لگتے ہیں، پیر زمین پر مارنے لگتے ہیں (یہ محض انسان ہیں جو ضیا کے کوڑے لگتے اپنے انسان بھائی کا تماشا دیکھنے ہزاروں کی تعداد میں سٹیڈیم جاتے رہے ہیں!)۔

جب کاٹا گیا مویشی تڑپ کر ٹھنڈا پڑتا ہے تو اس کی کھال اتار دی جاتی ہے۔ یہ کھال بہت احتیاط، اُستادی اور اٹکل سے نکالی جاتی ہے۔ اس لیے کہ ان کھالوں سے مشکیزے، لسی بنانے والا ''ہیز''، آٹا رکھنے والا ''ایان''، روٹی رکھنے کے لیے ''بڈگی'' اور دیسی گھی رکھنے کا ''زنک'' بنائے جاتے ہیں۔ اس لیے نہ تو ان میں سوراخ اور چھید برداشت کیا جاتا ہے اور نہ ہی باید ہے کہ گوشت چمڑے کے ساتھ جانے دیا جائے۔

مویشی بانی چوں کہ ہماری روزی بھی ہے اور پیداوار کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی، اس لیے اس کے بارے میں ہماری ہر حرکت، ہر قدم ایک رواج بن گیا ہے۔ اس رواج سے ذرا اِدھر اُدھر ہوئے تو فوراً بے رواجی کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔

بلوچ کی زندگی اس طرح کے کئی رواجوں کے ساتھ اتنی سختی سے جکڑی ہوتی ہے کہ اس کا توڑنا اور اُس سے منحرف ہونا بہت بڑی بغاوت ہوتا ہے۔

سالن تو نہیں ہوتا تھا۔ البتہ گوشت کو اُبال کر کھانے کے قابل ضرور بنایا جاتا ہے۔ اس ڈش کو ''گراسنغیں گوژد'' کہتے ہیں۔ اُبالے جانے والے گوشت کو ''بند بند'' کرنا پڑتا ہے۔ اسے مجموعی طور پر بارہ بند میں کاٹ دیا جاتا ہے جو نمایاں اور معین دستور کے مطابق کاٹ دیے جاتے ہیں۔ سجی کے لیے البتہ چاروں پیر، پیٹھ اور گردن، سینہ پسلیوں سمیت، جگر بمع چکی دو طرفہ آگ کے درمیان پکائی جاتی ہیں (چکی اور اس کا تیل پہاڑوں، چٹانوں میں ٹھوکریں کھانے کے لیے انرجی کا زبردست منبع ہوتا ہے)۔

گوشت خوری کے بارے میں بلوچ قبائل میں دلچسپ رواج و عقائد موجود ہیں۔ مثلاً مری قبیلے کی بجارانڑیں شاخ کے لوگ گُردہ اور بالخصوص گائے بیل کا گُردہ نہیں کھاتے تھے۔ خاص کر کثیر القبائلی اجتماعات میں گردہ کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ گردہ کیوں نہیں کھاتے، کسی کو خبر نہیں۔ نہ عقل مند و دانا لوگوں کو معلوم ہے اور نہ سفید ریش اور جہاندیدہ لوگ کچھ بتا سکتے ہیں۔ یہ پابندی اس قدر زیادہ ہوتی تھی کہ کسی جگہ لوہارانڑیں، گزینی یا کوئی دوسرا پڑوسی قبیلہ میزبانی میں اجتماع کے اندر اگر جان کر، بجارانڑیں کی تھال میں گردہ ڈال دیتا تو یہ جانی پہچانی بات تھی کہ اُس نے بہت بڑی دشمنی مول لی۔

گوشت خوری

سجّی

سجی لگانے یا گوشت ابالنے کے لیے آگ جلانے کی ساری ترتیب بھی کوڈیفائیڈ ہوتی ہے۔اگر آپ مسافر ہیں اور راہ گیر ہیں اور آپ نے حالیہ سجی کی راکھ دیکھی تو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ خیر والی سجی تھی یا غم اور سوگ والی۔اگر تو اس راکھ کی سمت مغرب مشرق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشی اور شادی کا مجمع تھا، یا پھر کوئی خیرات، مہمان یا جرگہ کی گوشت خوری تھی۔لیکن اگر یہ راکھ شمال جنوب کی طرف پھیلی ہوئی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی فوتیدگی ہوئی ہے اور یہ اس کی خیرات (آسروخ) کی نشانیاں ہیں۔(انسانی معاشروں میں سمتوں کا برقرار رکھنا سخت ضروری ہوتا ہے)۔

اسی طرح سجی خود ایک ترتیب کے ساتھی پکائی ہوتی ہے۔اس کے پاؤں Limbs اس طرح لگانے پڑتے ہیں کہ قطار مغرب سے مشرق کی طرف رہے۔پہلے پہلے گردن، پھر دونوں اگلی ٹانگیں، پھر دونوں پچھلی رانیں، پھر پٹھ اور پھر پسلیاں اور آخر آخر میں کلیجہ سیخ میں پرو کر لگا دیں گے جس کے اوپر چکی رکھ دی جاتی ہے تا کہ کلیجہ گرم چربی سے پک جائے۔قدیم قبائلی دشمنی کا ایک کم بخت تصور یہ ہے کہ ایک قبیلہ کے لوگ اپنی سجی کی Medial Sides کا رخ دشمن قبیلے کے علاقے کی جانب کر دیتے ہیں اور دوسرے قبیلے کے لوگ بھی سجی میں ان سمتوں کو اپنے اسی دشمن قبیلے کی

طرف موڑ دیتے ہیں اور یوں دشمنی کے عہد اور یادداشت کو تازہ کیے رکھتے ہیں۔یااللہ اس توضیح کو بدل ڈال، بھائیوں کو بھائی بنا دے، قبائلی جنگوں کے شعلے بجھا دے اور ہمیں اکیسویں صدی کے تقاضوں کے تکمیل کی توفیق دے دے!

سجی کی بات ہو رہی ہے تو ایک عظیم انسان کی بڑائی کی یادگیری بہت ضروری ہے۔وہ عظیم المرتبت سلیمان پہاڑ جیسی قد آور شخصیت مست توکلی کی ہے۔مست جب تک زندہ رہا، اُس نے ایک فضول اور غیر انسانی رواج کو ختم کیے رکھا۔مست نے بلوچستان میں بہت آہستہ اور مستقل مزاج لڑائی کے بعد عملاً یہ کام کر دیا تھا کہ اس نے کھانے میں، خیرات میں، مہمانی میں، شادی بیاہ میں، یا کسی دوسرے جشن میں، خود کھانے سے پہلے سموراج (عورتوں) کا حصہ الگ کر کے انہیں بھجوانے کو مستقل طور پر یقینی بنایا۔اور ظاہر ہے جب تک مست نہ کھاتا، اُس کے ماننے والے بھی نہ کھاتے تھے۔چنانچہ وطن بھر میں مست گھرانے کی عورتوں کو پہلے کھلاتا اور پھر مردوں کی باری آتی۔

ایسا ہوا مشرق میں، 200 برس قبل، قبائلی کمیون میں۔اور وہ بھی ایک ٹائم، ایک دن کے لیے نہیں بلکہ اُس کی پوری زندگی۔

تماشا دیکھیے کہ اگر کوئی ظاہر یا خفیہ طور پہ اُس کی یہ بات نہ مانتا تو مست اس سے ناراض ہو جاتا اور اس گھرانے کا کھانا نہ کھاتا۔اتنے بڑے شاعر، فلاسفر، عاشق اور ولی کو ناراض کرنا بدقسمتی مول لینے کے علاوہ علاقے میں بدنامی اور رسوائی کی بات بھی تھی۔تب انہیں مجبوراً نیا دنبہ ذبح کرنا پڑتا۔مست اس گھرانے کی عورتوں کا حصہ پہلے الگ کرا دیتا اور انہیں بھجوا دیتا، پھر خود کھانا کھاتا۔

لوگوں میں بہت سی روایتیں اور بہت سے قصے اس طرح کے موجود ہیں کہ مست نے عورتوں کے اِس حق کے لیے کیسی کیسی لڑائی لڑی۔ایک قیصرانی کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔یہ قصہ ہم سب کے جانے پہچانے اور ہر دلعزیز دوست سلطان کیسرانی نے ہم بہت لوگوں کو سنایا تھا۔اُس کے والد نے اُسے بتایا کہ مست ایک بار کیسرانی قبیلہ کے علاقے گیا۔مہمانی، مویشی کشی اور خیرات کی گئی۔مست نے گوشت میں سے عورتوں کا حصہ (سموراج کا حصہ) الگ کر کے کسی کو دے دیا کہ لے جا کر گھرانے کی عورتوں کو پہنچا دے۔تگیا نامی اُس کیسرانڑیں نے وہ گوشت سالم نہیں پہنچایا بلکہ

راستے میں خورد برد کی۔مست کو خبر ہوگئی۔ پھر بھی تگیا سے اس نے پوچھا ''گوشت پہنچا دیا؟'' اس نے کہا ہاں۔تب مست نے کہا ''بروگڑہ تہ دہ سمورا جاگوں کفاشئے'' (جاؤ شالاتم بھی سمو کی رعیت میں شامل ہو جاؤ)۔کام ہیں رب کے۔۔۔تگیا مرد نہ رہا۔

اس قصہ کو آپ کا سائنسی ذہن مانے یا نہ مانے مگر، میں اور سلطان اُسے مانتے ہیں۔ مائتھالوجی کلچر کا حصہ اسی طرح بنتا ہے۔کاش کہ مست زندہ رہتا۔تب یا تو بلوچ،عورتوں کے حقوق دیتے یا پھر خدا کے حکم سے۔

گی

یہ بھی گوشت پکانے کا ایک مخصوص طریقہ ہے۔وہ یوں ہے کہ بکرے یا دنبے کی آنتوں کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر نمک مصالحہ چھڑک کر ان آنتوں کے اندر بھر دیا جاتا ہے اور ان کے دنوں سروں کو گانٹھ لگا کر بند کر دیا جاتا ہے۔پھر اس آنت کو سجی کیا جاتا ہے۔یہ بھی لذیز اور مقبول عام غذا ہے۔اسے گی کہتے ہیں۔

پَر سَندا ۔ لاندی

گوشت سے تیار کی جانے والی یہ غذا شدید سردیوں میں استعمال ہونے والی خوراک ہے۔پورا سال دنبے کو گھر میں رکھ کر خوب کھلا پلا کر موٹا کیا جاتا ہے۔ چربی بھرا یہ دنبہ سردیوں میں انرجی مہیا کرنے کا زبردست منبع ہوتا ہے۔سردیاں شروع ہوتے ہی اس فربہ کردہ دنبے کو ذبح کیا جاتا ہے۔اس کے بعد اُس کی جلد پر ابلا ہوا پانی ڈالتے جاتے ہیں۔اون نرم ہو جاتی ہے اور اسے دو تین افراد مل کر ہاتھوں کے ذریعے کھال سے نوچ لیتے ہیں۔اس طرح پورا دنبہ کھال سمیت مزید پراسیس کے لیے موجود ہوتا ہے۔اوجڑی اور کلیجی وغیرہ نکالنے کے بعد اس کھال کو آگ پر جھلسا دیا جاتا ہے تا کہ کھال پہ لگا باقی ماندہ اون بھی صاف ہو جائے۔اس طرح صفائی کے بعد بغیر ٹکڑے

کیے،گوشت میں سے ہڈیوں کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔پھر اس سالم دنبے کے گوشت پر اچھی طرح نمک مل دیا جاتا ہے۔چوبیس گھنٹے نمک کے ساتھ رکھنے کے بعد اس گوشت پر پسا ہوا ہینگ اور انار دانہ یا پھر عام سرخ مرچ اچھی طرح چھڑک دیا جاتا ہے اور پھر اُس گوشت کو اونچی جگہ پر سایہ کر کے لٹکا کر سکھا دیا جاتا ہے۔ جب سخت سردی کے ہاتھوں گوشت اچھی طرح سوکھ جائے تو وہیں لٹکتے ہوئے ہر کھانے کے وقت اس سے ضرورت کے مطابق ٹکڑا کاٹ کر پکایا جاتا ہے۔یوں ساری سردیوں میں گوشت خوری ہوتی رہتی ہے۔یہ نہ صرف لذیز، دیرپا اور منفعت بخش ہوتی ہے۔بلکہ اس کے کھانے سے سردی کی شدت سے بھی بچا جا سکتا ہے۔

شیر وروغن

(Diary Products)

بلوچ کہتے ہیں کہ اللہ کسی انسان کو بہ یک وقت چار نعمتیں نہیں دیتا: نرینہ اولاد، گندم کی روٹی، دودھ، اور ایمان۔

بیٹے تو آپ جتنے زیادہ پیدا کریں قبائلی نظام میں وہ کبھی کافی نہ ہوں گے، جہاں نرینہ افراد کی بہتات بذاتِ خود ایک سٹیٹس سمبل ہے۔

گندم کی روٹی ایک زبردست چیز ہے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو گندم نایاب کماڈٹی ہوا کرتی تھی۔ خشکابے میں گندم کی کاشتکاری کبھی کبھی پورے سال کا خوراک نہیں دیتی تھی۔ شہروں میں گندم راشن پہ ملتی تھی۔ اُس زمانے میں جب بھی ہمیں گندم کی روٹی دی جاتی تو ہم کسی سالن لسی کی ضد نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کہ مائیں کہتی تھیں، ''ابا، گندم کی روٹی تو خود سالن ہوتی ہے''۔ مگر گندم کی روٹی کو اللہ نے نیست کر دیا تھا۔ سیاسی حالتوں نے امن وامان کا سنہرا پرندہ لے جا کر پردیس کر دیا تھا۔ اور زمینداری تو ہوتی ہی امن اور قرار کے ماحول میں ہے۔ ویسے بھی خشکابہ کیا اور اُس کی زراعت کیا؟

دودھ بلاشک ایک نعمت ہوتا ہے۔ ہمارے علاقے میں جب لوگ دعا مانگتے ہیں تو کہتے

ہیں اللہ، ہٹ وشیر (اللہ صحت ودودھ)۔ مگر یہ دونوں چیزیں بہت نایاب ہوا کرتی تھیں۔ جتنی مویشی بانی ہم کرتے ہیں، وہ شاید ہی کوئی دوسری قوم کرتی ہو۔ مگر پھر بھی دودھ کی نایابی ہے کہ کم ہونے میں آتی ہی نہیں۔ دراصل ہمارے ہاں مویشی دودھ والے نسل کا نہیں ہوتا۔

بلوچ کا مویشی قد میں چھوٹا ہوتا ہے اور پہاڑ اور اُس کی جھاڑیوں کے سبب ہماری بھیڑ کے کان اور بال لمبے نہیں ہوتے۔

ایک دوسرے کے مطابق 79 فیصد بھیڑوں کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ پھیپھڑوں اور دوسری بیماریاں تو ایک طرف رکھیں۔ سرکار کا خانہ خراب ہے، وہ انسانوں کی دوا نہیں کر سکتی، مویشی تو پھر گنگ دام حیوان ہے۔

سرکار اچھی دودھ دینے والی نسل بھی مروج نہیں کر سکتی، بس سوکھے پروپیگنڈے ہیں کہ یہ کیا ہے، یہ کریں گے۔ کرتی راکھ بھی نہیں۔ قہر خدا کا، صرف مری بگٹی قبیلوں میں چودہ لاکھ بھیڑیں ہوں اور لوگ دودھ کو ترسیں۔ اُن کے بچے بے خوراکی سے افریقن بچوں جیسے لاغر ونحیف ہو کر بالآخر مر جاتے ہوں۔ بوڑھے، اسی دودھ کی کمی کے سبب وقت سے پہلے بہشت چلے جاتے ہوں۔ مائیں بہنیں اپنے ناتواں جسم سے بچوں کو دودھ پلاتی ہوں اور پلاتے پلاتے خود لکڑی کی طرح سوکھ جاتی ہوں، چہرے ہلدی کی طرح زرد اور انسانی صورت بگڑ جاتی ہو۔ کوئی کیوں چمٹا رہے ایسی سرکار سے!!

بھیڑوں کی زچگی کا موسم سردیوں میں ہوتا ہے۔ سرما کی یخ بستہ ہوا اور علاقے میں گھاس کی نایابی بھیڑ کے پستانوں کو دودھ کی نعمت سے خالی کرتی جاتی ہیں۔ ننھے لیلوں کا پیٹ پالنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح انسان کے لیے دودھ بہت ہی کم بچ جاتا ہے۔ پھر منحوس چائے کا رواج بھی بہت ہو گیا ہے۔ ''چاہ جوش'' نامی کالی بلا چولہے سے اُترتی ہی نہیں۔ زندہ رہیں گھر کی سگھڑ مالکنیں، ہمت کر کے پھر بھی کچھ نہ کچھ بچا لیتی ہیں۔

بوھلی اور کٹ

دنبی جب بچہ دیتی ہے تو ایک دو دن تک اُس کا دودھ بہت گاڑھا ہوتا ہے۔ اُسے پہلے

دن ابالتے ہیں تو وہ دودھ دہی کی طرح کا بن جاتا ہے جسے ''بوہلی'' کہا جاتا ہے۔ یہ بہت ہی لذیذ ڈش ہوتی ہے۔

بعد ازاں دو تین دن بعد تک گوکہ دودھ اُتنا گاڑھا نہیں رہتا مگر پھر بھی اسے ابالیں تو وہ ''کٹ'' نام کی مزیدار ڈش بن جاتی رہے گی۔ کنبہ شوق سے ان ڈشوں کو کھاتا ہے، یہ بہت لذیز چیزیں ہوتی ہیں۔

بعد میں تو پھر دودھ خود ایک ''سالن'' ہوتا ہے۔ چسکیاں لگا کر نوالے کے ساتھ کھائیں یا لقمہ اس میں بھگو کر کھائیں، یا پھر روٹی ٹکڑے ٹکڑے کر کے دودھ کے کٹورے میں ڈال دیں۔ یہ بادشاہی خوراک ہے۔

پنیر

انگریزوں کے cheese اور بلوچ کے پنیر میں کافی فرق ہوتا ہے۔ ہمارا پہوال (چرواہا) جب کٹورا ساتھ لے کر مال چرانے روانہ ہوتا ہے تو اُسے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ بغو (گلے سے ایک دھن) بجاتا ہوا کوہی پنیر نامی جڑی بوٹی کے فروٹ کے دو تین دانے توڑ کر کٹورے کے اندر نچوڑتا ہے اور اس میں دودھ دوھتا ہے۔ وہ اُسے دھوپ پر آدھ گھنٹہ تک رکھ دیتا ہے۔ دودھ پھٹ جاتا ہے اور دہی ٹائپ کی ایک زبردست ڈش بن جاتی ہے۔ جسے ''پنیر'' کہتے ہیں۔

دھی، لسی، مکھن

اگر دودھ میں تھوڑی سے لسی (سبھانڑ) شامل کر دیا جائے، اور ایک گدڑی کے اندر رات بھر رکھ دیا جائے تو صبح تک وہ دہی بن جاتا ہے۔ اگر آپ نے سبھانڑ کم مقدار میں ڈالا یا ٹائم کم دے دیا تو پھر دہی کی توقع نہ رکھیں، ''آماکو'' کھانا پڑے گا۔ جو بذاتِ خود ایک ڈش ہوتی ہے۔

دہی کو مخصوص کھال یعنی ہینز میں ڈال دیا جاتا ہے، اور زور سے ہلا ہچکولے دیے جائیں تو لسی مہیا ہو جائے گی۔

لسی مکھن ہمارے ہاں خوشحال اور سکھی ہونے کی علامت ہے، بڑے پن کی نشانی ہے۔

اللہ جس گھر پر زیادہ مہربان ہوتا ہے تو اس گھر کی خاتون باتوں باتوں میں اپنے گھر میں لسی مکھن کا

تذکرہ ضرور کرے گی۔ ویسے تو لسی خود ہی ایک نعمت ہوتی ہے مگر اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ گندم کی روٹی اگر نصیب میں نہ ہو اور قسمت میں ''خنزیر'' جوار لکھی ہوئی ہو تو وہ کمبخت تو اتنی روکھی ہوتی ہے کہ گلے میں سے آگے گزرتی نہیں، بُھر بُھرا ہوتی جاتی ہے۔ اُس کا منہ کے اندر بھگویا جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے بس ایک گھونٹ لسی کافی ہوتا ہے۔ جس سے جوار کا وہ نوالہ نظروں سے دور ہو جاتا ہے اور پیٹ کی جھیل میں جا مرتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ سردیوں میں دودھ کم ہوتا ہے۔

بلوچستان، بالخصوص اُس کی مشرقی حلقے میں بھیڑیں بیورغ نسل کی ہوتی ہیں جو روزانہ 200 گرام دودھ دیتی ہیں۔ اس دودھ سے مکھن کیا خاک نکلے گا؟۔ پھر بھی بوڑھیوں کے کفایت شعار ہاتھوں کو سلام ہو، وہ بڑی مصیبت اور محنت سے بالآخر مکھن نکال لیتی ہیں۔

یہ مکھن بہت سارے کام دیتا ہے۔ آٹے کے ساتھ ملا دیں نومولود بچے کا ناک خوبصورت ستواں اور سیدھا کرنے کی خاطر دن میں چار پانچ دفعہ معمولی سے پریشر کے ساتھ لگاتے جائیں۔

اگر ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہ ہو تو بچے کو مکھن کھلاؤ۔ یہ الگ بات ہے کہ مکھن اس کا باپ بھی ہضم نہیں کر سکتا۔ یہ بچہ جلد یا بدیر یا تو اللہ کا مال بن جاتا ہے یا پھر ساری زندگی صحت کی حسرت میں جیتا ہے۔

دیہی بلوچستان کے عوام کے خیال میں مکھن دوائی کا کام دیتا ہے۔ یہ خود بھی دوا، اور اسے بہت سی دوائیوں میں ملایا بھی جاتا ہے۔ خاص کر بچوں کے ''ٹک ئے کفغ'' نامی بیماری میں اَک کے پتوں اور مکھن کا استعمال جسے ناس کہتے ہیں، گویا امرت دھارا ہے۔

مکھن روٹی کے ساتھ بھی کھایا جاتا ہے۔ تب یہ بذاتِ خود ایک ڈش بن جاتا ہے۔ اگر چینی کی چٹکی بھی اس پر ڈال دیں تو پھر تو صاحبوں والی خوراک بن جائے گی۔

دیسی روغن

گھر والی کچھ مکھن بچاتی رہتی ہے۔ یوں اصلی گھی دستیاب ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔ یہ گھی کولیسٹرول سے بھرا ہوا ہے۔ شہری لوگوں کو چاہیے کہ اسے استعمال نہ کریں۔ اس لیے کہ وہ بھاگ

دوڑ کا کام زیادہ نہیں کرتے۔ کرسی میز پہ کام کرنے والے بالخصوص مکھن اور دیسی گھی سے دور رہیں۔ یہ صرف جفاکش زندگی کے لیے اچھا ہوتا ہے، جہاں لکڑی ہضم پتھر ہضم۔

آہا! دیسی گھی اگر شہد کی موجودگی میں گندم کی روٹی کے ساتھ مل جائے تو سندھ و ہند اِس پر قربان۔

معیاری اور اچھی غذا کی ایک بنیادی صفت اس کی ظاہری شکل وصورت ہے۔ اچھی اور دیدہ زیب رنگوں والی غذا آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے اور بھوک بڑھاتی ہے۔ بلوچستان کے لوگ مکھن کو گھی میں تبدیل کرنے کے لیے اس میں ہلدی، گندم کے دانے، قدرے آٹا، سونف، زیرہ اور الائچی ملا کر خوب اچھی طرح جوش دے کر اصلی دیسی گھی تیار کرتے ہیں۔ اس میں توت ملا کر اسے مشکیزہ (زنک) میں رکھ دیا جاتا ہے۔ یوں اس میں مہک پیدا ہوتی ہے اور اس کی رنگت نکھر جاتی ہے۔

مذر

مکھن کو مخصوص طریقے سے پکانے میں گندم کے جو دانے پکائے جاتے ہیں، انہیں بھی مذر کہا جاتا ہے لیکن مکران کے علاقے میں کھجوروں سے شیرہ نکالا جاتا ہے اور اس شیرہ سے نہ صرف حلوہ تیار کیا جاتا ہے بلکہ اس شیرہ سے میٹھی روٹیاں بھی پکائی جاتی ہیں، جنہیں مذر کہا جاتا ہے۔

کروت

کروت سٹور کردہ لسی ہوتی ہے۔ جیسے کہ اسے شہری لوگوں کے فرج کے اندر ذخیرہ کیا ہوا ہو۔ جب ضرورت ہو فرج سے نکالا اور کھالیا۔

بلوچستان کے وہ قبائل جن کی معیشت کا انحصار زیادہ تر مال مویشی کے پالنے پر ہے، اُن کی غذا عموماً دودھ اور اُس سے بنی ہوئی اشیا ہیں۔ دودھ سے لسی، اور لسی سے کروت (کرت، خرود) تیار کی جاتی ہے۔

کُروت یا خرود ایک قسم کی خشک کی ہوئی لسی ہے۔ یعنی لسی موٹے کپڑے کے تھیلے میں لٹکا دیا جاتا ہے تا کہ قطرہ قطرہ فلٹر ہو کے اس کا سارا پانی نیچے گرتا جائے اور پھر تھیلی میں دہی سے

بھی زیادہ گاڑھی چیز رہ جاتی ہے۔ اس گاڑھی چیز کے گول گول ڈھیلے بنا کر خشک کیا جاتا ہے۔ یوں، یہ پتھر جتنی سخت بن جاتی ہے۔ بوقتِ ضرورت اس پتھر جیسے ٹھوس ٹکڑے سے لسی بنا لیتے ہیں یا پھر اس ''دلسی'' میں پیاز اور مرچ مسالا ملا کر تر کاری بنایا جاتا ہے۔ یہ ''دلسی'' چٹنی میں بھی ملا دی جاتی ہے جس سے چٹنی کی لذت میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔

******

ایک زمانے میں دیہی بلوچستان میں دودھ، مکھن یا دیسی گھی کی خرید وفروخت کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ نورانی نعمتوں کے بیچنے سے خیر اور برکت نکل جاتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ منڈی اپنی نیک اور بد ٹانگیں پھیلاتی رہی۔ منڈی اپنے رواج مروج کر کے بہت سی بے برکت چیزوں کو برکت دیتی رہی، اور برکت والی نعمتوں کی بے برکتی کرتی رہی۔

مالداری (مویشی بانی) کا ارتقا، دودھ دہی کی فراوانی، اور مویشی کی صحت وسلامتی ابھی تک سب کی سب بارشوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ ہم ابھی تک بارشوں کے محتاج ہیں جو کئی کئی ماہ حتیٰ کہ کبھی کبھی تو کئی سال تک اِدھر اُدھر آوارگی اور بھیک مانگنے گم ہو جاتی ہیں۔ اور پھر بہت دیر بعد اُن کی واپسی ہوتی ہے۔ بارشوں کی واپسی بھی ہمارے علاقے میں بد بخت ہوتی ہے۔ یہ جب اپنی طویل آوارہ گردی سے واپس لوٹتی ہیں تو اُن کا چہرہ سوجھا ہوا، فرعون نما ہوتا ہے۔ غصے سے بپھری ہوئی بارشیں سیلابوں تباہ کاریوں کے ساتھ آتی ہیں۔ طویل ندی نالوں میں آیا ہوا سیلاب مویشیوں کو بہا لے جاتا ہے۔ ان بادلوں کو کیا خبر کہ اُن کی غیر موجودگی میں خوبصورت چرواہے اور محنت کش کسان سندھ میں فیوڈلوں کی جھڑکیاں کھانے جاتے ہیں۔ وہ وہاں دن رات محنت کرتے ہیں۔ ''پروطنی'' برداشت کرنی ہوتی ہے، بال بچے دوسروں کی جھڑکیوں دھکّوں کے حوالے ہوتے ہیں۔ بادل پھر بھی ناراض ہیں، آتے ہیں تو گالی گلوچ کرتے ہوئے، دھمکیاں دیتے ہوئے۔

وہ دن ضرور آئیں گے جب فارمنگ کا سائنسی نظام وضع ہو گا اور پھول جیسے بلوچ خشک سالی یا سیلابوں کے رحم وکرم پہ نہ رہیں گے اور انسان دوست حکومت ٹیوب ویل، ڈیم اور دیگر طریقوں سے چراگاہوں کی بہتات کر دے گی۔ مالداری کو کوآپریٹو بنیادوں پر چلائے گی۔ اچھی نسل

کے جانور لائے گی، قد آور یا دودھ دینے والی یا پھر پشم والی نسلیں بڑھائے گی۔ مویشی کی بیماریاں دور کرنے کے لیے ہسپتالوں کا جال پھیلائے گی اور ان میں وطن دوست ڈاکٹر بٹھادے گی......

چمڑی

بلوچستان پھلوں کے لحاظ سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں سیب، انگور، انار، بادام، زردالو، آڑو، ناشپاتی وغیرہ کی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں۔

زردالو کی پندرہ اقسام میں سے ایک کو ''شغالی'' کہتے ہیں۔ اس کو تازہ کھانے کے بجائے اسے خشک کر کے بطور ترکاری استعمال کیا جاتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں اس خشک کردہ زردالو کو بھگو کر نرم کرنے کے بعد ایک گاڑھا شیرہ تیار کیا جاتا ہے جس میں حسب ذائقہ مختلف مسالہ جات ڈال کر دھیمی آگ پر پکایا جاتا ہے اور یوں چمڑی کے نام سے ایک نہایت لذیذ میٹھا پکوان تیار ہوجاتا ہے۔

آٹھواں چیپٹر

بڑے جانور

بیل گائے

ماسوائے اونٹ کے باقی بڑے جانوروں کا ریوڑ رکھنا بلوچستان میں عام نہیں ہے۔ مثلاً ایک ہی مالک کی بہت سی گائیں یعنی ''گورم'' رکھنے کا رواج بہت کم ہے۔ گاؤں دیہات میں البتہ ہر گھر کے دودھ والی گائے کو ایک مشترک چرواہا چرانے لے جاتا ہے۔ اس انفرادی گائیوں کے مجموعے سے گورم بنتا ہے جسے ''گوآل'' چرانے لے جاتا ہے، ماہوار کرائے پر۔

نصف حصے پر بھی لوگ اپنی گائے دوسروں کو چرانے کے لیے دے دیتے ہیں۔

بلوچ کی گائے بھی بس اللہ لوک ہوتی ہے۔ نہ دودھ کے لیے مشہور، اور نہ قدِ و قامت رکھتی ہے۔ نسل کشی کے مراکز، بڑے ہسپتال اور کوئی بڑے ڈیری فارم موجود نہیں ہیں اس لیے کہ سرکار تو خود اپنے گناہوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اسے کیا فکر کہ عوام کو دودھ اور گوشت وافر مقدار میں ملے۔ اور وہ ایسا کرے بھی کیوں؟ اسے پتہ ہے کہ پیٹ بھر جائے تو دماغ زرخیز ہو جاتا ہے اور جس وقت دماغ جاگ اٹھے تو بہت سے آقاؤں کے بھاگ سو جائیں گے۔ اس لیے چرواہے کو سلا دو، سویا رہنے دو۔ (پیداواری قوتوں کو انڈسٹری سے وابستہ کرنے کے بجائے کسان اور چرواہا ہی رکھنا انسانیت کے خلاف بہت بڑا سماجی معاشی ظلم ہے!)۔

بلوچستان کے اندر بیلوں میں بھاگ ناڑی نسل بہت مقبول ہے۔ اس نسل کو بڑھاوا دینے کے لیے جعفر آباد ضلع میں ایک کیٹل فارم ہے۔

بیل ہل چلانے ہی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، اور کوئی بڑا کام بیل سے نہیں لیا جاتا۔ ایک آدھ بیل گاڑی ہے۔ سرسوں کا تیل نکالنے کے لیے کہیں کہیں بیل کو لہو کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔

ٹریکٹر اور بلڈوزرز نے بیل کی آبادی کو ایک حد تک متاثر کیا ہے۔ جس طرح موٹر سائیکل اور پک اپ نے گھڑ سواری اڑا دی، اسی طرح بیل کو ہل چلانے، بار برداری کرانے اور فصل تیار کرانے کے لیے استعمال کرنے کے بجائے انجن سے چلنے والے بیل یعنی ٹریکٹر کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ (ٹریکٹر انقلاب ہے!)۔

شتربانی

جت...... اونٹوں کا گلہ بان

جت کے مقابلے میں، پھوال کی ایک حیثیت دیکھیں تو وہ ایک طرح سے بہت سکھی اور خوش ہے۔ اس لیے کہ اُسے کم از کم دوسرے درجے کا انسان کوئی نہیں سمجھتا۔ وہ جت سے بہت، بہت بہتر ہے۔ جت کی جتنی تو ہر قسم کے ظلم، زبردستی اور ناروائی میں زندگی گزار رہی ہے۔ چوں کہ انھیں بلوچ میں برابری کی حیثیت نصیب نہیں ہوئی ہے لہٰذا اُس کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک ہوتا ہے۔

جت ابھی تک بلوچ میں برابری کی حیثیت نہیں پا سکے ہیں۔ یہ شتربان لوگ زیادہ فطرت کے قریب ہیں۔ یہ سردی گرمی اونٹوں کے لیے چراگاہ کے پیچھے گھومتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ چٹائی والی کڑی (خیمہ) ہوتی ہے، چکی ہوتی ہے، ایک آدھ برتن، اور ایک آدھ ڈانگ۔

اونٹوں کی گلہ بانی کرنے والے ''جت'' کی اپنی زندگی بھی تلخ زہر ہے۔ اونٹ جیسے بے دماغ جانور کو چَرانا اور اُسے سنبھالنا بذاتِ خود بہت مشکل کام ہے۔ اونٹ جو بدنیت ہے، بے آرام

اور بدعادت ہے، بھلا کہاں جھوک میں آرام سے رہتا ہے۔ نرم اور سارس جیسی اس کی ٹانگیں ٹوٹتی بھی جلد ہیں، پہاڑ سے پھسل کر گرنا بھی اس کی دائمی بدبختی ہے، چور بھی اسے آرام سے لے اڑاتے ہیں، خود بھی آوارہ گردی اور سیر سپاٹے کی لت اسے لگی ہوتی ہے کہ گـچـتـو نامی جھاڑی کی جگالی اسے دور دراز کے علاقوں کی چراگاہوں کی زیارت کے لیے اکساتی رہتی ہے۔

اونٹ صدیوں سے بلوچ عوام کا دست و بازو رہا ہے۔ تاریخ میں شتربان بلوچ ایک طرف تو ساحل مکران سے لے کر ڈیرہ غازی خان اور دوسری طرف ساحل مکران سے لے کر قندہار تک ساری تجارت اسی اونٹ سے کرتے رہے ہیں۔ یہ ہماری ٹرانسپورٹ کی گاڑی ہے، تبادلہ کا میڈیم ہے، خانہ بدوش کا روزی رساں ہے۔ یہ دلہن کا لب ہے، خون بہا ہے۔ یہ ہمارا مستقل ساتھی ہے، ہمارا ہم زاد ہے۔ ہمارا پالن ہار۔ اس کا دودھ بیماریوں کا علاج ہے۔ دودھ کی جھاگ پکنک کی خوراک ہے، اس کا گوشت میلے اور جشن کی ڈش ہے، اس کا پشم ہمارا خیمہ اور چٹائی ہے۔ (1)

بگ کا جھوک دو مواقع پر بالخصوص میلہ کا سماں پیش کرتا ہے:

ایک تو اونٹوں کو مالک کا مخصوص نشان لگانے (دانگ) کے وقت (جب لوگ جمع ہوتے ہیں، ایک دودنبہ ذبح کرتے ہیں اور اونٹوں کے مالک کے نام کا پہلا انگریزی حرف والا لوہا گرم کر کے اونٹ کی گردن، جبڑا، پیٹھ یا ران پر رکھ لیا جاتا ہے تاکہ یہ گرم لوہا جلد کو جلا ڈالے اور ساری عمر یہ نشان موجود رہے۔ (دانگ کب سے مروج ہوا...... آیا یہ چاکر کے زمانے میں تھا یا نہیں؟ یہ سوال ابھی محققین کے لیے جواب طلب ہے)۔

دوسرا وقت ڈاچی (اونٹنیوں) کے بچے دینے کا ہوتا ہے، جب اونٹنی کے دوہے گئے دودھ پر بہت سا جھاگ چاٹنے کے لیے قرب و جوار سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔

ڈاچی کا دودھ کچھ کچھ نمکین ہوتا ہے۔ یہ جھاگ انگلیوں کی مدد سے چاٹی جاتی ہے۔ ڈاچی کے دودھ، دودھ پہ بنی جھاگ اور جتنڑیں پہ زبردست شاعری موجود ہے۔

اونٹ کا گوشت بہت فضول اور بدذائقہ ہوتا ہے۔ اونٹ سات جگہ سے ذبح کیا جاتا ہے اور عید کی قربانی کے لیے لوگ مل کر اسے خریدتے ہیں اور کاٹتے ہیں۔

اونٹ بار برداری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ملکیت والے اونٹ بار برداری کے لیے بہت کم استعمال کیے جاتے ہیں۔ کچھ کچھ ''مہری'' البتہ ہیں۔ یمن کے ''مہرہ'' قبیلے کا اونٹ اپنی برق رفتاری کی وجہ سے مشہور تھا۔ اسی حوالے سے سواری کے لیے مخصوص سبک رفتار اونٹ کو ''مہری'' اونٹ کہا جاتا ہے۔ بیورغ کی شاعری میں ''مہری'' کا بہت ذکر موجود ہے۔

اونٹوں کے ریوڑ کو ''بگ'' کہتے ہیں اور انہیں چَرانے والے کو ''بگ جت'' یا ''جت''۔ تقریباً ہر قبیلے میں سب سے بڑا بگ سردار کا ہے۔ اس کے بعد وڈیرہ کے بگ بھی ہیں۔

مشرقی بلوچستان کے اونٹ ویساکھی کے میلہ میں سخی سرور میں بکتے ہیں۔

گھوڑیاں

گھوڑیوں کی بلوچ نسل بہت شہرت کی حامل رہی ہے۔ بلوچ گھوڑے بہت کم رکھتا ہے۔ وہ اسے ڈومب کو مفت یا واجبی قیمت پر دیا کرتے تھے۔ اور وہ صرف نسل کشی کے وقت استعمال ہوتا تھا۔

اس کی ملکیت اور شراکت کے دلچسپ رواج ہوا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ گھوڑی کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی سے پوری گھوڑی خریدنے کی استطاعت نہ رکھتا تو اپنی ہمت کے مطابق اُس کی ایک ٹانگ یا دو ٹانگیں قیمتاً خریدتا تھا۔ اب آپ شیکسپیئر کے ''مرچنٹ آف وینس'' کی طرف نہ جائیے۔ یہاں سمپل بات ہے۔ ایک ٹانگ کے عوض گھوڑی سال کے تین ماہ تک سواری کے لیے اپنے پاس رکھی جاسکتی تھی۔ اُس کے بعد گھوڑی باقی ٹانگوں کے مالک کے سپرد کیا جاتا تھا۔

گھوڑیاں بلوچستان بھر میں پالی اور رکھی جاتی تھیں۔ ایک زمانے میں جب جنگیں تلواروں سے لڑی جاتی تھیں، تو ہندوستان بھر میں قلات اور خضدار کی گھوڑیاں مشہور ہوا کرتی تھیں۔ ''ہارس ٹریڈنگ'' شاید انگریز نے یہیں سے شروع کی تھی۔ بلوچ بہت اچھا گھڑسوار ہوتا تھا۔

شادیوں اور میلوں میں گھڑ دوڑ محبوب کھیل ہوا کرتا تھا۔ چاکر و گوہرام کی تباہی سے لے کر ٹریکٹر و موٹر سائیکل کے آنے تک کا درمیانی عہد گھوڑے اور گھوڑَو (گھڑسوار جنگی دستہ) کا عہد تھا۔

نواں چیپٹر

مویشی بانی کی گھریلو صنعتیں

اونٹ کے پشم سے بہت مضبوط رسے، بوریاں اور اس طرح کی دوسری چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اس پشم کو بلوچی میں ''مِلس'' کہتے ہیں۔

مویشی کے پشم کو ''مِلخ'' کہتے ہیں، وہ پشم جو فروخت ہونے سے بچ جاتی ہے۔ مِلخ گھر کی ہمدرد مالکن کے ہاتھوں مقتدر ہو جاتی ہے۔ ایک بھیڑ سے تقریباً 1.45 کلوگرام پشم دستیاب ہو جاتی ہے۔ یہ پشم تقریباً 100 فیصد سفید ہوتی ہے۔ پشم میں چربی (Grease) 0.60 فیصد ہوتی ہے۔ اس پشم کے دھاگے کا ڈایا میٹر 43.5 مائیکران اور اس کی لمبائی 5.1 سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ گھر میں بچی ہوئی پشم تو بہت صاف ستھری ہوتی ہے مگر منڈی میں فروخت کرنے کے لیے پشم کے اندر صاف حصہ 63 فیصد، راکھ وغیرہ 3.3 فیصد، سبز مواد (Green Matter) 1.4 فیصد، اور دیگر اَن دھلی، گندی اور ملی جلی پشم 16 فیصد ہوتی ہے۔

گھر کی ستھری پشم کو مالکن دو لمبی، پتلی لاٹھیاں (لٹک) لے کر چٹائی پر بچھا کر پیٹتی (دھنتی) ہے جس سے وہ خوب اچھی طرح تار تار ہو کر الگ ہو جاتی ہے۔

جس پشم سے نمدہ یا گھوڑے کے لیے ''گندل'' بنایا جاتا ہے اُسے بل دینے کے بجائے بچھا دیتے ہیں اور بار بار اُسے اُسی کے اپنے گرد لپیٹتے رہتے ہیں اور دوبارہ بچھاتے رہتے ہیں۔ یوں وہ باہم پیوست ہو کر دری جیسی بن جاتا ہے۔ اس گندل کو سردیوں میں گھوڑی پر ڈال دیا جاتا

ہے تا کہ اُسے یخ بستہ ہواؤں سے بچایا جا سکے۔اس گندل سے، بیٹھنے کے لیے گدیلا، یا پھر قالین کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔

پشم سے دھاگہ بنانے کے عمل کو''بریسغ'' کہتے ہیں ۔اور اس کام کے لیے استعمال ہونے والے آلے کو''دیخ'' کہتے ہیں ۔ یہ تقریباً ایک فٹ لمبی پتلی لکڑی ہوتی ہے، جس کے اوپر کے سرے پر بل کھاتا ہوا (Spiral) گڑھا بنا ہوا ہوتا ہے۔اس کا نچلا سرا نوکدار بنایا جاتا ہے۔اوپر سے لمبائی کے چوتھائی حصے پر ایک چپٹی لکڑی ڈال دی جاتی ہے۔ یوں یہ ایک طرح کی صلیب بن جاتی ہے۔

دِیخ سادہ بھی ہوسکتا ہے اور نقش ونگار والا بھی ۔سگھڑ، جوان اور زندہ دل یا پھر امیر عورتیں اپنے دیخ پر نقش ونگار بنواتی ہیں ۔نقش ونگار والا کام مرد کرتے ہیں ۔ وہ چاقو کی نوک سے لکیریں بنا بنا کر مختلف قسم کے ڈیزائن، پھول، ہرن، پرندے اور دیگر جانوروں کے نقش ونگار بناتے ہیں ۔ دیخ اور لٹک کو خوبصورت بنانا ایک طرف تو مردوں کے جمالیاتی ذوق کی اعلیٰ سطح اور آرٹ کی استادی کی علامت ہوتی ہے، تو دوسری طرف خود عورت کے ذہنی اور سماجی سٹیٹس کا خوبصورت اظہار اور نمائش ہے۔ دیخ اور لٹک کے یہ نقش ونگار کبھی کبھی مست دوستوں کی نشانی یا پھر بے دوستی کے عمیق غم اور بے کیف زندگی کی چغلی بھی کھاتے ہیں۔

دیخ سے کاتنے کے بعد اِس دھاگے سے رسی (تیل ، یا، ریز) بنائی جاتی ہے۔سفید وسیاہ والے دورنگوں سے بنی ہوئی رسی''کمبریں'' کہلاتی ہے۔بکری کی پشم (میذ) سے عموماً کالے رنگ کی رسی بُنی جاتی ہے ۔سبز وسرخ دھاگوں کے گچھے بنا کر ان پر سمندر سے حاصل کردہ سپیاں ''کُشک اور گُر'' پرو کر انہیں مزین کیا جاتا ہے۔ یہ گھوڑے کا''ریز'' کہلاتا ہے۔بیل کی باگ بھی اسی طرح بنائی جاتی ہے ۔اسی چیز کو تیز رفتار اونٹ''مہری'' کی مہار کے بطور استعمال کیا جاتا ہے۔تَیل جانوروں کی باربرداری کے لیے مضبوط رسی کا کام دیتا ہے۔ ریز اور تیل دس دس بارہ بارہ سال تک چلتے ہیں۔

اسی کے علاوہ دیخ سے تیار کردہ دھاگے''کارگاہ'' میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ رنگدار

دھاگہ دراصل سفید پشم کا دھاگہ ہوتا ہے ۔ جسے دیخ میں دھاگے کی شکل دینے کے بعد اس دھاگے کو فٹبال جیسی گولائی میں لپیٹ دیا جاتا ہے ۔ جسے''ڈیرو'' کہتے ہیں ۔ان سفید ڈیرووں کو رنگ دینے کے لیے بڑے شہروں کو بھیج دیا جاتا ہے۔''رنگُو'' انہیں مطلوبہ رنگ میں ڈال کر ابالتا ہے تا کہ رنگ پکا چڑھ جائے اور وقت کا گزر اُن کی شوخی کو مدہم نہ بنا سکے۔ہم بنیادی طور پر رنگین مزاج لوگ ہیں ۔ اس لیے عموماً شوخ رنگ پسند کرتے ہیں ۔جس زمانے میں''سرکاری'' رنگ نہیں ہوا کرتے تھے تو موسمِ خزاں میں گرے ہوئے خشک پتوں کو جمع کر کے ان کے رنگ سے کام لیا جاتا تھا (دیسی)۔

جہاں بہت سے گھرانے اکٹھے خیمہ زن ہوں وہاں ایک آدھ گھر میں ایک''کارگاہ'' موجود ہوتا ہے اور اس کی کاریگر بھی ایک آدھ بوڑھی ہوتی ہے ۔ یہ بوڑھیاں کارگاہ نصب کرتی ہیں، ''ڈپی'' ہاتھ میں لیتی ہیں اور ڈپ ڈپ کی آواز کے ساتھ اس چہار شاخہ ڈپی کو چلا چلا کر دری بافی کرتی رہتی ہیں۔ جو چیزیں یہ ماہر ہاتھ بنا ڈالتے ہیں ان میں''شیخن'' ہے جس پر روٹی تھاپ کر توا (تافغ) پر پکائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ چَو ،لوغ دفی ، ہُرجین اور تیرغ بھی بنائے جاتے ہیں ۔اُن تمام چیزوں کا مشترکہ نام''کَنّی'' ہے جو کارگاہ سے بُنی جاتی ہیں۔غلہ رکھنے والی بوری (گوالغ)، پشم رکھنے کے لیے (جھول)' بھوسہ لادنے کی بڑی بوری (گنج) یہ سب چیزیں پشم اور بکری کے بالوں سے بنتی ہیں۔

مویشی کی کھال

مویشی کی کھال سے پانی سٹور کرنے والے برتن (مشک ، نیم مشک ،کلّی)،لسی بنانے کا ہینز ، روٹی کی تازگی نرمی برقرار رکھنے والی بڈگی ، آٹا رکھنے والا اپان، اور دیسی گھی رکھنے کا زنک بنائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ کھال ویسے بھی مارکیٹ میں بکتی ہے ۔مویشی کی کھال کو بلوچوں کی اکثریت مختلف بیماریوں کے علاج کے طور مریض پر چڑھا دیتی ہے ۔جگر کی بیماریاں، کھانسی، نمونیا، ٹائیفائیڈ اور دیگر کئی سمجھ میں نہ آنے والی بیماریوں میں مختلف کھال مختلف ڈوز میں چڑھائے جاتے ہیں۔طبیب صاحب ہی اتھارٹی ہے۔ چاہے تو نیلے رنگ کی بکری کی کھال کا نسخہ تجویز کرے،

چاہے تو بھورے رنگ کی بھیڑ کی کھال چڑھوا دے ۔ وہ چاہے تو چار کھال بتا دے یا بارہ کھالیں چڑھا دینے کا طویل ڈوز بتا دیں۔

ڈیٹرجنٹ

کپڑے دھونے کے صابن کے بطور بلوچستان بھر میں، بالعموم اور مشرقی بلوچستان میں بالخصوص کال بنانے کا رواج عام تھا ۔ کال جو در اصل سوڈا کاربونیٹ ہے جو کہ Salsola Griffithii نامی جھاڑی سے حاصل کیا جاتا ہے ۔ اس جھاڑی کو دسمبر اور جنوری میں کاٹتے ہیں، خشک کرتے ہیں پھر اسے زمین میں سوراخ کر کے جلا کر راکھ کر دیتے ہیں ۔ راکھ کو آٹھ دن تک زمین میں دبائے رکھتے ہیں جس کے بعد اسے ٹھوس صورت میں نکال لیتے ہیں ۔ یہ مارکیٹ میں بکتا تھا۔ لانڑیں یعنی Suoeda Fruticose سے نکالا ہوا کال، گھٹیا کوالٹی کا ہوتا ہے ۔ انگریز کے وقت ہزاروں من کال بنتا تھا اور ریل کے ذریعے دوسری جگہوں میں بکتا تھا۔(2)

کشیدہ کاری

کشیدہ کاری کرنے والوں کی، شہری مراکزِ تجارت تک رسائی نہیں ہے ۔ اس لیے اُس کی تیار کی ہوئی چیزوں کو اونے پونے داموں خریدتے تھے ۔ اب شہروں کے درزی اور پیرہن دوز انہیں حاصل کرتے ہیں ۔ سمال انڈسٹریز کا محکمہ بھی یہ کام کرتا ہے ۔ مگر بہت محدود پیمانے پر، اور بہت بے دلی کے ساتھ۔

کشیدہ کاری کے علاوہ بلوچوں میں سکہ دوزی کی آرائش بھی مروج ہے ۔ اس غرض کے لیے پہلے مناسب کپڑے کا انتخاب کیا جاتا ہے ۔ پھر اس پر زرکاری، صدف ٹانکنے اور مصنوعی موتی، منکے اور شیشے ٹانکنے کا کام ہوتا ہے ۔ ایسے کپڑوں کے کناروں اور حاشیوں میں رنگین دھاگوں کے گچھے آویزاں کیے جاتے ہیں جس سے سکہ دوزی کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے ۔

بلوچ خواتین اون کات کر اپنے گھروں میں دری کے بطور بچھانے کے لیے فرش و گلیم تیار کرتی ہیں۔

پیش اور اس کی مصنوعات

یہ بالکل کھجور کے پتوں کی طرح ہوتا ہے ۔ کھجور کے پتے سخت ہیں، کم چوڑے ہیں اور تیز کناروں والے ہیں ۔ مگر کھجور درخت ہے جبکہ پیش ایک جھاڑی ہے ۔ پیش ایک چھوٹا سا پام پودا ہے ۔ یہ تین چار فٹ سے زیادہ اونچا نہیں ہوتا ۔ یہ مکران، خاران، چاغی لسبیلہ، مشرقی بلوچستان الغرض پورے بلوچ علاقے میں ہوتا ہے ۔

پیش سے رسے رسیاں، چارپائی کے بان بنائے جاتے ہیں ۔

چٹائی

چٹائی بچھانے کے لیے تو عام موجود ہے ۔ اس چٹائی کو کھجور، گندم، جوار، باجرہ اور مکئی کی فصل کو محفوظ کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔ سیستان اور مکران والے بلوچستان میں، چٹائی بنانے کے لیے کھجور کے پتوں کو استعمال کرتے ہیں ۔ مگر بقیہ بلوچستان میں پیش (مزری) سے چٹائی بنی جاتی ہے ۔ نازک ریشوں سے گلدان، کھجور رکھنے کی ٹوکریاں (کھجور کے پتوں سے بھی بنائی جاتی ہیں اور ''پات'' کہلاتی ہیں)، روٹیاں رکھنے کی چنگیر، اور دستی پنکھے بناتے ہیں ۔ چٹائی چھپر کے طور پر سایہ کے لیے، کچے مکانوں کے چھت میں بھی استعمال ہوتی ہے ۔(3) چھوٹے بیگ ''کندری''، بہت بڑا تھیلا ''سُند''، بھوسہ ڈھونے کے لیے ''گُنج''، غلہ سٹور کرنے کے لیے ''بنڈو''، اور جوتے کے بطور استعمال ہونے والا ''سواس'' پیش کی کار آمدگی کا ثبوت ہیں۔

گِل کاری

مٹی کے برتن بنانے کی صنعت کے ظہور کی تاریخ، بہت قدیم ہے ۔ مہرگڑھ تو گویا مٹی کے برتنوں کا بڑا کارخانہ تھا ۔ ایرانی بلوچستان میں چھ ہزار سال قبل مسیح میں مٹی کے برتن پکانے کی بھٹیوں کا پتہ چلتا ہے ۔ بلوچستان اور برتن لازم و ملزوم رہے ہیں ۔

شہری زندگی کے آجانے سے برتنوں کی ورائٹی میں بہت وسعت آئی ہے ۔ ایسے بے شمار نئے برتن آگئے جن کے لیے بلوچی کا نام موجود نہیں ہے ۔ یہ برتن اب مٹی کے نہیں رہے ۔ سٹیل

کا زمانہ بھی گزر گیا۔شیشے اور پلاسٹک کے برتنوں نے باورچی خانے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔البتہ ہمارے ہاں اب بھی گِل سے بنے دیگچے اور تنور بنائے جاتے ہیں۔گھڑے اور صراحیاں میدانی علاقوں میں مارکیٹ کے لیے بڑے پیمانے پر بنائی جاتی ہیں۔

دسواں چیپٹر

ٹیکس اور امدادِ باہمی

سرقبیلوی نظام ہر استحصالی معاشی نظام کی طرح اپنے اندر چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں پیدا کر کے خود کو دوام بخشنے میں مہارت رکھنے والا نظام رہا ہے۔ٹیکس تو بڑی لُوٹ کا محض ایک حصہ ہیں۔اس لیے یہ کبھی شرح میں کم ہوتے رہے ہیں، اور کبھی زیادہ......اور پوری انسانی تاریخ میں، متبادل پیدا کیے بنا کبھی بھی کوئی ٹیکس یکسر ختم نہیں کیا گیا۔مویشی بانی میں ہمارے ذمے مندرجہ ذیل ٹیکس ہوا کرتے تھے:

گھال

قبیلہ کی ساری مال چرائی کے حقوق سردار کے پاس تھے اور ہر قبائلی، ٹیکس یعنی گھال دے کر مال چرائی کا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔اس ٹیکس کی شرح یہ تھی: ہر چالیس بھیڑوں پر مشتمل ریوڑ پر چار کلدار (چاندی والے روپے) سال میں دینے پڑتے تھے جو کہ اندازاً دو دنبے بنتے تھے۔نہ دینے کی صورت میں جیل بھیج دیا جاتا تھا جہاں پر رسوائے زمانہ سزا یعنی ''کاٹ'' کی سزا دی جاتی تھی۔دروغ گوئی کرنے والے یعنی مویشی کی تعداد کم ظاہر کرنے والوں کو سردار کے سپاہی (لیویز) پیٹا کرتا تھا۔

گھال وصول کرنے والے کارندے سردار کے اپنے گھرانے کے افراد ہوا کرتے تھے۔وہ اس ڈیوٹی کی تنخواہ وصول کرتے تھے۔ان کا اثر ورسوخ بہت ہوتا تھا۔وہ قبائلی معاملات میں سردار کے مفاد میں مداخلت کرتے تھے۔اور اس طرح سردار کے ریاستی ڈھانچے میں اہم مقام رکھتے

تھے۔ وہ اپنی ماتحتی میں دیگر لوگ بھی تنخواہ پر رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ رضا کاروں کا ایک گروپ بھی اُن کے ساتھ ہوتا تھا، جو مقامی لوگوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس طرح کوئی شخص گھال دینے سے بچ نہیں پاتا تھا۔ یہ لوگ گروہ کی صورت میں جا کر گھال وصول کرتے تھے۔ ان سب کو بھی کھلانا، ان کی گھوڑیوں کو غلہ کھلانا بھی گھال دینے والے (ٹیکس گزار) کے ذمے ہوتا تھا۔

تنڑیں

یہ چنگی کا محصول ہوا کرتا تھا۔ ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں جائیں تو اس صورت میں تنڑیں دینا پڑتا تھا۔

سُنگ

دو چیزیں قبیلے کی ضروریات سے زائد پیدا ہوتی تھیں: ''پیش'' (پودا جو چٹائی بنانے کے کام آتا ہے)۔ ''میٹ'' (گاچی) جو صابن کے بطور استعمال ہوتا ہے۔ جت انھیں اونٹوں کے ذریعے مارکیٹ تک لے جاتے تھے اور وہاں بیچتے تھے۔ ایک اونٹ کے لوڈ پر سردار کے چار آنے ہوتے تھے۔ بگٹی میں ایک اونٹ لوڈ اناج درآمد یا برآمد کرنے پر ایک کاسہ (13 سیر)، نوشکی میں پانچ سیر، نمک کے اونٹ پر ایک کاسہ، پشم، چینی اور تیل وغیرہ پر فی اونٹ ایک روپیہ۔ ایک بھیڑ، یا بکری کی درآمد برآمد پر، یا بگٹی علاقہ میں سے گزرنے پر ایک آنہ ٹیکس تھا۔ آٹھ آنے فی بیل پر اور ایک روپیہ فی اونٹ پر۔ قافلوں کی بحفاظت گزر پر ٹیکس اناج کے ایک اونٹ پر چار آنہ، اور پشم لدے اونٹ پر آٹھ آنے (اس میں پچیس فیصد سردار کا ہوتا تھا اور باقی اُن قبائل کا تھا جو محافظ تھے)۔ (4)

مری علاقے میں سبی اور تلی کے درمیان تجارت پر مری سردار ٹول ٹیکس لیتا تھا، گمبولی کے مقام پر ریٹ یہ تھے؛ اونٹ ایک روپیہ آٹھ آنے، گھوڑا ایک روپیہ، بیل بارہ آنے، گدھا چھ آنہ۔

دَھڑ

یہ ٹیکس گاؤں کا وڈیرہ دکانداروں سے لیتا تھا۔ غلے کا چالیسواں حصہ۔ اونٹ کے بار پر ڈیڑھ روپیہ آنے کا، اور ڈیڑھ روپیہ جانے کا لیا جاتا تھا۔

مالیہ

1947ء سے قبل بلوچستان میں زرعی زمین دو طرح کی ہوتی تھی: مالیہ دِہ اور غیر مالیہ دِہ۔ مالیہ دِہ اراضیات وہ تھیں جو سرکار قِلات کی ملکیت ہوتی تھیں۔

حکومت قلات کاریزوں پر ''کلنگ'' نامی ٹیکس وصول کرتی تھی۔

زرِ سر، زرِ شاہ، اور زرِ ترنی

یہ خوانینِ قلات کے ٹیکس تھے جو مکران میں مروج تھے۔

1938ء میں قلات نیشنل پارٹی کی زبردست تحریک پر یہ ٹیکس منسوخ کر دیے گئے۔

ڈھک

کسی کے کھیت میں اگر کسی کا مویشی گھس جاتا تو اسے سردار کے مقرر کردہ ایک احاطے میں بند کر دیا جاتا تھا جسے ڈھک (کانجی ہاؤس) کہتے تھے۔ مالک مقررہ پیسے دے کر اپنا مویشی وہاں سے چھڑاتا تھا۔ یہ پیسے سردار کے ہوتے تھے۔

نال پروش

ایک اور ٹیکس ہوا کرتا تھا۔

پنچک

بہادر شخص کو جو کہ کمانڈر کے عہدے تک پہنچ جاتا اُسے جنگی مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ دیا جاتا تھا۔ مری میں بجارانی کا وڈیرہ نوحق اور دلیل سومرانی پنچک لیتے رہے۔

مَرگ ٹیکس

محترم عزیز بگٹی نے لکھا کہ جب بیورغ بگٹی قبیلے کا سردار بنا تو اس نے ایک موت ٹیکس لگا دیا۔ یعنی کسی بھی مرنے والے شخص کو دفن کرنے سے پہلے ایک چونی بطور ٹیکس سردار کو دینا پڑتا تھا۔ کم از کم اس ٹیکس کی چوری ممکن نہ تھی اس لیے کہ کم آبادی والے قبیلے میں فوتیدگی بڑی بات ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بے کس اور غریب عورت کا اکلوتا بیٹا مر گیا اور اس کے پاس ایک پھوٹی کوڑی تک نہ تھی، بیٹا کیسے دفنا سکتی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کا نوحہ ان الفاظ میں کیا جو بیورغ کے دورِ

سرداری کی دُہائی بھی تھی:

کس مه مرا بیورغه بذیں باری آ

(خدا کرے بیورغ کے برے عہد میں کوئی نہ مرے)

عزیز بگٹی لکھتا ہے کہ آج تک بیورغ ''بذیں بیورغ'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ در اصل بیورغ اول تھا۔ بیورغ دوم کو'' بیورغ زونگ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔(5)

ریز

جنگ میں دشمن کے ہتھیار غیر مؤثر کرنے کی کرامت رکھنے والے شخص کو اس کی کرامت کے عوض آوار یعنی مالِ غنیمت سے ایک جانور (بیل، گائے، اونٹ) دیا جاتا تھا۔ قبائلی سماج کی بھی اپنی دلچسپ مائتھالوجی ہوتی ہے۔ ہمارا ایک ریز بردار بزرگ انگریز کی بندوقیں اور توپ نہ روک سکا تو بہانہ فوراً یہ بنایا کہ انگیز سور کھانے والے تھے، جن پر دم چھو کام نہیں کرسکتا۔(6)

بجار، پوڑی

یہ ٹیکس نہیں ہیں بلکہ امداد باہمی کے ذرائع ہیں۔ ان دونوں میں باہمی فرق یہ ہے کہ ''پوڑی'' ایک غیر معمولی مصیبت، ناگہانی آفت اور حادثہ کے سلسلے میں مالی امداد ہوتی ہے۔ یہاں ضرورت مند کو امداد حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے گھروں میں جانا پڑتا ہے۔ جبکہ بجار والی امداد قبیلے کے لوگ خود لاتے ہیں۔ یہ عام روٹین اور معمول کی امداد ہوتی ہے، جو معاشرے میں عام رواج کے مطابق جاری وساری رہتی ہے۔

گو کہ پوڑی بھی غیر رواجی بات نہیں ہوتی لیکن اُسے اتنا اچھا فعل نہیں سمجھتا جاتا۔ بہت مجبوری میں ایک شریف انسان امداد کی اپیل کے ساتھ لوگوں کے گھروں کا رخ کرتا ہے۔

وس پنڑ

یہ بھی امدادِ باہمی کا زبردست ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ ایسی ناگمان حالت جو ایک فرد کی پہنچ سے باہر ہوتی تو لوگ اس کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس کی مدد کرتے۔ مثلاً شادی کا خرچہ، خون بہا ادا کرنا، تباہی یا جرمانہ وغیرہ۔

حوالہ جات

1۔ باؤلزگرڈن ٹی۔ دی پیپل آف ایشیا۔ 1977ء، وفلیڈ اینڈ نکلسن لندن، صفحہ 93

2۔ سبی گزٹیئر، صفحہ نمبر 148

3۔ ناصر عسکری/ غوث بخش صابر، سیستان وبلوچستان، 1996 بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ صفحہ نمبر 38

4- سبی گزٹیئر۔ صفحہ 304

5- بگٹی، عزیز۔ بگٹی قبیلہ۔ 2005۔ قلات پبلشرز کوئٹہ۔ صفحہ 101

6- میسن، چارلس۔ Narratives of various journeys in Afghanistan Balochistan, Kalat۔ جلد چہارم۔ 1977ء۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ صفحہ 425

بلوچ زراعت

عمومی منظر نامہ

بیالوجیکل ضرورت کے اعتبار سے دیکھیں تو ہم بھی زمین پر دوسری مخلوق کی طرح ہی ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا بھی سب سے بڑا روزانہ کا مسئلہ، اپنا پیٹ بھرنا ہے۔

مگر ہم دیگر مخلوق کی طرح محض جنگلی فروٹ کھانے یا شکار کرنے والے ہی نہ رہے بلکہ ہم نے خود کو بہت ڈویلپ کیا۔ شروع میں تو ہم نے خوراک سٹور کرنے کا کام کر کے خود کو سوائے چیونٹی کے بقیہ سارے جانداروں سے بلند کر دیا۔ اگلی اور بہت بڑی ارتقائی چھلانگ انسان نے یہ لگائی کہ اپنی خوراک خود پیدا کرنے کا بندوبست کرلیا۔۔۔ یہ بندوبست کاشتکاری کے ذریعے کیا گیا۔

زراعت انسانی تاریخ میں ایک زبردست موڑ اور بہت بڑا انقلاب ثابت ہوا۔ یعنی یہ فطرت میں بڑے پیمانے پر انسانی مداخلت تھی۔ اس کے نتیجے میں اولین بار زائد خوراک دستیاب ہوئی اور شہر اور سولائزیشن وجود میں آئے۔ یہ اولین موقع تھا کہ اب خوراک کا اہم حصہ گوشت نہیں، بلکہ اناج (گندم، چاول، جوار، باجرہ وغیرہ) بنا۔ اناج کو زندگی کا خمیر بنا کر، انسان اُس کی ورائٹی اور تعداد بڑھاتا رہا اور انہیں اپنے اپنے علاقے کی زمین اور ماحول کے مطابق ڈھالتا رہا۔

اور جب زمین کم سخی ہو اور پانی کم ہو، تو ہم زندہ رہنے کے لیے زمین سے زیادہ کچھ نچوڑ نکالنے کی حیرت انگیز کاوشوں کے اہل ہیں۔ آج ترقی یافتہ صنعتی دور میں بھی انسانوں کا نصف حصہ زمین پر کام کرتا ہے۔

ہماری پسماندگی کے سبب کاشتکاری میں انسان کے لیے بھاری مشقت کے علاوہ بے رحم دکھ ہیں، پریشانیاں ہیں، بے عزتیاں ہیں اور غم ہیں۔ سارے گھرانے کے افراد کاشتکاری کا کام کرتے ہیں۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ جس کھیت پہ اچھا کام نہ کیا ہوا ہو اور جس میں اچھی کھاد نہ دی گئی ہو تو اس کی پیداوار بہت کم ہوگی۔ اسی طرح ایک بہت زیادہ کاشت کی گئی اور تھک چکی زمین کسان اور اس کے خاندان کو نہیں پال سکتی۔ چنانچہ یہ کسان، امیر کسان کا دیوالیہ شدہ مقروض بن جاتا ہے۔ اُسے اپنی محنت کے لیے ایسی دستاویزوں پر دستخط کرنے پہ مجبور کیا جاتا ہے جس کے تحت اپنے قرض کی ادائیگی تک اُسے مشقت کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ وہ اُس شخص کا ایک طرح کا کرایہ کا مزدور بن جاتا ہے جس نے اُسے اناج یا پیسہ قرض دیا تھا۔ حقیقت میں وہ محض نام کا آزاد فرد رہ جاتا ہے اس لیے کہ وہ تو خود اپنا اور اپنی فیملی کا پیٹ پالنے کے لیے دوسروں کے لیے چوبیس گھنٹے کرائے کا مزدور بن جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی کرائے کے مزدور سے بہتر نہیں ہوتی۔ وہ سوکھی روٹی کھاتا ہے اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں۔ مسلسل کم خوراکی اُس کی توانائی نچوڑ لیتی ہے۔ بھوک، اُس کی زندگی کی ایک نارمل صورت ٹھہرتی ہے۔ بھوک ایک سپر پاور ہوتی ہے جو مکمل تباہی، کم خوراکی والی بیماریوں اور اموات پر منتج ہو جاتی ہے۔

اس صورت حال کو سیاسی معیشت میں serfdom کہتے ہیں۔ بلوچوں میں اب تو زراعت واحد معیشت نہ رہی مگر جب تک یہ ہماری روٹی روزی کے حصول کا سرچشمہ تھی، زراعت میں یہی کچھ ہوتا تھا۔

یہاں گھر کے سارے افراد بیج بونے، زمین تیار کرنے، فصل کو مویشیوں اور پرندوں سے محفوظ کرنے، فصل اٹھانے اور اسے لے جا کر محفوظ کرنے کے سارے کاموں میں کسی نہ کسی صورت کام کرتے تھے۔ عورت بھی یہاں کام کرتی تھی۔ مگر مرد کسان کی طرح عورت کسان کے لیے بھی کچھ اضافی کام بھی تھے، جہاں اس کو مدد دینے والا کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ غلہ صاف کرنا، غلے کی پسائی، آٹا چھاننا، کپڑے دھونا، سلائی کڑھائی، رضائی سلائی، دائی گیری، بیماروں کی نرسنگ، دریخ وڈیتی (پشم کاتنا)، قالین اور دری بافی، مرغیوں کی پرورش، بیل، گھوڑے اور گدھے کا باندھنا کھولنا،

مویشی کے بچوں کی دیکھ بھال، پیش (مزری) لانا اور خوبصورت ڈیزائن والی ششکان چٹائی بننا اور لوغاڑ (لمبی لمبی) رسیاں بنانا، گھر کی دیواروں اور چھتوں کا سنبھالنا اور خیمے کے سوراخوں کی سلائی، ہینز (لسی بنانے کی کھال)، مشک، اپان (آٹا رکھنے والے چمڑے کی تھیلی) اور زنک (دیسی گھی رکھنے والی کھال) بنانا، کال (کپڑے دھونے والے صابن جیسی چیز) تیار کرنا اور ِگل (برتن بنانے والی چکنی مٹی) ڈھونا، میٹ (گاچی) اور ہالہا (ابال کر کھانے والی سبزی) چن کر لانا...... یہ سارے کام صرف اور صرف عورت کے اضافی کام ہوتے ہیں۔

بیج تیار کرنا بھی اس کا کام ہے۔ وہ بوائی کے وقت مرد کا کھانا تیار کرتی ہے، کھیت پر لے جا کر اسے پہنچاتی ہے، ہیٹ (خید) کاٹتی ہے، فصل کی رکھوالی کرتی ہے، چاٹ وکا نبھاڑیں (پرندے بھگانے کے لیے استعمال ہونے والے رسّے) اور ''ہتو ہیت'' چلاّ چلاّ کر فصل پر سے پرندے اڑاتی رہتی ہے۔ وہ پالتو مویشی کی خدمت گزاری کرتی ہے، گانال (سبز گندم) اور ٹانڈا (جوار) کاٹتی ہے اور جس وقت فصل پک جاتی ہے تو وہ کٹائی میں خاندان کے ساتھ کام کرتی ہے۔ اناج کو زاغ (بھوسے سے صاف کردہ گندم) کرنے میں مدد دیتی ہے اور اُس وقت تک Whole Timer کی حیثیت سے کام کرتی ہے جب تک کہ اناج اور بھوسہ بنڈ ووں (چٹائی سے بنے اناج سٹور کرنے کے بڑے بڑے کمرے) اور کمروں میں رکھی نہ جائے۔ گوالغ (پشم سے بنی بوری کی طرح)، سند، کندری (چٹائی کی چھوٹی تھیلی) اور گُنج (بیل پہ بھوسہ ڈھونے والی چٹائی کی بہت بڑی بوری جسے بیل سے ڈھوتے ہیں) اور بنڈو (سال بھر کیلئے غلہ ذخیرہ کرنے کی چٹائی سے بنائی گئی کوہلی) بُننا بھی خالصتاً عورت کے (اور اضافی) کام ہیں۔

خشکابے کا کسان بارشوں کا محتاج ہوتا ہے۔ بارشیں ہیں تو روزی کا کچھ آسرا رہتا ہے۔ بارشیں نہیں تو مستقبل تاریک۔

اور بارشیں تو خود ایک ہنگامی حالت لاتی ہیں۔ سیلابی منہ زور پانی۔ کسان دو گھنٹے میں یا تو اُس کی وحشت کو کنٹرول کرتے ہوئے اپنی بندات بھرنے ہیں۔ وگرنہ بند اگر ٹوٹ جائے یا نالے کی مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب پانی وافر مقدار میں بند میں نہ آئے تو پھر سال بھر پورے

خاندان کے لیے بھوک پکی۔

اسی طرح کسان کے لیے دوسرا بڑا کام بارش کے سیلابی پانی سے عطا کردہ اس نمی (رتیج) کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ دوبارہ بارش پتہ نہیں کب برسے، جو نمی میسر ہے اُسے سورج کی تپش اور چلتی ہواؤں سے بچایا جائے ڈھانپ دیا جائے۔ چنانچہ اُسے بہت سے دیسی طریقے استعمال کرنے پڑتے ہیں تا کہ بوآئی کے موسم تک یہ نمی زیر زمین موجود رہے۔ بیج وقت پر بونا بذاتِ خود ایک فوری فریضہ ہے۔ آپ یہ کام نہ جلدی کر سکتے ہیں نہ ہی اِسے التوا میں رکھ سکتے ہیں۔ یہی کام فصل پکنے کے وقت کٹائی کرنے، اناج اور بھوسہ الگ کرنے، اور اناج کو سٹور کرنے کے وقت ہوتا ہے۔ بارانی کاشتکاری کا قانون ہے کہ سارا وقت فارغ رہو اور پھر اچانک ہنگامی حالت میں کام کرو۔

زیادہ تر گاؤں نہ صرف کاشتکاری میں مصروف ہوتے ہیں بلکہ اُس کام میں بھی جُتے ہوتے ہیں جسے کاٹیج انڈسٹری کہتے ہیں۔ مشینیں تو ہیں نہیں لہٰذا، مرد بھی، مگر زیادہ تر عورتیں گھر میں ہاتھ والے کام کرتی ہیں اور پیداوار کا ایک حصہ ایک درمیان والے خریدار آدمی کو بیچا جاتا ہے۔ کاٹیج انڈسٹریز میں مختلف قسم کا کام ہوتا ہے: ٹوپیاں سینے، ٹوپیاں بنانے، رِلیاں بنانے، بالخصوص ِگل اور گارے سے گھڑے صراحی، دیگ، دیگچہ جیسے برتن بنانے، مویشیوں (اونٹ، بھیڑ، اور بکری) کے پشم کو دھاگہ بنا کر اس سے بے شمار مصنوعات بنانے۔ اس کے علاوہ پیش اور کھجور کے پتوں سے رسی بنا کر یا اُس پیش سے دیگر بے شمار اشیا بنائے جاتے ہیں۔ مویشیوں کی کچی کھالوں کو مختلف دیسی کیمکلز کے پراسیس سے گزار کر ان سے بے شمار گھریلو اور دیگر مصنوعات بنائے جاتے ہیں۔ بالخصوص دلکش، آرام دہ اور دیرپا بلوچی جوتے بنائے جاتے ہیں۔ چاقو چھری بنانے، ڈھاڈر میں دیسی بندقیں بنانے، میخ اور کیل بنانے، ریڑھی کا پہیہ بنانے، تالہ سازی اور بہت سے دیگر کام۔

ایک خاص گھریلو صنعت کے ساتھ، عورتوں اور بچوں کے ساتھ ایک دستکار کے پورے خاندان کی شمولیت عمومی بات ہے۔ بچے پانچ سے آٹھ سال کی عمر سے کام شروع کرتے ہیں۔ نفیس ترین سلائی کڑھائی کرنا جس میں لباس، پوشیں، ٹوپیاں اور جھالر سلائی اسی گھریلو صنعت کا ایک نمونہ ہے۔ عورتیں بہت بھاری کام بھی کرتی ہیں جیسے کہ چکنی مٹی گوندھنا، پشم کو کوٹنا۔

کاٹیج انڈسٹری سے آمدنی البتہ بہت کم ہوتی ہے۔ وقت بہت استعمال ہوتا ہے۔ یہ بہت مہارت اور باریکی کا کام ہوتا ہے۔ مگر اجرتیں، قیمتیں بے حد کم اور محنت کا استعمال حد سے زیادہ۔

اس ساری محنت میں پانچ چھ سال کی عمر کے بچے جُتے ہوتے ہیں۔ اور چائلڈ لیبر کرنے پر انھیں مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی گھر کے مرد بھی فارغ ہوکر (فراغت کہاں نصیب ہوتی ہے) اس کاٹیج انڈسٹری میں عورتوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ البتہ بہت کم لیکن کچھ جگہوں پر بالخصوص کشید کاری (واسکٹ ٹوپی وغیرہ) کا کام مرد بھی ہول ٹائمر کے بطور کرتے ہیں۔

چو(Chav)، پلاسی، گھوڑی کا تنگ، دُم چین، جھلّ وٹپر اور اسی طرح جنج (سینے پہ بنی کشیدہ کاری) آستین، ٹوپی، ازار بند، بندوق کا بند اور نڑ کا جَل (یعنی پوش) اور دیگر کشیدہ کاری اور باریک دوزی عورتوں کے فن اور مہارت کے خوبصورت نمونے ہیں۔ کچھ مرد بھی اس آرٹ میں ماہر ہیں اور نہایت باریک کام کرتے ہیں۔ مناسب مارکٹنگ ہوتی تو گھوڑی کے تیرغ (توبرا) سے لے کر تمباکو کی خوبصورت کشیدہ کی ہوئی تھیلی تک بلوچ کے رنگ اور ڈک (کشیدہ) کا انتخاب دنیا کی قوموں کے اندر ہماری پہچان بن جائے۔ اس کشیدہ کاری (دوش) کی بہت ساری اقسام ہیں:

* مرگ پانچ (پرندے کا پاؤں) نامی کشیدہ کی اپنی پھر پانچ قسمیں ہیں۔ یہ قمیص، شلوار کے علاوہ اب پلنگ پوش، سرہانہ اور میز پوش پر بھی کی جاتی ہے۔
* کانٹک نال قمیص شلوار کے علاوہ دوپٹے پر بھی کی جاتی ہے۔
* کپک نال ایک رنگ میں کر کے اس کے اندر سات رنگوں سے بھرائی کی جاتی ہے۔
* پَوَڑ مشرقی بلوچستان کا دوش ہے۔ یہ کالے دھاگے سے ہوتی ہے۔ جس میں دس بارہ رنگوں سے بھرائی کی جاتی ہے۔
* باقی بلوچ، نامی کشیدہ کاری مشہور بلوچ سیاست دان کے نام سے منسوب ہے۔
* اس کے علاوہ باغ و بہار، مرچک، مند بلوٗ پازیب، جاڑک اور بک گڈی بہت دلکش ورنگین کشیدہ کاریاں ہیں جن میں شیشہ بھی لگایا جاتا ہے۔ یہ بلوچ عورت کی مزدوری بھی ہے، تخلیق کاری بھی اور فنکاری بھی۔

بلوچ خوراک کی چیزوں میں اکثر اصطلاحات یہ ہیں: درگڑی، تافتی نغن، پوآ، تنوری، ذُرت و باجھری ڈوڈی، چوچی، کوکی، کاک، ستو، سالغ، کوہل، ڈلغ، ہیذ لوٗ آ ووٗ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے کام دلچسپ اور دلکش نہیں ہیں بلکہ یہ اس طرح کے کام ہیں کہ بقول لینن ''عورتیں گھریلو غلامی کے اندر گھر کی غلام بن جاتی ہیں، کچن کے اندر۔ اور یک وتنہا گھرداری کے سب سے گندی اور کمر توڑنے والی مشقت کے بے کار بوجھ تلے کراہ رہی ہیں''۔ گھریلو کام تو عورت کو غلام بنا ڈالتا ہے۔ وہ اپنی محنت، وحشیانہ طور پر غیر بارآور، گھٹیا، اعصاب شکن، دم گھونٹنے والے اور کمر توڑ ناگوار کام پر ضائع کرتی ہے۔ بلاشبہ اگر عورتیں نہ ہوں تو ہماری معیشت دو روز بھی نہ چلے۔

کام میں مرد عورت کی تقسیم ماقبل فیوڈل نظام کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ اب اس قدر پکی ہوگئی کہ یہ حالت ایک نارمل، ایک عام سی بات سمجھی جاتی ہے۔ بالخصوص مڈل کلاس گھرانوں میں دونوں افراد اپنے اپنے کام اور پوزیشن میں فکس ہو چکے ہیں۔ عورت خود بھی اپنے اوپر کام کے اس ناوڑو (حصے سے زیادہ بوجھ) کو اپنا استحقاق سمجھتی ہے۔ مرد اگر چاہے بھی تو اپنے کام کی عادت شدہ عورت خود ہی مرد کو گھریلو کام کرنے نہیں دیتی۔

اب تو ترقی یافتہ سرمایہ داری نظام میں نت نئی ایجادوں نے ایسی اشیا کے انبار لگا دیے گئے ہیں جہاں گھریلو کام بہت کم اور بہت آسان ہو چکا ہے۔ اب سوشلسٹ ممالک تو دو چار ہی رہ گئے ہیں۔ مگر جب سوویت یونین سالم سلامت تھا تو وہاں تو گھریلو کام تقریباً ختم ہی ہو چکے تھے۔ انھوں نے گھر کا کچن اور سلائی کڑھائی وغیرہ شوق کے وقت کے لیے چھوڑ رکھے تھے۔ اُس کی جگہ سماجی سروسز جاری کردی تھیں۔ محلّوں میں ہی سستے اور اچھے کھانوں کے ہوٹل تھے، پبلک دھوبی تھے، سستی سلائی کڑھائی کے ملبوسات مشینی تھے اور پبلک بھی۔

جیسے کہ معلوم ہے بلوچستان میں سبی سے لے کر گنداواہ تک کے چاکر و گوئہرام کی فیوڈل اناؤں کی وجہ سے ایک طویل جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ نے ایک بار پھر بلوچ آبادکاری اور مدنیت کاری کو تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ اور ایک بار پھر بلوچوں کو آباد سبی، زرعی سبی، شہری سبی ترک کرنا پڑا تھا، اور ایک بار پھر خانہ بدوشی اور مالداری والا نظام اپنانا پڑا تھا۔ بلوچوں کے ساتھ معاشی ارتقا

کی پوری تاریخ میں یہ مذاق بار بار کیا گیا۔ تاریخ میں بے شمار بار ہماری پیداواری قوتوں کی ہر ترقی کو جنگوں اور فتوحات نے پسپا کر دیا۔ چنانچہ ایک بار پھر ہم سر قبیلوی نظام کے حوالے ہو گئے تھے۔

جیسے کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ابتدائی قبائلی دور میں سردار کا منصب قبیلے کی جمہوری رضامندی پہ منحصر ہوتا تھا۔ اور گو کہ سردار کسی خاص انتخابی عمل سے نہیں گزرتا تھا مگر سردار بننے میں قبیلہ کی ایک طرح کی جمہوری منظوری بہر حال ضرور شامل ہوا کرتی تھی۔ غیر موزوں شخص پر عدم اعتماد بھی ہوتا تھا مگر اُس کی جگہ پھر کوشش ہوتی تھی کہ اُسی خاندان میں سے کوئی دوسرا مناسب شخص مل جائے۔

چوں کہ جدل و جنگ ہی سیاست و ثقافت ہوتی تھی، اس لیے معیشت کے اس ذریعے کو دوام بخشنے کا اہل آدمی ہی سردار بن سکتا تھا۔ داخلہ وخارجہ پالیسیاں اسی فریم ورک میں بنتی بگڑتی تھیں۔ رسم و رواج، اچھائی برائی، سب کچھ اسی گز سے ناپی جاتی تھیں۔ سردار کے اختیارات، اور اس کی قوت کی کمی بیشی بھی جنگی صورتحال کے مطابق ہوا کرتی تھی۔ ادب، شاعری، آرٹ، فلسفہ، نظریہ اور فکر سب کچھ فتوحات کو یقینی بنانے کے واحد مقصد کی طرف متوجہ تھے۔ ہمارا سماجی اور انتظامی ڈھانچہ اسی لپکنے اور جھپٹنے کی مطابقت میں استوار تھا۔ ہماری یہی قبیلوی تشکیلات جو کہ جنگی اصول پر شروع ہوئی تھیں، بعد میں حاکم گروہ کی تقویت کا باعث بنتی گئیں۔ اس حاکم گروہ کا سیاسی اور اقتصادی اقتدار بڑھتا رہا اور وہ مرکزیت پاتا رہا۔ جس کی وجہ سے اس کے مویشیوں کے ریوڑ بڑھتے رہے اور غلاموں اور قبضہ میں آئے ہوئے لوگوں پر اس کا استحصال بڑھتا رہا۔ دولت مند ہوتے ہوئے سردار، بہترین اور وسیع چراگاہوں کو اپنے قبضے میں لیتے رہے۔ رفتہ رفتہ قبیلوں کی چھوٹی اور کمزور شاخوں کی زمینوں کا ایک حصہ عملاً فیوڈل (سردار) کی ملکیت بن گیا۔

خانہ بدوش فرقوں کی چراگاہوں کے ساتھ بھی یہی کارروائی ہوتی رہی۔ بہت اچھی اور پانی کے لحاظ سے فراواں چراگاہیں خود بخود سردار کے حصے میں جاتیں اور ان چراگاہوں پر بے چارے خانہ بدوش اُن سرداروں کے چرواہے بن کر اُن کی بھیڑ بکریاں چرانے لگتے تھے۔

سردار (فیوڈل) کے اقتدار کی مضبوطی کے سبب ایسے حالات پیدا ہوئے کہ چھوٹے طائفے مجبور ہوئے کہ اپنے دائمی جھگڑوں کے حالات میں بڑے قبیلوں کی پناہ میں جائیں۔ اور،

میزبان قبیلہ ایسے طائفوں پر شرائط لگا کر انھیں اپنی حمایت عطا کرتا تھا۔ شرائط یہ ہوتی تھیں: قبیلے کے مشترک کاموں اور امور میں حصہ لینا، سردار کی طرف سے منظّم کردہ حملوں اور جنگوں میں شرکت کرنا، اور میزبان قبیلے میں رشتے داریاں کرنا۔

بلوچستان میں لوگ جن زمینوں پر قبضہ کرتے وہ عموماً پہلے سے زیرکاشت ہوا کرتی تھیں۔ وہ سابقہ مالکان کو بھگا دیتے یا پھر قتل کر دیتے۔ قبضہ کردہ اِس زمین کو وہ قبیلوں اور پھر قبیلوں کے فرقوں کے گھرانوں کے درمیان تقسیم کرتے تھے۔ ہم یہاں مری قبیلے کی مثال پیش کرتے ہیں۔ جس کی قبضہ کردہ زمینیں مندرجہ ذیل طریقے پر تقسیم ہوتی تھیں؛

چیف کا پنچک (پانچواں حصہ) پہلے الگ کر دیا جاتا تھا۔ باقی کو تین مساوی حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یعنی گزینی، لوہارانی اور بجارانی میں۔ ہر ایک کو 'سیک' (1/3) حصہ کہا جاتا تھا۔ پھر ہر سیک کی اندرونی تقسیم یوں ہوتی تھی؛

گزینی:

1-ٹینگیانڑیں، بڈانڑیں......ایک حصہ

2-مہندانڑیں، چلگری، اور، ژِنگ......ایک حصہ

3-لانگھانڑیں، عالیانڑیں اور مزارانڑیں......ایک حصہ

4-نوذبندغانڑیں، چُوری، مہکانڑیں اور لوڑی گُش......ایک حصہ

5-بھاولاں زئی، مرگیانڑیں، عیسفانڑیں اور جروار......ایک حصہ

لوھارانڑیں:

1-مہمدانڑیں، جنگوانڑیں......ایک حصہ

2-شمبوانڑیں......ایک حصہ

3-سارنگانڑیں، جنڈوانڑیں، درکانڑیں اور میلوھڑ......دو حصے

بجارانڑیں:

1-پوادی اور کنگرانڑیں......ایک حصہ

2- شاہیجہ اورکلوانڑیں......ایک حصہ

3- کلندرانڑیں، سالارانڑیں، سومرانڑیں، پیردادانڑیں اوررامکانڑیں......تین حصے

رفتہ رفتہ اوپر والی صورت بہت سست رفتاری سے تبدیل ہوتی رہی۔ پندرھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک بلوچ سماج ایک ایسی تبدیلی سے گزرا جس میں کہ زراعت مشترک قبائلی صورت کی بجائے شخصی ملکیت میں جاتی رہی اور قبیلوں کے حاکم لوگ اب سردار سے ہوتے ہوئے فیوڈل لارڈز میں ڈھلتے گئے۔ بلوچ خانہ بدوش قبیلوں کی زمین پہ آبادکاری کا عمل سولہویں صدی کے آخر تک تقریباً تقریباً مکمل ہوااور زرعی معیشت متشکل ہونے لگی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خانہ بدوشی یکسر ختم ہوئی۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ زمین پر آباد ہونے والوں میں بھی، اور مالداری میں مشغول بلوچوں میں بھی، خانہ بدوشی جاری تھی۔

قلات میں تیرہویں صدی کے وسط تک مغلوں کے نائب حکومت چلاتے رہے۔ 1666ء میں میرواڑی قبیلے کے فیوڈل اُن کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اوران کے گیریزن تباہ کر کے قلات پر قابض ہو گئے۔ اس قبیلے کے بڑے فیوڈل (میراحمد) نے اقتدار سنبھال لیا اور یہاں احمدزئیوں کی حکومت قائم کی۔

میراحمد ثانی (1637-1629) کے زمانے میں زراعت کو ترقی دینے میں خصوصی دلچسپی لی گئی۔ قلات میں کاریزات کو ترقی ہوئی۔ خضدار کی ندی سے کئی نالے نکال کر پانی کو بنجر زمینوں تک پہنچایا گیا۔ موضع کوہنگ قلات میں کاریز ملاورد، کاریز یوسف اور کاریز عثمان کھدوائے گئے۔

اِسی خان کے دورحکومت میں خشکابہ اراضیات کے حق مالکانہ پر مالک اور کاشتکاروں کے درمیان ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا کہ اراضی کی آمدن سے فیوڈل کو کتنا حصہ ملے اور کسان کو کتنا۔ سرداروں کے ساتھ مل کر بلوچوں کے اس بڑے خان نے خشکابہ بندات کی آبادکاری کے چھ حصے مقرر کر دیے۔ ایک حصہ آب، ایک حصہ دیکھ بحال بند، ایک حصہ تخم، ایک حصہ ہل، ایک نگرانی اور

ایک حصہ حق مالکانہ۔ چونکہ بندات کی کاشت میں پانی دینا، بندوں کی دیکھ بھال، تخم ریزی، ہل چلانا اور فصل کی نگرانی یہ سارے پانچوں کام کسان کے تھے، اس لیے پانچ حصے اس کے تھے اور مالک مفت میں ایک حصہ لیتا تھا جسے انہوں نے حق مالکانہ قرار دیا تھا۔ اسی کو بدنام زمانہ ''ششک'' کہتے ہیں۔ اِس ششک کی مختلف علاقوں اورمختلف تاریخ ادوار میں شکلیں بدلتی رہیں۔

اٹھارویں صدی تک بلوچ قبیلوی شکل کی چوکھاٹ کے اندر ایک فیوڈل معاشرہ تشکیل پا گیا جہاں اپنے چیف کی عظمت وشان کی خاطر ہزاروں لوگ دیہی مزدور بن گئے تاکہ زائد پیداوار کرسکیں۔ قبیلے کا ایک فرقہ پورے قبیلے کے لیے ہمیشہ سردار مہیا کرتے رہنے کا گھرانہ بن گیا۔ اس فرقے کا ایک شخص تو سردار ہوتا ہی تھا مگر اس کے عزیز واقارب بھی حکمران ہوتے تھے۔ وہ سردار کے لیے ٹیکس، عطیات اور ریونیو اکٹھا کرتے تھے۔ اس طرح انتظامی بالائی ڈھانچہ کی اجارہ داری بن گئی۔ اسی انتظامی بالائی ڈھانچہ نے قبائلی طرز پیداوار سے فیوڈل نظامِ پیداوار کی طرف عبور کی نگرانی کی۔ گوکہ عبور کی یہ رفتار بہت سست تھی، اوراس سفر میں بار بار رکاوٹیں کھڑی ہوتی تھیں۔

اٹھارویں صدی کے پہلے حصے میں نادر شاہ اور پھر احمد شاہ نے بلوچستان پر (اور یا بلوچستان میں سے ہوکر) کئی مہمات سر کیں، جن کے نتیجے میں دور دور تک اُن کی سلطنت قائم ہوئی۔

1740ء میں کچھی اور سیوی کا پانچ ہزار میل کا علاقہ قلات کا ہو گیا۔ یہ گویا ایک انقلاب تھا۔ اب زرعی اجناس کی صورت میں قلات کو زبردست آمدن حاصل ہوتی رہی اور خانی بہت مضبوط ہوتی گئی۔ کچھی میں دریاؤں پر بند باندھ لیے جاتے تھے۔ جبکہ خود قلات میں سیلابی نالوں کے علاوہ کاریز آبپاشی کے بڑے ذرائع تھے۔

کچھی میں کئی فصلیں کاشت ہوتی تھیں۔ کپاس، دالیں اور تیل کا بیج سیلابی زمینوں پر کاشت ہوتے تھے۔ جبکہ کپاس، نیل، گندم، جوار اور میوہ وسبزیاں محدود مستقل پانی والے علاقوں میں ہوتی تھیں۔ مختلف علاقوں میں تقسیمِ کار اور تقسیمِ پیداوار بہت پیچیدہ اور مختلف ہوا کرتی تھی۔ عموماً کسان بیج بھی دیتا تھا، ایک بیل کا جوڑا بھی اور جانوروں کی غذا بھی۔ کلات کے خانی والی فیوڈل ریاست کے اندر فصل کی پیداوار تین حصوں میں یعنی فرماں روا، زمین کے مالک اور کسان میں تقسیم ہوتی تھی۔

اس محنت طلب نظام آبپاشی نے ہر گاؤں کو ایک اجتماعی پیداواری یونٹ بنا دیا تھا۔اس کی بنیاد پر اناج کی تقسیم (بٹائی) ہوتی تھی۔ جہاں بڑے بڑے حصے تو حاکم لوگوں، مالکوں اور کاشتکار کے ہوتے تھے مگر آبپاشی کے خرچ کا حصہ، ریونیو حکام کا حصہ اور گاؤں کے سپیشلسٹوں کا حصہ بھی الگ کیا جاتا تھا۔حاکم لوگ فصل میں سے اپنا حصہ پہلے لیتے تھے۔اس طرح انتظامیہ اور آبپاشی کا خرچہ گاؤں والوں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

واضح رہے کہ کچھی نے خانی کو قبائلی کی بہ نسبت ایک فیوڈل سلطنت کی طرف دھکیلنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

دراصل 17 صدی کے آخری نصف سے جب بلوچوں کے میر احمد نے کنفیڈریسی کی بنیاد رکھی تھی تو بلوچ سماج میں ایک سیاسی تشخص وجود میں آ گیا تھا۔اس طرح قبیلوی ارسٹوکریسی کے عنصر نے بڑھنا شروع کر دیا۔قبیلوی قدیم ڈیموکریسی کمزور ہوتی گئی اور اس کی جگہ پر سرداری اور فیوڈل نظام مستحکم ہوتا گیا۔بلوچ سماج میں فیوڈل نظام کی عظیم الشان بلوغت نے سارے بلوچ عوام کو ناترسی کے ساتھ دولت پیدا کرنے پر لگا دیا۔میر احمد خان کے نواسے نصیر خان کو دولت کے اسی ارتکاز نے زبردست حاکم بنوایا۔اسی دولت پر ایسی ہی فیوڈل ریاست ابھرنی تھی۔اُس نے احمد شاہ کے ساتھ مل کر ہندوستان فتح کر لیا اور بلوچستان کو خوب ''ترقی'' دی۔

خانی کے عہد میں (1666-1840ء) قلات ایک شورش زدہ خطے اور ہند پہ پے در پے فتوحات کے ذریعے مہاجر کردہ لوگوں کے لیے جائے پناہ کی حیثیت والا ملک نہ رہا بلکہ ترقی کر کے ایک مؤثر آزاد خانی سلطنت میں ڈھل گیا۔اس عبور میں ایک ایسی مقامی ارسٹوکریسی شامل تھی جس کی معاشی بنیاد بڑھتی ہوئی زراعت تھی مگر جس کے نمایاں ہونے کے ذرائع قبائلی طور پر منظّم کردہ خانہ بدوش مویشی بانی پر مبنی تھے۔اس دور میں خانوں اور سرداروں کے درمیان رشتہ بہت ہی ڈھیلا ڈھالا اور کمزور تھا۔

نصیر خان کی حکمرانی دراصل ایک فیوڈل انقلاب کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ عہد بہت شاندار تو تھا مگر ایک فیوڈل طریقے سے شاندار تھا۔ یہ حکمرانی بلوچ معاشرے کی قبائلی تنظیم کی چوٹی پر

کھڑی تھی جس میں زرعی غلامی (سرف) اور منقولہ جائیداد کی طرح منقولہ غلامی پہلے ہی سے مروج تھیں۔نصیر خان کی فتوحات نے بلوچستان میں غلامی کی دوسری شکلیں بھی متعارف کرا دیں۔

واضح رہے کہ مویشی بانی کی طرح، غلامی بھی پورے بلوچستان میں عام تھی اور کوئی بھی ایسا قابل ذکر خاندان نہ تھا جس کے پاس غلام مرد یا عورت نہ ہوں۔ یہ غلام عام طور پر شیدی یا نیگرو ہوتے تھے جنھیں ساحلی شہر کراچی سے خریدا جاتا تھا۔

اِس دور میں اجناس کی پیداوار بہت وسعت پا گئی۔کپاس، نیل اور گھی کی پیداوار خوب بڑھی۔تجارت کو زبردست فروغ ملا۔بحر ہند کی کئی بندرگاہیں اور تجارتی راہیں قلات اور وہاں سے کندہار تک کھل گئیں۔گویا ہندوستان اور وسطی ایشیا کے درمیان قلات کی حیثیت ایک تجارتی مرکز کی ہو گئی تھی۔سونمیانی کی بندرگاہ تجارتی و صنعتی مرکز تھی۔خصوصاً کپڑے اور قالین کی پیداوار میں۔ بلوچستان سے گھوڑے بمبئی کو برآمد کیے جاتے تھے۔رنگ کا سامان اور چمڑے کا سامان مسقط برآمد ہوتے تھے۔ہندو تاجر کاروانوں کی شکل میں تجارت کرتے تھے۔ اشیا سے قیمت فروخت کا 0.5 فیصد کے حساب سے چُنگی لیا جاتا تھا۔شاہراہیں استعمال کرنے پر کاروانوں سے پانچ روپیہ فی اونٹ کے حساب سے محصول وصول کیا جاتا تھا۔

بلوچستان میں ایک ترقی یافتہ زرعی کلچر قائم ہو چکا۔نیز پڑوسی سندھ و پنجاب کے علاقوں میں بھی زراعت اچھی خاصی ترقی یافتہ تھی۔ یہ ترقی یافتہ زرعی کلچر بلوچستان کی اجتماعی معیشت کی تیز رفتار ترقی اور فیوڈلزم کے فروغ کے پراسیس میں تیز رفتاری کا باعث بنا۔میدانی علاقوں میں آباد بلوچ قبائل رفتہ رفتہ اپنی قبائلی خصوصیات کھونے لگے۔ یہاں طاقتور سرداروں نے اپنے ہی قبیلے کے لوگوں کو عملاً کسان غلام بنا کر رکھ دیا۔وہ یوں کہ:

1- سردار کا گھر یا اوطاق کمانڈر انچیف کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

2- وہ قبائلی جھگڑوں کی مصالحت بھی کرتا تھا۔

3- وہ چیف جسٹس بھی تھا۔جج بن کر وہ تنازعات کے فیصلے کرتا تھا۔

ان تین عہدوں نے پھر، اور بھی بے شمار عہدے اُس کے ہاتھ میں مرکوز کر دیے:

4- قبیلے کے اجتماعات کا بندوبست وہی کرتا تھا ۔ ان کی بورڈنگ، لاجنگ اور اُن کے خوردونوش کے بندوبست کا انچارج سردار ہی تھا۔

5- قبیلے کے مہمان خانہ کے اخراجات کے نام پر قبیلہ کے افراد اُسے زرخیز زمین کے علاوہ ٹیکس یا امداد بھی دیتے تھے۔

6- قبیلے کی وزارت خزانہ کا قلمدان بھی اسی کے پاس تھا۔ مال مویشی، آٹا، غلہ، بار برداری کے جانور، بہترین گھوڑے اور لہٰذا بہترین اسلحہ اُسے ملنے لگا۔

چوں کہ ''جنگی ادارہ'' اور مختلف النوع فرائض ادا کرنے والا ''سردار کا ادارہ'' ایک مستقل اور مرکوز حیثیت کا حامل بن چکا تھا، اس لیے شروع شروع میں جو چندہ رضا کارانہ طور پر دیا جاتا تھا وہ رفتہ رفتہ ٹیکس کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ یہ ٹیکس باقاعدہ بنتا گیا اور بڑھتا بھی گیا۔ ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہنگامی چندے کی گنجائش الگ سے موجود تھی ۔ چوں کہ یہ سارا عمل شروع میں جبری نہ تھا اور قبائل کی مشترکہ ضرورت کا نتیجہ تھا، اس لیے یہ سارا چندہ رضا کارانہ بنیادوں پر عوام نے خود تجویز اور قبول کیا۔ انھی اوائلی دنوں میں سردار کے مذکورہ بالا اخراجات خصوصاً اناج کی ضرورت پوری کرنے کے لیے علاقے میں زرخیز ترین زمین کا ایک ٹکڑا سردار کے عہدے کے ساتھ مستقل طور پر مخصوص کیا گیا۔ سردار ''بہ لحاظ عہدہ'' اس کا مالک ہوا کرتا تھا۔ یہ زمین اس کے بھائیوں اور بیٹوں میں تقسیم ہونے کے لیے نہ تھی بلکہ آٹو میٹک طور پر سرداری کے عہدے کے ساتھ منتقل ہوا کرتی تھی ۔ یہ تاج یعنی دستار کی زمین (پاغ ءِ ڈغار) سرداری دستار کے ساتھ وابستہ ہوتی تھی۔ چلتے چلتے یہ رضا کاری نیم رضا میں تبدیل ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ یہ رضا، اور نیم رضا مکمل جبر میں ڈھل گئیں اور سردار کا عہدہ موروثی بنا اور لہٰذا ''پاغ کی زمین'' بھی موروثی بنی ۔ اب چندہ (بجار، پوڑی، گھال، سنگ، تنڑی وغیرہ وغیرہ) بھی مکمل طور پر ٹیکس میں بدل گئے ۔ سردار کے اختیارات بڑھتے گئے ۔ وہ قبیلے سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے لگا۔ اس نے عوام کے خرچ پر عمدہ گھوڑے، قیمتی قالین اور بہترین ہتھیار اور لباس خرید لیے۔ اپنی حویلی بنوائی ۔ مویشی اور اراضی کی صورت میں مختلف مراعات حاصل کر کے اس طبقے نے اپنی اقتصادی قوت خوب بڑھالی......اور یوں سردار مکمل طور پر ایک فیوڈل میں بدلتا چلا گیا۔

زراعت کی قسمیں

عمومی طور پر بلوچ آبپاشی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؛

1- (لڑآف) بارانی

2- (سیاہ آف) پانی والی زراعت

1- لُڑآف

لُڑآف (لُڑدآف) کا لفظی مطلب ہے، گدلا پانی۔ بارش کے موقعے پر ندی نالے طغیانی میں آجاتے ہیں لہذا پانی گدلا ہوتا ہے۔ اِس لُڑآف کا مطلب ہے، بارانی کھیتی باڑی۔

کچھ نہری ڈویژنوں اور ڈیم و ٹیوب ویل کی کاشتکاری کو چھوڑ کر تقریباً سارا بلوچستان بارانی کھیتی باڑی والا وطن ہے۔ بارانی علاقے میں سبی، نصیر آباد ڈویژن کے بہت سے علاقے، کچھی چاغی، ژوب، لورالائی، پشین، قلات، خضدار، مکران اور خاران کے زیادہ تر حصے شامل تھے۔ ان علاقوں میں سیلابی پانی سے کاشتکاری ہوتی ہے۔ اگر بارش نہیں ہوتی تو یہ سارا علاقہ خشک پڑا رہتا ہے۔

بارش کے وقت کی نمی (رتج) کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ تاکہ بوآئی اور فصل اگنے کے بعد جب بارشیں ہو جائیں اس وقت نمی ضائع نہ ہو جائے، کھیت میں دو تین بار ہل چلایا جاتا ہے۔ سول

پھر لیٹ پھر بوائی کا ہل۔اللہ اگر مہربان رہے، بخت اگر برابر رہے تو بارشیں برسیں گی اور بالآخر فصل جا کر تیار ہو جاتی ہے۔ہل مرد چلاتا ہے۔عورت بیج تیار کرتی ہے، گھر میں اناج پیسنے، کھانا پکانے کے علاوہ خاوند کا کھانا کھیت تک لے جاتی ہے۔نحید کاٹنا، فصل کی رکھوالی کرنا، کٹائی کرنا، خرمن کو تیار کرنے کا کام کرنا، غلہ اور بھوسے کو سنبھالنا...... یہ سارے کام پورا خاندان مل کر کرتا ہے۔

بارانی علاقوں کی اکثریت میں جس طرح کی کاشتکاری ہوسکتی تھی اور جس طرز کے پیداواری تعلقات تھے، ہم ان کا جائزہ ذرا تفصیل سے لیں گے۔

ایک بات تو یہ نوٹ کرنے کی ہے کہ بلوچستان میں کاشتکاری کے طور طریقے، اس میں استعمال ہونے والے اوزار اور زراعت سے متعلق اصطلاحات سنسکرت زبان والے ہیں۔پنجاب، سندھ اور دیگر پڑوسی زبانوں میں بھی یہی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔

بلوچستان میں ابھی ماضی قریب تک زمینیں مشترکہ ملکیت میں تھیں۔یہ زمینیں دس دس، یا قبیلے کی مشترکہ زمینیں تصور ہوتی تھیں۔تب زمین کی اگلی تقسیم کا وقت مقرر ہوتا۔تقسیم کے دن تک جتنے نرینہ بچے پیدا ہوتے، انھیں حصہ ملتا تھا۔اور مر جانے والے نرینہ لوگوں کے نام کاٹ دیے جاتے تھے۔ذیلی قبیلوں اور ان کی شاخوں اور حتیٰ کہ خاندان تک بالترتیب زمین تقسیم در تقسیم ہوتی چلی جاتی تھی۔زمین کی یہ عارضی تقسیم مردم شماری کے بجائے ''مرد شماری'' کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ ہر ایک حصہ ''ونڈ'' کہلاتا تھا۔یہ تقسیم قرعہ اندازی سے کی جاتی تھی۔شہروں والا قلم کاغذ تو نہیں ہوتا تھا۔اس لیے اپنی کمان سے تیر نکال کر ایک آدھ گواہ کی موجودگی میں اُس پہ مخصوص نشان بنایا جاتا تھا۔اس طرح کہ قرعہ انداز کو پتہ نہ چلتا کہ کون سا تیر کس کا ہے۔اسی حوالے سے ہر حصہ کو ونڈ، تیر یا کمان کہا جاتا تھا۔چونکہ یہ زمین مخصوص سالوں تک تقسیم ہو کر پھر پورے قبیلے کی ملکیت بن جاتی اس لیے یہ زمین نہ تو فروخت کی جا سکتی تھی اور نہ اسے رہن رکھا جا سکتا تھا۔

مست توکلی اپنے سماج میں اس ''صرف'' مرد شماری کے خلاف تھا۔اُس نے زندگی بھر عورت کے حصے کا بھی مطالبہ جاری رکھا۔اِسے وہ ''سمو راجہ ونڈ'' یعنی سمو کی صنف کا حصہ کہا کرتا تھا۔

بلوچوں میں زمین کی شاید آخری حتمی اور بڑے پیمانے کی تقسیم مری قبیلے میں مکمل

ہوگئی۔1964ء میں وہ میٹھی صبح آ گئی جب مری کے معتبرین اکٹھے ہوئے اور قبیلے نے اپنی مشترکہ زمین ہمیشہ کے لیے بانٹ دی۔یوں قدیم کمیونزم کی آخری نشانی مٹ گئی اور سماج کے آگے کی طرف ارتقا کی رکاوٹ دور ہوگئی۔

حتمی تقسیم کرنے کو ''بوٹا تروڑ'' یا ''بُٹوک'' کہتے ہیں۔

حتمی تقسیم کا مطلب تھا کہ امیری غریبی شروع ہوگئی۔امیروں اور قبیلوی سربراہوں کو یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے عام میلے کچیلے آدمی کی زمینیں پیسے، زور اور دغا سے اپنی بنالیں۔لیکن عوام کو Bi-Product کے طور یہ فائدہ ہوا کہ قدیم اشتراکیت ایک ارتقائی قدم کی طرف گئی، اور، پاک اور مقدس نجی ملکیت پہلی بار اچھی طرح طلوع ہوگئی۔''بوٹا تروڑ'' کی تقسیم اس عہد کو ظاہر کرتی ہے جب لوگ خانہ بدوشی کی زندگی سے ہٹ کر ''نیم آباد'' زندگی کو منتخب کرنے لگے۔

قدیم کمیونسٹ نظام ایک زبردست عہد تھا لیکن زمین کی مکمل اور ابدی تقسیم زراعت کی طرف زیادہ پراگریسو، زیادہ تیز رفتار اور زیادہ حسین زمانہ ہے۔

''قدیم'' کمیونسٹ عہد دنیا کے تقریباً ہر سماج پر آیا۔یہ کافی دیر تک رہا اور پھر ہر سماج جھپٹ کر ترقی کے راستے پر روانہ ہوا۔اس لیے کہ اب ماضی کے عہد کی کچھ پرانی اچھائیاں، برائیاں بن گئیں۔اب بہادر، غیرت مند، ہمدرد، اور سخی کی جگہ محنتی ہونا زیادہ باعث شرف سمجھا جانے لگا۔ٹکنالوجی ترتیب اور چستی زیادہ فائدہ مند بن گئیں۔امن و امان کا پلہ بھاری ہوگیا۔رفتہ رفتہ تقسیم سے ان علاقوں میں پٹواریوں کے ذریعے زمین ناپی جانے لگی اور اُس کی لکھا پڑھی کی گئی۔ڈاکیو منٹیشن تو ایک افضل اور اشرف انسانی عمل ہے، ترقی کی نشانی ہے۔

اس نظام میں ہر شخص آزاد ہے کہ چاہے تو اپنی زمین فروخت کرے، چاہے تو رہن رکھے اور چاہے تو کاشت کرے۔

مگر، قابلِ کاشت زمینیں خواہ بڑے میدانی علاقوں میں ہوں یا پہاڑوں کے اوپر چھوٹے چھوٹے ''تل'' کی صورت میں۔یہ دائمی پانی والی زمینیں ہوں یا سیلابی آبپاشی والی۔بلوچ اپنی اراضی سے بہت محبت کرتا ہے۔وہ اس کو فروخت کرنے کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

بلوچستان کے کچھ علاقوں میں ''لٹ بند'' والی زمینیں ہیں۔لٹ بندوالی زراعت کچھی اور وسطی بلوچستان کے بلوچوں میں موجود ہے۔ یہ ایسی زمین ہے کہ یہ ہے تو کسی کی ذاتی ملکیت مگر کوئی اور شخص اصل مالک کی رضا سے اُسے آباد کر لیتا ہے۔تب وہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ پرانا مالک اور نیا لٹ بند دونوں ہی زمین کے مالک تصور کیے جاتے ہیں۔ساری محنت لٹ بند کرتا ہے اور پیداوار پر عموماً چوتھائی یا پھر چھٹا حصہ پرانے مالک کو دیا جاتا ہے۔

بلوچوں میں ابھی تک کچھ علاقوں میں اراضی کے ٹکڑے ایسے ہیں جو مستقل (بُژوکی) طور پر تقسیم نہیں ہوئے۔ یہ زمینیں ابھی بھی مقرر کردہ سالوں کی بنیاد پر تقسیم کی جاتی ہیں۔اور ہر مالک اپنے ٹکڑے کو کاشت کرتا ہے،فصل اگاتا ہے مگر وہ نہ تو اس زمین کو بیچ سکتا ہے، نہ تبادلہ کر سکتا ہے اور نہ رہن رکھ سکتا ہے۔ جب یہ معینہ عرصہ پورا ہو جاتا ہے تو پھر نرینہ افراد کی تعداد پر یہ زمین تقسیم ہوتی ہے۔ بلوچوں میں مری علاقہ میں اس کی مثالیں منڈاہی ، نیساؤ اور ڈھل ہیں۔(اب یہ صورت ختم ہوتی جا رہی ہے)۔

ایک مزے کی بات یہ ہے کہ ''ہمساخ'' کو بھی زمین کا حصہ دیا جاتا تھا۔ ہمساخ مختلف وجوہات کی بنا پر اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسرے قبیلے کے نفع نقصان کو اپنا گرداننے والے کو کہتے تھے۔اس اصطلاح کے مفہوم کے تعین کے لیے فورٹ منزو میں ایک بڑے جرگے میں ایک خاص لائحہ عمل مقرر ہوا تھا۔اس کے تحت فیصلہ ہوا کہ ہمساخ وہ شخص ہے جو:

1- کوئی جرم کرنے کے سبب اپنا قبیلہ چھوڑ دے اور کسی دوسرے قبیلے میں پناہ اور دفاع مانگے۔

2- مہم پسندی کے بطور شخصی احساسات کی بنا پر اپنا طائفہ چھوڑ گیا ہو اور کسی دوسرے قبیلے میں دائمی زندگی گزارنے کا انتخاب کر چکا ہو۔

جن علاقوں میں زمین کے معین برسوں تک عارضی تقسیم ہوتی رہتی تھی، ہمساخ کو زمینیں دی جاتی تھیں۔

موسم اور بارشیں

بلوچستان متفرقات بھری سرزمین ہے۔اس کا زیادہ تر حصہ بارانی ہے۔ پہاڑوں پہ مشتمل اس خطے میں کچھ بہت اچھی زرخیز وادیاں اور میدان ہیں۔موسموں کی تفصیل بیان کرنے سے قبل ان کے اوقات کا ذکر بلوچی میں ضروری ہے:

زمستان (winter) نومبر سے فروری تک رہتا ہے۔

چیتر یا بہارگہ (spring) مارچ سے مئی تک۔

آہاڑ (summer) جون سے ستمبر۔

سہیل (autumn) ستمبر اکتوبر۔جنوری

موسم گرما کے سیلابوں کے لیے بارانی زمین تیار کی جاتی ہے۔ساونڑیں فصلوں کو گاہ لیا جاتا ہے اور اٹھا لیا جاتا ہے۔آبی زمینوں کی گندم کی فصلوں کو پانی دیا جاتا ہے۔

فروری۔(پگھنڑ)۔یہاں دن گرم ہوتے ہیں اور راتیں سرد ہوتی ہیں۔

مارچ۔(چیتر)۔آہاڑ کی فصلیں بوئی جاتی ہیں۔گندم کی فصل آبو ہو جاتی ہے۔

اپریل۔(ویساک) گندم کی کٹائی ہوتی ہے۔پالیز (خربوز تربوز) کی کاشت ہوتی ہے۔

مئی۔(جیٹھ)۔گندم کی فصل کی گاہ ہوتی ہے اور اٹھائی جاتی ہے۔

جون۔(آہاڑ)۔آہاڑی فصل کی کٹائی ہوتی ہے۔اگر اس ماہ سیلاب آجائیں تو ساونڑیں فصل کاشت ہوتے ہیں۔

جولائی۔(ساونڑ)۔تیزی سے ساونڑیں فصل کاشت ہوتے ہیں۔

اگست۔(بدرو)۔ساونڑیں فصلات کی کاشت اس ماہ کے وسط تک ہو جاتی ہے۔

ستمبر۔(اَسو)۔جوار باجرہ کی کٹائی ہوتی ہے۔

اکتوبر۔(کتی)۔سردیوں کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔

نومبر۔(منگھر)۔ساونڑیں تربوز ختم ہو جاتے ہیں۔

دسمبر(پوہ)۔گندم کی کاشت کا مہینہ۔

پورا بلوچستان گرمیوں میں سخت گرم ہے۔کہیں کہیں تو سبی کی مانند گرمی ہوتی ہے۔سرما بہت سرد موسم ہے۔خشک اور نمونیا میں مبتلا کر دینے والی سردی جو پانی کو بھی جما ڈالتی ہے۔

بلوچستان مجموعی طور پر بارشوں سے آباد ہے ۔ ہٹ دھرم بارشوں کا اصل موسم مشرقی بلوچستان میں مون سون ہے۔وہاں جولائی اگست بارشوں کے خزینے ہیں ۔مغربی اور وسطی بلوچستان میں موسم سرما میں بارش اور برف ہوتی ہے۔سال میں تقریباً 200 سے لے کر 400 ملی لیٹر بارش برستی ہے۔سردیوں میں لگا تار بارش (لسی) بھی بارانی علاقوں کو آباد کرتی ہے۔سردیوں کی بارشیں نومبر سے لے کر مارچ تک برستی ہیں ۔ بارانی زمینوں (لڑ آف) میں نالی (ربیع) اور سھیل (خریف) دونوں فصلیں ہوتی ہیں۔

ہماری گُل زمین سے بارش کا وصال ناممکن کی حد تک غیر یقینی ہے۔بارش تو اس بے باور محبوب کی مانند ہے جو چار چار، پانچ پانچ برس آوارہ گردی میں بھٹکتا رہا ہو۔گُل زمین کے ہونٹ خشک ،انتظار میں ڈوبی اور راہ تکتی پتھرائی ہوئی آنکھیں ۔اس پر سے درخت وسبزہ معدوم ہو جاتا ہے۔لوگ فاقہ کے بدمست ہاتھی کے خوف سے بھاگ کر سندھ کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں۔مستیں توکلی سے لے کر آج تک کی ساری بلوچی شاعری کا بہت بڑا حصہ اسی ابر و بارش کی منت وسماجت کی نذر کر دیا گیا۔

جب بادل آجاتے ہیں تو اس قدر دہشت زدہ کر دینے والی بارشیں بکھیر دیتے ہیں کہ برستے تھکتے ہی نہیں۔سردیوں میں ''لسی'' بن کر مستی کی فضا پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہیں۔ساون میں گرجنے کی دھاڑ اور بجلی کی تجلی بھری آنکھ مارنے کا تسلسل حیران کر دیتا ہے۔ چٹانوں سے پانی آبشار بن کر چھلانگیں مارتا رہتا ہے اور ندی نالے جیسے زندہ باد،مردہ باد کے جلوس بن جاتے ہوں۔ بھری ہوئی بندات کی چمک اور پہاڑ کی بڑی چٹانوں کی اوٹ میں بکریوں کی پناہ گیری، کسانوں کے کہی اور کُوچی ، یہ سب بلوچوں کے بشام کی نشانیاں ہیں۔جو نہ تو اس پانی کے آگے بند باندھ کر اسے اپنے کام میں لا سکے ہیں اور نہ اس پانی کے نکاس کے لئے راستہ بنا سکے ہیں۔یہ منہ زور پانی زمین کو پھاڑتے ہوئے پہاڑی نالوں میں شریر بچوں کی طرح موڑ کھاتے ہوئے ،مست اونٹ کی

طرح جھاگ اڑاتے ہوئے سبی ، کچھی اور سندھ کو کبھی سیراب اور کبھی غرقاب کیے سمندر میں جا ملتا ہے۔بلوچ کے کسان کی قسمت میں مگر وہی فاقے ، وہی قحط۔۔۔۔ہم سرابوں کی دنیا میں دھکیل دی گئی مخلوق ہیں۔

سراب کو بلوچی میں ''ڈومبہ آف'' کہتے ہیں ۔یہ گرمیوں میں میدان میں دور دور تک آئینہ جیسی سطح ہے جو زمین پر بچھی ہوئی ملتی ہے۔یہ دور سے پانی کی ایک وسیع جھیل لگتی ہے۔اس کی وجہ سرد فضا کی طرف سے مزاحمت میں دیکھی جاتی ہے جو حد سے زیادہ گرم زمین کی معمولی نمی کے اٹھنے سے ملتی ہے۔یہ پانی کی طرح عکسوں کو الٹا کرتا ہے۔

ڈومب بلوچی میں میراثی کو کہتے ہیں۔روایت مشہور ہے کہ ایک ڈومب کہیں سفر پر جا رہا تھا۔بلوچستان کی گرمیاں اور کم آبی کے پیشِ نظر اس نے چھوٹا مشکیزہ پانی سے بھر کر ساتھ لیا۔مگر دوپہر ہوتے ہوتے وسیع میدان میں سے گزرتے ہوئے اسے دور سے پورا میدان پانی سے بھرا نظر آیا۔درختوں جھاڑیوں کے عکس تک پانی میں نظر آئے۔اس ڈومب نے اس سراب کو پانی جانا اور یہ تصور کر لیا کہ ضرور اس علاقے میں حال ہی میں بارش ہوئی ہوگی۔پانی کی یہ بہتات دیکھ کر اس نے اپنے مشکیزے کا سارا پانی گرا دیا کہ یہ بوجھ اس کے کندھوں پر غیر ضروری ہو گیا تھا۔مگر وہ جوں جوں آگے بڑھتا، پانی دور ہوتا جاتا۔سخت گرمی، پیاس اور دور ہوتا پانی ۔۔۔۔بالآخر وہ ڈومب پیاس کی موت مر گیا۔اسی وجہ سے سراب کو ''ڈومبءِ آف'' یعنی ڈومب کا پانی کہتے ہیں۔

بلوچستان درختوں اور جنگلات کے لحاظ سے کچھ زیادہ امیر علاقہ نہیں ہے ۔مشرقی بلوچستان میں پانی کی کمی کے باعث درخت کانٹے دار (چغرد،کلیر،کور،کھیر،پیر،کنر) یا پھر گز اور شنز ہیں۔گز کا درخت زیادہ تر ندی نالوں کے کناروں پر ہوتا ہے۔یہ زیادہ تر ایندھن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔گز کی بھی بے شمار قسمیں ہیں۔مری قبیلے کا سردار گھرانہ گزینی سے ہے جو عام روایت کے بطور گز کے درخت سے منسوب ہے۔

بارشوں کی صورت میں گھاس خوب اگتی ہے۔مری تمبیل ، میں سونڈ ، بانبور اور جاندران میں جنگلی انار بھی ہوتے ہیں۔تدڑی، رسترانی اور منجھرا دلکش مناظر پیش کرتے ہیں۔پہاڑوں

کے درمیان میدانی علاقوں میں گنجیں کوہلو ہے، مست کا کاہان ہے اور کیــچھیــں ماوند ہے۔ ان علاقوں میں گندم، جوار، باجرہ، اور ماش کی کاشت ہوتی ہے۔ ٹوکری، چٹائی اور رسے رسیاں بنانے والا پیش (مزری) ہوتی ہے۔ جہاں کہیں مستقل پانی دستیاب ہے، وہاں پھل اور سبزیاں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔

بلوچستان کی زمین زبردست ہے۔ اسے پانی میسر ہو تو اس کی زرخیزی کا ثانی نہیں ہوتا۔ پانی جو زندگانی کے لیے ناگزیر ہے۔ پانی زندگی کا میڈیم ہے، کہ یہ سورج کی روشنی سے بھی اہم ہے۔ انسان نے آج تک کے اپنے علم، تجربہ اور چھان پھٹک سے یہ بات ثابت کردی ہے کہ بھیڑ کے گلے کی مدھر گھنٹی وہیں بجی ہے جہاں پانی کا قطرہ دستیاب ہوا۔ جہاں نمی ہوئی مرغ وہیں بول دیا، گدھا وہیں ڈھینچوں کر گیا، اور فراق و وصل کی بانسری وہیں بجی۔

بارش کی تمنا میں ہم عجیب عجیب کام کرتے ہیں۔ مثلاً جب بارش کافی سال نہیں ہوتی اور ڈکال (قحط) پڑ جاتا ہے تو اپنے مرشد کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دھوپ میں ڈالتے ہیں اور اس کے گڑ گڑانے پر کہیں بارش کی دیوی کو ترس آتا ہے۔ ڈینس برے نے ''سنس آف انڈیا'' کے صفحہ نمبر 65 میں لکھا کہ وسطی بلوچستان کے لوگوں نے بارش برسانے کا کام خان کو سونپا ہے: ''خان اپنے سفید کپڑے اتارتا ہے اور کسانوں والا پشمینہ پوستین پہنتا ہے، کسی کھیت میں ہل چلاتا ہے تو بارش ہو جاتی ہے۔ مگر کئی بار وہ صبح سے رات تک ہل چلاتا رہتا ہے مگر بارش نہیں ہوتی۔'' (بے پیر بارش!)۔

بادلوں کے لیے سارا سال آنکھیں آسمان پر ٹکی رہتی ہیں۔ مگر بارش ترساتی رہتی ہے اور ناگہاں ایک روز (یا ایک رات) بادل برستا ہے تو ہر پہاڑ یکدم پانی قے کرتا جاتا ہے۔ بارش کا سیلابی پانی تو کاشتکار کے لیے ایک منٹ کا جوا ہوتا ہے۔ ادھر یا اُدھر۔ پانی کھیت میں روک دیا تو وارے نیارے، اور اگر پانی کھیت توڑ کر باہر نکلا اور ضائع ہو گیا تو کسان کے مقدر میں بھوک سمجھو پکّی ہو گئی۔ اگر اس پانی کی اچھی طرح سے آبپاشی کی جائے تو سارے بندات بھر جاتے ہیں۔ بصورت دیگر یہ سمجھیں کہ بھرے ہوئے خورجین میں سوراخ ہو گیا ہو۔ ساری محنت رائیگاں، حاجت مند کا دامن خالی رہ جاتا ہے۔ اچھے کاشتکار پہلے سے تیاری کرتے ہیں۔ بارشوں کے موسم

میں درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر گٹھے بناتے ہیں اور بندات کے لٹھ پر رکھ دیتے ہیں۔ اپنے کہی اور بیلچے تیار رکھتے ہیں۔ لالٹین کا ''وٹ'' اور ''گھاسلیٹ'' برابر رکھتے ہیں تاکہ جس وقت بارش نامی ''دشمن'' کا حملہ ہو تو اس کا جنگی استقبال آسان ہو۔ جنگ کی طرح ہانپتے ہوئے، سردی سے کانپتے ہوئے، دھوتی پہنے، گُوچی (چٹائی سے بنی ہوئی بارش سے بچنے والی بوری) پہنے ہوئے جھپٹ کر اپنے بندات پر جانا ہوتا ہے۔ اور پانی ضائع ہونے نہ دینے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی جاتی ہے۔

بارش کے بعد چونکہ سیلابی پانی، پانی تقسیم کا نظام الٹ پلٹ کر کے رکھ دیتا ہے اس لیے وہاں اگلے ہی دن منصف آجاتے ہیں اور دوبارہ پانی کو منصفانہ انداز میں بانٹنے کی ثالثی کرتے ہیں۔ اسی لیے تو پانی تقسیم پر جھگڑا، لڑائی اور فساد ہر بارش کے ساتھی ہوتے ہیں۔

زرعی سائنس دان کہتے ہیں کہ ایک سیر گندم کی کاشت کے لیے ایک ہزار پونڈ ''نصف ٹن'' پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک انچ بارش سے ایک ایکڑ پر ایک سو دس ٹن پانی ملتا ہے؟ اگر یہ حساب ہمارے کاشتکار کے پاس ہو اور بارشوں کا اندازہ لگایا جا سکے، اور بلوچستان بھر میں برسنے والی بارش کے سارے پانی کو ایک منصوبہ اور ترتیب کے ساتھ استعمال میں لایا جائے تو پتہ نہیں کتنے لاکھ ٹن گندم پیدا ہو۔ مگر منصوبہ بندی کہاں جب آپ سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ نتھی ہو گئے۔ ایڈہاک ازم زندہ باد۔ گرجتے بادلوں کے برسنے کے باوجود ہمارے کھیت پانی کے لیے ترستے ہیں۔ ہمارے مال مویشی اور انسانوں کی آنکھیں میٹھے پانی کے جوہڑ کو ترستی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری ساری شاعری، ساری کہانیاں، ضرب الامثال اور مجلس بارش کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ ہمارے آدمیوں کے نام نوذو ہیں، ہوران، بشام اور ساونڑ ہیں۔ نوخاف، نوذبندغ، امریز اور نوذہان ہیں۔ ہمارے علاقوں کے نام ساڑتاف، سیاہ آف، سورآف، گندغیں آف اور شیرین آف ہیں۔ آف، آف کر کے مر جانا ہے۔

شفع

شفع، کے دعوے بلوچستان میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ سرکاری شفع اور ہے اور شرعی شفعہ اور ہے۔ مگر بلوچ کا شفعہ جدا بھی ہے، پیچیدہ بھی اور لڑائی جھگڑا

اورکش بہ گیرکی ایک بہت بڑی وجہ بھی۔بس دعا کریں کہ کوئی اراضی نہ خریدے،اراضی کا سودا نہ ہو اوراراضی لب چٹی (جرمانے) کےعوض لی دی نہ جائے۔شفعہ لگ جائے یا نہیں مگر لوکل عدالت اور کھینچا تانی ضروری ہوتی ہے۔زمین کی خرید وفروخت کے 9 ماہ کے اندر اندر اگر شفعہ کی بات کی تو ٹھیک،ورنہ اگر لیٹ ہوگئے تو کوئی آپ کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ہاں اگر شفعہ کرنے والا علاقے میں موجود نہ ہوتو 11 ماہ کے اندر اندر اسے نوٹس دینے کی رعایت ہے۔

چرّک

زمین جب پانی سے بھر جائے تو زائد پانی نچلے یا اگلے بند یا کھیت کو دیا جاتا ہے۔سیر شدہ کھیت سے زائد اِس پانی کو چرک کہتے ہیں۔یعنی چکر کاٹ کر آنے والا پانی،کھیت بھرنے کے بعد اُس کے آخری کنارے سے نکل جانے والا پانی۔ زمین فروخت آپ ہر ایک کو نہیں کر سکتے ۔ پہلا حقِ شفعہ لوڑ اور چرک (کھانے) والے آدمی کا ہوتا ہے ۔ اگر وہ شفعہ نہ کریں تب اوپر کے ملحقہ کھیت کے مالک کا حق ہے کہ شفعہ کرے اور زمین کی قیمت دے کر زمین اپنی کر لے۔ اگر وہ بھی شفعہ نہ کرے تو اوپر کے بازو کا مالک خود کو شفعہ کے لیے تیار رکھتا ہے۔اگر وہ بھی نہ کرے تو بائیں بازو کے پڑوسی ہمت کریں گے۔ یہ شفعہ اُس وقت جائز نہ ہوگا اگر درمیان میں ندی پڑ جائے ، یا آدمی کے قد سے بلند پہاڑی ہو۔

مختصر یہ کہ یہ غیرت کا کام ہے کہ باہر والے آدمی کو اپنے اندر نہ چھوڑا جائے۔شفع کر کے زمین واپس لینے کی روایتیں بندشیں اس قدر سخت ہوتی ہیں کہ آدمی جا کر دوسروں کے گھر بیٹھتا ہے، بھیگ مانگتا ہے،قرض لیتا ہے اور اُس زمین پر شفعہ کر کے اُسے اپنے لیے خرید لیتا ہے۔قبائلی نظام کو برقرار رکھنے والوں نے سارے انتظامات کر رکھے ہیں جہاں کوئی سوراخ،کوئی دراڑ رہ نہ جائے۔لیکن لوحِ محفوظ کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے ۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے آلات سرقبیلوی نظام کے کنکریٹ کی ہر سخت و مضبوط دیوار میں اپنی کرامت سے اچانک بڑے بڑے سرنگ بنا ڈالتے ہیں اور اپنے رواج مروج کر دیتے ہیں۔سرمایہ تو اس قدر برگزیدہ ہے کہ وہ ذات،قبیلہ،رنگ،نسل اور عقیدہ سے بہت بلند ہوتا ہے۔یہ کوئی سرحد،کوئی باؤنڈری نہیں مانتا،کسی کی بڑائی اور عظمت کو تسلیم نہیں کرتا۔

2۔لُڑآف کی زراعت میں پیداواری رشتے

کسان اور فیوڈل

سرف ڈم (serfdom)۔بلوچستان کی لڑآف زراعت میں کسی کا کسان بننے کے معاہدہ کی شرائط کسان کے لیے بہت ناروا اور غیر انسانی ہوتی ہیں۔معاہدہ کے وقت فیوڈل اُسے کچھ رقم (آٹھ یا دس ہزار روپیہ) بطور قرض دیتا ہے۔معاہدے کے مطابق فصل اٹھاتے وقت کسان کے حصے سے فیوڈل کا قرض چکانا ضروری ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ قرض ادا کرنے کے بعد کسان اور اس کے کنبے کے کھانے کے لیے کچھ غلہ نہیں بچتا۔اس لیے وہ فیوڈل کی منت سماجت کرتا ہے اور اپنے حصے کا کچھ غلہ اپنے گھر لاتا ہے۔تین چار ماہ بعد یہ غلہ ختم ہو جاتا ہے،اُس لیے وہ پھر مالک کے پاس جا کر قرض لیتا ہے۔اس کی ادائیگی پھر فصل کے وقت ہونی ہوتی ہے۔وہاں بھی پورا قرض نہیں چکتا۔ لہٰذا اس کا کسان ہونا دوام پاتا جاتا ہے ۔ بزگری اور مقروضی ،اس کی قسمت کی پکی لکیر بن جاتی ہے۔ اس دوران بیماری،شادی بیاہ،غم ، جرمانہ یا خیرات وغیرہ کرنا ہو تو وہ پھر جا کر قرض لیتا ہے، پھر فصل اٹھانے کے وقت منت سماجت!۔یہ شیطانی سلسلہ زندگی بھر چلتا رہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس دوران کسان،اگر اُس زمین مالک کی زمین چھوڑنا چاہے تو وہ ایسا کر نہیں سکتا۔زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ دوسرا کوئی فیوڈل تلاش کرے جو اپنی جیب سے اُس کا سابقہ قرض ادا کرے اور دو تین ہزار مزید کسان کو دے تا کہ اس کا گزارہ ہو سکے۔اس طرح کسان کو اب اس نئے فیوڈل کی محنت مشقت کرنی پڑتی ہے۔دوسرے لفظوں میں کسان اپنے مالک کی شکل و صورت تو بدل سکتا ہے مگر ’’آزاد‘‘ نہیں رہ پاتا۔بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہم عوام بطور ووٹر اپنے لیڈر تو بدل سکتے ہیں مگر خود اپنی ووٹر والی اپنی حیثیت بدل نہیں سکتے۔

فیوڈل اور کسان کے درمیان پیداوار اِن باتوں پر تقسیم ہوتی ہے کہ زمین کس کی ہے، بیل کس کے ہیں،اور محنت کون کتنی کرتا ہے؟

زکواۃ خیرات، اور پیر کا حصہ مشترکہ خرمن سے نکلتا ہے۔

ہمارے ہاں کسان (راہک) اپنے مالک (بھوتار) کے ہاتھوں مندرجہ ذیل انداز میں استحصال ہوتا ہے:

ششک: سردار زمین کا چھٹا حصہ الگ لے جاتا تھا۔ اور اس کے بعد قبائلیوں کی بقیہ زمین کی پیداوار سے بھی چھٹا حصہ لے جاتا تھا۔

اس کی ایک اور قسم بھی ہے۔ زمین کا مالک زمین کے علاوہ کسان کو کوئی اور سہولت، کوئی اور چیز نہیں دیتا...... نہ بیل، نہ ہل، نہ خرچ۔ اور پیداوار کا چھٹا حصہ لے جاتا ہے۔ اس کا فائدہ کسان کو البتہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کی فصل کاشت کرتا ہے اور اس سلسلہ میں فیوڈل کی مداخلت سے آزاد ہوتا ہے۔ زیادہ تر اس کسان کو نکالا بھی نہیں جاتا اور تبدیل بھی نہیں کیا جا سکتا۔

چیارک: یہاں بیل فیوڈل کے ہوتے ہیں۔ کسان کو سال کی دونوں فصلیں کاشت کرنی ہوتی ہیں۔ غلہ اور بھوسہ و دیگر پیداواروں کا چوتھا حصہ کسان کا ہے۔ کسان تخم نہیں دیتا۔ ھشر، گوئٹ اور گیلی مٹی پر اخراجات کا چوتھائی اسے دینا پڑتا ہے۔ وہ دست و بازو کا کام کرتا ہے۔ (خرمن کا غلہ صاف کرتا ہے، کٹائی کرتا ہے، ہل چلاتا ہے)۔

سیک: بیل یہاں بھی فیوڈل کے ہیں لیکن کسانوں کو یہ بیل اپنے گھر رکھنے پڑتے ہیں اور انہیں کھلانا پڑتا ہے۔ بیج بھی فیوڈل دیتا ہے۔ ہر پیداوار کا تیسرا حصہ کسان کا ہوتا ہے۔

نصف: یہاں بیلوں کا جوڑا کسان کا ہوتا ہے۔ تخم فیوڈل اور کسان کو برابر برابر دینا ہوتا ہے۔ محنت کسان کی ہوتی ہے۔ آمدن اور خرچ آدھوآدھ ہوتی ہے۔ فیوڈلزم کی یہ شکل غیر حاضر فیوڈل کی زمینوں پر ہوتی ہے۔

مالک کا تہائی حصہ: ہاں زمین مالک کی ہوتی ہے۔ باقی ساری محنت اور اخراجات کسان کو کرنے پڑتے ہیں۔ تخم اور دیگر خرچہ سارا کسان کا۔

بوھروئی: زمین فیوڈل کی ہے۔ وہ اُسے کسان کو دیتا ہے۔ کسان جانے زمین جانے۔ شرط یہ ہے کہ کسان سال کا ایک معین مقدار غلہ اسے دے گا۔

پتی: یہاں کسان بقیہ زمین پر تو معاہدے کی شرائط کے مطابق بزگری کرتا ہے مگر کسی ایک کھیت، (یا کسی ایک بند) کی ساری فصل کسان اپنے فیوڈل کو تحفہ میں دیتا ہے۔

کندھوئی: کسان کسی سے بیل لاتا ہے، سال تک اُسے استعمال کرتا ہے۔ اس کا معاوضہ وہ ایک خاص متعین مقدار میں غلہ کی صورت میں دیتا ہے۔ یہ غلہ پیداوار کی مقدار سے بندھا ہوا نہیں ہوتا۔

روزانہ اجرت: بلوچستان بھر میں کیش کراپس یعنی نقد آور فصلوں کی کاشت کا رواج بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ان فصلوں میں پیاز، سبزیاں، تمباکو، چارہ، میوے اور کپاس شامل ہیں۔ نقد آور زراعت میں روزانہ اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح زراعت میں مشینوں کے استعمال سے بھی ان مشینوں سے وابستہ مزدوروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ انہیں بھی روزانہ مزدوری ملتی ہے۔

موروثی کسان: وسطی بلوچستان میں البتہ لوگ موروثی کسان ہوتے ہیں۔ ایسی زمین جس کے لیے کسانوں کے پاس ایک مخصوص وقت تک کے حقوق ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ بالخصوص بارانی علاقوں (مستنگ، قلات، خضدار اور خاران اضلاع) میں عام ہے۔ موروثی کسانی کے حقوق کو عموماً بیچا اور کسی اور کو کرایہ پر دیا کیا جا سکتا ہے۔ اگر بیچا جائے تو لازم ہے کہ کسانی کے حقوق پہلے زمین کے مالک کو پیش کیے جائیں۔ اسی طرح اگر زمین کا مالک زمین کو فروخت کرے تو پہلی پیشکش اُس موروثی کسان کو دی جائے۔

*****

امدادِ باھمی (ھشر، مشر، واھر)

لفظ ''ہشر'' قدیم بلوچی لفظ ہے۔(1) یہ صرف ہمارے علاقے میں استعمال ہوتا ہے۔ بلوچوں کے دیگر پڑوسی اقوام اس لفظ کے معانی اور اس کی وسعت سے واقف ہیں۔

اس لفظ کی بھی بے شمار صورتیں، شکلیں ہیں۔ یہ لفظ اصل میں زمین کے تقسیم ہونے اور نجی ملکیت میں جانے کے بعد کا لفظ ہے۔ مطلب ہے: زرعی زمین پر وہ بڑے کام جو ایک شخص یا دو تین افراد سے نہیں ہو سکتے تھے۔

ابتدائی زمانے میں مزدوری کا رواج بھی نہ تھا اور نہ مزدور کو اجرت دینے کے لیے کرنسی مروج تھی۔ صرف ایک صورت تھی، اور وہ یہ کہ کام کرنے والے افراد جمع ہو جاتے اور مل کر اُس ضرورت مند آدمی کی کھیت پر مطلوبہ کام سرانجام دیتے، کھانا کھاتے اور واپس اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ بعینہ آئندہ کسی دوسرے کاشتکار کو ضرورت پڑتی تو ایسا ہی ہوتا۔ قدیم انسانی سماج کے بارے میں آج کی علمی تحقیق اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ ان کا ماحول انہیں اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ وہ امدادِ باہمی کے تحت ایک دوسرے کی مدد کریں۔

تاریخ میں زوراک دوم توران کا اعلیٰ امیر گزرا ہے جس نے اپنی امارت کے وقت ہشر کو رواج دیا تھا۔ اہم اور بہت بڑے بڑے کام اس رواج کی وجہ سے بہت جلد تکمیل کو پہنچے۔ اس کے نتیجے میں سرزمین تُوران کے ایک سرے سے دوسرے سے تک دشتوں میں لا تعداد بند آبہ تعمیر ہوئے۔ ''ایسا کام جو لوگوں کی بڑی تعداد مل کر امدادِ باہمی کے بطور سرانجام دے اسے ہشر کہا جاتا ہے''۔(2) مثلاً کاشتکاری، گھر اور مکان کی تعمیر، راستہ اور سڑک کی مرمت۔ مختصر یہ کہ جس وقت بہت سے مرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اپنے کسی مشترکہ کام کے لیے یا ایک شخص کے کام کے لیے، وہ ہشر ہے۔

زمین کا مالک صرف انہیں اور ان کے جانوروں کو اُس ٹائم کا کھانا اور چارہ دیتا تھا۔ دکھ، تکلیف، جرمانہ، ناگمان، بیماری تو ہر کسی پر آسکتے ہیں۔ آج اِس کی باری ہے تو کل اُس کی۔ آج تم پہ آئی ہے کل مجھ پر آسکتی ہے۔ اس لیے ہر کوئی جا کر اپنا کندھا دیتا تا کہ آج اس کا کام آسان ہو جائے تو کل خود اس کا اپنا بار ہلکا ہو جائے گا۔ واھر اور ہشر اس لیے لازم ہیں۔

ہشر سندھ میں بھی ہوتا ہے اور پنجاب میں بھی۔ سندھ میں اسے ''ونگار'' کہتے ہیں۔ کچھ پشتون اسے پگاڑا کہتے ہیں۔ مگر صوبہ سرحد اور افغانستان میں اسے ہشر ہی کہتے ہیں۔ ازبکستان میں بھی اس مشترکہ محنت کا نام ہشر رہا ہے۔ سوویت یونین نے اُسے ''سبوتنک'' کا نام دے رکھا تھا۔

آج کل بلوچ عموماً ہشر کو صرف زراعت تک محدود کرتے ہیں۔ وہ ہل یا کین چلانے کے رضا کارانہ، بلا معاوضہ، اور اجتماعی کام کو ہشر کہتے ہیں۔ ہشر کے لیے بیلوں کا جوڑا بھی بھیجا جاتا ہے، اور ہل چلانے والا آدمی بھی۔ ہل چلانے والا یہ آدمی مالک خود بھی ہو سکتا ہے اور اس کا بزگر

(راہک) بھی۔

ہشر میں کام کرنے والوں کو ''ہشری'' کہتے ہیں۔ جس آدمی نے اپنے کھیت میں ہشر سے کام کرانا ہوتا ہے، وہ ایک دو روز قبل ہشر کے دن کی درخواست نما اطلاع ہشریوں کو دیتا ہے اور اُن سے شرکت کا اصرار کرتا ہے۔ وہ کام کی نوعیت اور حد بتاتا ہے اور بیلوں کے جوڑے سمیت ہشری کو ''مانگتا'' ہے۔ اگر کین کا کام ہو تو کین اور ہل دونوں لے جانے پڑتے ہیں۔ اگر صرف ہل کا کام ہے تو صرف ہل لے جانا ہوتا ہے۔ اس کام میں کوئی منت اور احسان نہیں ہے۔ یہ امدادِ باہمی کا کام ہے۔ ہر ایک روایتاً مانگتا ہے اور ہر ایک روایتاً جانے پر تیار ہو جاتا ہے۔

اگر ہشری کم از کم سات افراد ہیں تو مالک ایک دنبہ (کم از کم) ان کے لیے ذبح کرتا ہے۔ اگر سات افراد سے زیادہ ہوں تو دو، یا تین۔ یا افراد کے تناسب سے اس سے بھی زیادہ دنبے لازماً ذبح کرنے پڑتے ہیں۔ ہشر کی بات جب بھی ہوتی ہے تو بلوچ کے منہ میں پانی آجاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے آدھے گز کی سیخ نما وہ چھڑی آجاتی ہے جس پر آخر تک اُبلا ہوا گوشت پرویا ہوتا ہے۔ گوشت کے ابلے ہوئے خوبصورت اور موٹے موٹے ٹکڑے، کلیجی کے ٹکڑے، چربی کی چکیاں...... ہر کسان اس پروئے ہوئے گوشت کی لڑی کو ہاتھ میں لٹکائے ہوئے نمائش کے طور پر نمایاں کرتا ہوا چلا جاتا ہے اپنے گھر کی طرف۔

ول ڈورانٹ نے لکھا کہ '' ہمارے اندر لالچ، حرص اور لڑاکا پن، اس خاطر ہے کہ ہمارے ذہن میں ان ہزاروں لاکھوں سالوں کی یاد داشت موجود ہے جب ہمارے آباؤ اجداد کو زندہ رہنے کے لیے دوڑ، بھاگ، لڑائی، اور مار دھاڑ لازماً کرنا پڑتی تھی۔ وہ اس خوف کے سبب اپنا پیٹ حد سے زیادہ بھرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ اگلا شکار جلد نہ ملے اور بھوک سے مرنا نہ پڑے۔''(3)

بات خواہ آباؤ اجداد کی مشکل زندگانی اور خوراک کی نایابی کی ہو یا آج کے استحصالی سماج میں خوراک کی غیر مساوی تقسیم کی ہو، یا پھر کسان کی طرف سے گوشت کو لڑی میں پرو کر سرعام نمائش کرنے کی شوبازی ہو، مگر سچی بات یہ ہے کہ جب بھی سیخ پر پروئے ہوئے گوشت کے ساتھ کوئی کسان گزرے تو دل کہتا ہے کہ اگر بس چلتا تو جھپٹ کر گوشت کی دو تین بوٹیاں سیخ سے توڑ کر نگل جاؤں۔ بعد میں

دیکھا جائے گا کہ کسان لاٹھی مارتا ہے یا پتھر۔

گوشت کو سیخ میں لگا کر گھر کی طرف لے جانے کا رواج بلوچوں میں الگ الگ ہے۔ حالاں کہ وہ کھانے کے وقت وہیں کھیت پر کھانا تو پیٹ بھر کر کھاتا ہے۔مگر اس کے باوجود مثلاً مری میں بجارانی گوشت گھر لے جاتا ہے۔لوہارانی اور گزینی گوشت گھر نہیں لے جاتے۔ بلکہ وہاں ہشر کا مالک گوشت لاتا ہے اور پاتار (چٹائی) کے اوپر سجا کر رکھ دیتا ہے۔اور سارے ہشری، معاہدے کے مطابق پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔انہیں پیٹ بھر کر کھانا لازمی ہوتا ہے۔ جب ڈکار مار کر ہشری روانہ ہو جاتے ہیں تو باقی بچا ہوا گوشت مالک کا ہوتا ہے۔اُس روز کسان (ہشری) روٹی اور سالن کو منہ بھی نہیں لگاتے۔مگر بجارانی میں چونکہ گوشت گھر لے جانا ہوتا ہے اس لیے کسان زور دیتا ہے تریت کی تھالی پر۔اور اپنا گوشت کا حصہ کھیت پر نہیں کھاتا بلکہ گھر لے جاتا ہے۔ہشر کا تریت اس لیے زبردست ہوتا ہے کہ اس میں سالن سے بھرے تھال میں روٹی ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھانے سے قبل ڈال دی جاتی ہے اور اس کے اوپر چینی یا گڑ چھڑکا جاتا ہے۔

گوشت کے حصہ داروں میں دو افراد کا اضافہ کر کے اسے برابر بانٹ دیا جاتا ہے۔ایک فرد تو کھیت کا مالک ہوتا ہے، دوسری مالکن۔ باقی سارا گوشت ہشریوں کا۔ ذبح کیے ہوئے مویشیوں کی کھال بھوتار (مالک) کی ہوتی ہے۔ باقی پائے سے لے کر اوجھری تک سب وہیں تقسیم ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہیں چھوڑنا ہوتا۔ایک سے زیادہ مویشی ذبح کرنے کی صورت میں ہر مویشی پر ایک اضافی حصہ (بھوتار) کا ہوتا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ گوشت ہشری کے علاوہ کوئی اور نہیں کھاتا، نہ ہی کسی اور کو دیا جاتا ہے۔اگر آپ کسی کو کھلانا چاہیں بھی تو اسے رواجاً انکار کرنا ہوتا ہے۔ (جو کام کرے وہی کھائے!)۔کسان جب اپنا حصہ (سیخ پر لٹکائے ہوئے) گھر لاتا ہے تو آدھا حصہ خود رکھتا ہے اور آدھا بیلوں کے مالک یعنی اپنے مالک کو (جس کا وہ بزگر ہوتا ہے) بھیج دیتا ہے۔(بیلوں کا یہ بدبخت حصہ ہشر کے گوشت سے لے کر فصل کی پیداوار تک بزگر کو اپنے مالک کو دینا ہوتا ہے۔وہ بے چارہ اپنی محنت کا پھل مکمل طور پر اس لیے نہیں رکھ سکتا کہ نہ ذرائع پیداوار (زمین) اُس کی اپنی ہوتی ہے اور نہ آلاتِ پیداوار یعنی بیل ہل وغیرہ اس کے اپنے ہوتے ہیں)۔

یہ تو تھا اس کھانے کا حصہ جو کام کے ختم کرنے پر دیا جاتا ہے۔رات کا کھانا کوئی نہیں دیتا۔صبح (ناشتہ) کھانے کے لیے (سالن وغیرہ) مہیا کرنا پڑتا ہے ہشر کے مالک کو۔ جب کہ روٹی وہ ہشر میں حصہ لینے والے کسانوں کے گھروں سے اکٹھی کر کے لاتا ہے۔دوپہر کی روٹی اور سالن مالک کو مہیا کرنا ہوتا ہے۔کسانوں کو تھوڑی دیر تک آرام دلانے کے لیے آئے ہوئے متبادل افراد کو بھی دوپہر کا کھانا مالک ہی دیتا ہے۔ بیلوں کا چارہ موسم کی مناسبت سے ہوتا ہے۔اگر ہشر ایک ایسے موسم میں ہو رہا ہو کہ سبز چارہ کھیت پر میسر ہے تو کھانے کے وقفے کے دوران بیلوں کو بھی چارہ دیتا ہے مالک۔ناشتہ ظاہر ہے کہ جانور نہیں کھاتے صرف ہشری یہ عیاشی کر سکتے ہیں ہشر کے بھوتار کے خرچ پر۔

آلات یعنی ہل، کین، جغ وغیرہ کھیت تک اٹھا لے جانے کی ذمہ داری ہشر کے مالک کی ہوتی ہے جب کہ انہیں واپس ہر ہشری خود لاتا ہے۔

پنجگور میں ہشر کو ''ہوا چک'' کہتے ہیں۔تربت کے علاقے میں ہشر اور ہوا چک دونوں مستعمل ہیں۔مگر مشرقی قبائل کے ہشر سے اس کا فرق یہ ہے کہ وہاں صرف ہل اور کین کے اجتماعی کام کو ہشر کہا جاتا ہے جبکہ پنجگور میں لوگ ہر اجتماعی کام کو ہوا چک کہتے ہیں۔

مشر بھی ہوتا تو ہشر کی طرح ہے۔مگر اس میں بیل کے جوڑے پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہوتے۔دنبہ عموماً ذبح کیا جاتا ہے مگر لازم نہیں ہے۔بس صبح شام کا کھانا دینا پڑتا ہے۔یہ کھانا دوسرا مہمان یا مسافر بھی کھا سکتا ہے۔گوشت گھر کوئی نہیں لے جاتا۔بیل کا جوڑا اور کسان یہاں بھی مشر کے مالک کو مانگنے پڑتے ہیں۔

واھر بھی ایک رضاکارانہ امداد باہمی ہوتی ہے۔مگر یہاں مدد کرنے والے لوگ بیلوں کی جوڑی خود لے جاتے ہیں۔ مانگنا نہیں پڑتا۔ یہ نسبتاً بے ساختہ و خود کار امداد ہوتی ہے جو عزیز، رشتہ دار، پڑوسی یا دوست دوسرے کسان کو کام میں دیتے ہیں۔

دراصل یہ سارے مظاہر آپس میں مدد و تعاون کے معاہدے ہیں۔ یہ معاہدے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ آٹو میٹک طور پر ایک دوسرے کے کام آنے کے رواج ہیں۔ یہ قوانین نہ کسی

سرکار سردار نے بنائے ہیں اور نہ ہی کسی کمیٹی یا پارٹی نے ۔ یہ تو شکستہ وریختہ قدیم سماج کی اپنی پس ماندہ اچھائی ہے ۔ اور یہ قانون صرف ایک علاقے میں نہیں ہے بلکہ سارے بلوچ میں، پشتون اور سندھ و ہند الختصر پوری دنیا میں چھوٹے بڑے فرق کے ساتھ موجود رہا ہے ۔ یہ سماج کی سلامتی اور صحت مندی کی ایک علامت، ایک نشانی ہے ۔ ایک دوسرے سے ہمدردی اور ہمکاری کی علامت ۔ بھائی چارے اور کامریڈشپ بڑھتی ہے، دکھ سکھ کا احساس ہوتا ہے، اور بغو اور گانے ہوتے ہیں، کسان کی چیخ و پکار، سیٹی نعرے، کوڈ ورڈز کا تبادلہ، حال حوال، الغرض سب کچھ ہوتا ہے ۔ یہ کسان کے کلچر کی بھرپور نمائندہ سرگرمی ہوتی ہے ۔ ہشر، مشر اور واھر زندگی کے ہر پہلو کو امیر بناتے ہیں ۔ یہاں زندگی کے مسائل پر بات ہوتی ہے ۔ اور یہ مسائل اجتماعی چیخ و پکار اور دلیل بازی سے حل ہوتے ہیں ۔

ہشر، مشر اور واھر اتنے پیارے رواج ہیں کہ غریب، امیر، بے بس، طاقت ور سب کو فائدہ دیتے ہیں ۔ علاقہ خواہ ساتیں والی کا ہو یا سائبیریا کا، لیڈر خواہ کاسٹرو ہو یا کوئی کھور خان زئی (مری کا ایک قبیلہ ہے) ہو، نظام خواہ قدیم کمیونزم ہو یا ترقی یافتہ سوشلزم کا، میلے کچیلے اور بے شعور بلوچ کے ہشر، مشر اور واھر کا دستور ہر کسی کو اپنانا ہوتا ہے ۔ انسان اور حیوان کے اندر فرق اُن کے بیچ ہشر کی موجودگی یا غیر موجودگی میں ہوتا ہے ۔

زمین میں وراثت

بلوچوں میں مکران وہ واحد علاقہ ہے جہاں عورت کو جائیداد رکھنے اجازت ہے ۔ یہاں میراث، حق مہر اور جہیز وغیرہ کے معاملات میں ایک ایسے رواج کی پابندی کی جاتی ہے تو جو بہت ہی اعلیٰ اور انسان دوست ہے ۔ یہاں عورت کو باپ کی میراث سے پورا حصہ ملتا ہے ۔ اُس کا خاوند بھی اپنے حصے کی پوری جائیداد حق مہر میں اُس کے نام کر دیتا ہے ۔ اس طرح زندگی بھر عورت اپنے خاوند کی محتاج نہیں رہتی ۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ وہاں یہ رواج کیسے آیا، کون یہ رواج لایا؟ اسے کس طرح برقرار رکھا

گیا؟ یہ رواج نہ تو بلوچستان کے دیگر فیوڈل یا ماقبل فیوڈل نظام سے متاثر ہوا اور نہ ماڈرن سیاسی ملا اور مدرسہ اس رواج کا کچھ بگاڑ سکے ۔ اس کا مکران یا عمومی طور پر بلوچ کے لبرل ہونے سے کوئی تعلق نہیں، اس کا کراچی اور گلف مائیگریشن سے بھی کوئی تعلق نہیں، اس لیے کہ وہاں یہ حقوق موجود نہیں ہیں ۔ اس کا امیر ہونے سے بھی تعلق نہیں کہ بلوچستان کے امیر ترین علاقے ایسا نہیں کرتے ۔ اس کا قدیم سولائزیشن ہونے سے بھی کوئی تعلق نہیں ۔

مگر بقیہ بلوچستان میں باپ کی موت کی صورت میں بیٹی کو جائیداد میں حصہ نہیں ملتا ۔ نہ زمین میں اور نہ مال مویشی، اور نہ نقدی میں ۔ چنانچہ اگر مرد مر جائے اور اس کی اولاد میں صرف عورتیں رہ جائیں تو فوری طور پر جائیداد اس کے بھائیوں، بھتیجوں اور دیگر مرد ورثا میں چلی جاتی ہیں ۔

*****

کاشتکاری کی کچھ اصطلاحات

کاشتکاری کی کچھ اصطلاحات اور ذیلی تفاصل درج ذیل ہیں:

کاشت کے موسم

بارانی فصل کے دو موسم ہیں:

نالی (ربیع یعنی گندم)

سھیل (خریف یعنی ۔ جوار، باجرہ، تارامیرا، منگ، ماش، موٹھ) ۔

نوروز: بلوچستان کا فیسٹول ہے ۔ جس کی معلوم تاریخ زرتشیوں کے زمانے تک جاتی ہے ۔ اور یہ بلوچستان سمیت پورے وسطی ایشیا میں رائج ہے ۔

اوزان و پیمائش

اناج وغیرہ کی پیمائش کے مندرجہ ذیل یونٹ ہیں؛

ایک پنڑ کی ۔ (3 / 4) سیر، 4 پنڑ کی ۔ ایک ٹوپہ یا 3 سیر، 4 ٹوپہ ۔ (ایک کاسغ یا بارہ

سیر)، 60 کاسَغ (ایک خروار)۔

کپڑا وغیرہ ناپنے کے لیے مندرجہ ذیل اصطلاحات مروج تھیں:

گراٹ ۔۔۔ ہاتھ کے کھلے ہوئے پنجہ میں چھوٹی انگلی اور انگوٹھے کے درمیاں کا فاصلہ۔

گوگو ۔۔۔ ہاتھ کی چاروں انگلیاں بند کریں۔مگر انگوٹھا پھیلا دیں۔انگھوٹے کے سرے سے لے کر چھوٹی انگلی کے دوسرے کنارے تک کے فاصلے کو گوگو کہتے ہیں۔

ھرش، کہنی سے لے کر درمیان والی انگلی کے سرے تک۔

کھانے پینے کے یونٹس

لقمہ کو ''زمب'' کہتے ہیں، چبانے کا یونٹ ''ہاشی'' ہے۔اور ایک پیاس بجھانے کے لیے کافی پانی کی مقدار کو ''کاناف'' کہتے ہیں۔

ستارے

کاشتکار اور خانہ بدوش دونوں آسمان کے کچھ ستاروں پہ بہت انحصار کرتے ہیں۔ان میں پَور (Pleiades)، تیر بند (Orion)، عقرب (Scorpio) اور تھت (Usra Major) شامل ہیں۔

فاصلے

بلوچوں میں فاصلے اس طرح بھی ناپے جاتے ہیں:

گوانک پندھ ___ وہ فاصلہ جہاں تک آواز پہنچتی ہے۔

پہر پند ___ تین گھنٹہ کے سفر کا فاصلہ۔

نیمروشہ پندھ ___ چھ گھنٹہ پیدل سفر کا فاصلہ۔

روش پندھ ___ بارہ گھنٹہ پیدل سفر کا فاصلہ۔

لُڑآف کی فصلات

ہمارے ہاں کی بڑی بارانی فصل ابھی تک گندم ہے۔بارانی زمین کے لیے زیادہ تر گندم کی ہماری وہی پرانی تخم ہے جسے ہم ''ملکی'' کہتے ہیں۔البتہ اب نئے بیج مثلاً میکسی، پون، ٹوڑھی اور کونج کی کاشت کہیں کہیں ہوتی ہے۔ ہمارا ملکی تخم ایک تو ہمارے ماحول کی گرمی سردی کو برداشت کرتا ہے۔عدم بارش اور پیاس اس کے ہونٹوں کو بہت زیاہ خشک نہیں کرتی، اس کا دانہ خوبصورت ہے، آٹا بہت لیس دار ہے، اس کی روٹی کا ذائقہ بہت اچھا ہے۔اور اس کا بھوسہ بہت نکلتا ہے جو کہ جانوروں کے لیے زبردست خوراک ہے۔ یہ زیادہ تر ''نڑ'' کے ذریعے بیجی جاتی ہے تا کہ بیج اچھی طرح مناسب گہرائی اور مناسب فاصلے پر گر سکے۔

جوار باجرے کی کاشت زیادہ تر بارانی زمینوں پر کی جاتی ہے۔ بہت کم میسر مستقل آبپاشی زمینوں کو کوئی بھی اِن تھرڈ کلاس فصلوں کے لیے ضائع نہیں کرتا۔ چوں کہ ہماری کاشت کاری وسیع پیمانے کی مارکیٹ کے لیے نہیں ہوتی اور ہم خود اپنے گزارے کے لیے محنت کرتے ہیں اس لیے ہم زمین کو صرف گندم کے لیے وقف کرتے ہیں۔البتہ جانوروں کی خوراک کے لیے ایک آدھ ٹکڑے پر جوار کی کاشت ہوتی ہے۔ بارانی، زمینوں پر باجرے کی بہ نسبت جوار زیادہ کاشت کی جاتی ہے۔

باجرہ ہمارا معین اور اصل خوراک نہیں رہا۔ باجرے کو بلوچ لوگ سردیوں میں مزہ لینے (وئے ہَر) کے لیے کھاتے ہیں۔، مزے دار بہت ہوتی ہے۔ ہماری روزی تو جوار رہا۔اور گندم کھانے کو ہم ترستے رہے ہیں۔(گندم پہلے مارکیٹ میں بھی نہیں ملتی تھی۔ یہ تو اب ربع صدی سے مارکیٹ میں دستیاب ہونے لگی ہے)۔گندم تو نور ہے نعمت ہے۔

جوار باجرہ دونوں کو پکانے کے لیے اِن کا آٹا گوندھ کر ایک گولہ بنا کر اُس گولے کو پتھر کے گرم توے (تافغ) پر رکھا جاتا ہے۔ پھر اس گولے پر ہاتھ تھاپ تھاپ کر اِسے توے پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ باجرے کی روٹی مکھن کے ساتھ ملا کر کھائیں تو یہ زبردست ڈش بن جاتی ہے۔گندم تو ''بے ساث کے بھی ساثی ہے''۔(بلوچی ضرب المثل کہ حسین عورت بغیر زیور کے بھی سمجھو زیور پہنے ہوتی ہے)۔

ماش، موٹھ اور لوبیا بھی کاشت ہوتے ہیں مگر بہت چھوٹے پیمانے پر۔ ہم انھیں خود

کھاتے ہیں، وہ بھی کھانے کے ساتھ نہیں بلکہ ویسے ہی ابال کر مزے لینے کے لیے۔ گھی سالن ویسے بھی نیا نیا ''فیشن'' ہے۔

ہمارے کسان یعنی ہمارا عوام بہت بے بس مخلوق ہے۔ بہت زیادہ لوگ بہت کم زمین پر گزارہ کرتے ہیں۔ پھر سہارا بارشوں پر ہے۔ اچھے دنوں کی امید، برسات و بارش کی امید، فصل و پیداوار کی امید، روٹی کے نوالے کی امید، لباس کے ٹکڑے کی امید، گرم گود کی امید، چاند سے بیٹے کی امید، سلامتی صحت کی امید............آنکھیں چندھیا گئیں، دل تاریک ہو گیا، امید......امید اللہ پر، امید اُس درخشاں ساعت کی جب ہماری پیشانی پہ لکھی تحریر بدل جائے!۔

مگر کہاں ہے ہمارے ٹھنڈے پانی کی جھیل، وہ میٹھی شفاف، پیاس بجھانے والی جھیل کہاں ہے۔ نہیں، نہیں۔ بادل ہم سے ناراض ہیں، بجلی کی چمک پر ہمارے علاقے میں پابندی ہے، گرج اپنی عدت کے ایام میں ہے۔ پیاسی آنکھیں گندم نہیں اگا سکتیں۔ بھوک کی فریاد اور آہ پیٹ کا دوزخ بھر نہیں سکتیں۔ دکھوں کی ہچکیاں سُکھوں کی لیلوڑی نہیں بن سکتیں۔

ہماری کاشتکاری کے خطرات بھی بہت ہیں۔ ہل چلانے والا بیل جب لنگڑا ہو گیا یا خیرات اور شادی میں ذبح ہوا یا پھر بڑی چٹان سے پھسل کر مر گیا تو بس ساری اکانومی دھڑام سے زمین بوس ہو جاتی ہے۔ خاص کر اگر یہ آفت ہل اور بوائی کے دنوں میں آ جائے تو کاشتکار اور کسان کا گلہ سوکھ جاتا ہے۔ کسی سے بیل ادھار مانگنے کی آس لے کر بھاگ کر اِس یا اُس گھر جاتا ہے۔ یا پھر قرض کے لیے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تا کہ اپنے لیے بیل خرید سکے۔ بقال (جو قرض دیتا ہے، زیور گروی رکھتا ہے) ہمارے علاقے سے غائب ہی ہو گئے ہیں۔ اور ریاست نے آسان اور بلا سودی زرعی قرضوں کا کوئی نظام وضع نہیں کیا کہ وہ بقال ساہوکار کا متبادل بن سکے۔ بس کسی مقامی سرمایہ دار (بھاگیا) کے پاس جانا ہوتا ہے یا کسی کنجوس پیسہ سٹور کرنے والے کے در پہ سوالی بننا ہوتا ہے۔ اپنی زمین کا ایک حصہ رہن رکھنا ہوتا ہے اور ایک مقرر وقت تک اپنی زمین کی پیداوار سے محروم رہنا ہوگا۔

کسان تو بیل کا بیلی ہوتا ہے۔ وہ اپنے بیل کا سنگھار کرتا ہے۔ بجنے والی گھنٹی (شب) اسے پہناتا ہے۔ بہت رنگوں کے پشمینہ مہار، گلے میں کشیدہ کیا ہوا پٹہ۔ وہ اُس کی مالشیں کرتا ہے۔

اس کی بلائیں لیتا ہے۔ ہماری فوک شاعری میں ایک کسان جھڑّ انامی اپنے بیل کی تعریف میں سو سے زائد مصرعے کہہ گیا ہے۔ اس دستانغ کو جھڑّا بھی کہتے ہیں اور ''چیڑ ول'' بھی:

جھرا شب و کنڈی آں نہ بنداں ذاتے بیکارا
نہ زئے گوخ ، نیئے روڑے، نہ خنت جھرا تڑیں کارا
پنجاہ کاسغہ ریشان، جھّرا روشہ نگارا
جھرا کوتلی جزی، ہیلاکیں سرہ مہارا
جھرا ڈھگوے جوائیں، تئ تعریف دَہ قندہارا
لٹاں ہلمہاں کاری، چڑی جھرا گوں یہ تاڑا
ہزارا لوٹشہ، جھّرا، جمالی لوپہ سردارا
ہزار تہ چترے چی نئیں، نہ داشہ ماخو بھوتارا

ترجمہ:

جھرا کی گھنٹیاں اور گھنگھرو کسی اور بے کار بیل پہ نہیں باندھوں گا
نہ کوئی گائے ایسا بچہ جنے گی نہ ہی کوئی اور بچھڑا جھرا جتنا کام کر پائے گا
میں ایک ہی دن میں جھرا کے ذریعے پچاس کاسہ بیج بوتا ہوں
جھرا ناز و نخرے کے ساتھ، مہار ڈالے چلنے کا عادی ہے
جھرا زبردست بیل ہے جس کی شہرت قندھار تک ہے
بند کے لٹ پر (چڑھائی) پر تو گویا حملہ آور ہوتا ہے اور اس کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے
ایک ہزار روپیہ پہ مانگا تھا جمالی کے سردار نے
ایک ہزار کچھ کم رقم تو نہیں ہوتی مگر میں نے اور میرے جاگیردار نے اُسے نہ بیچا

وہ بیل سب سے اچھا تصور ہوتا ہے جو اندر اور باہر دونوں طرف ہل چلائے، بار بردار ہو، کام میں سست نہ ہو اور خوبصورت بھی ہو۔

2۔ سیاہ آف

(مستقل پانی سے سیراب ہونے والی زمینیں)

مویشی بانی اور بارانی زرعی معیشت ہی کی طرح سیاہ آف والی زرعی معیشت سے بھی بلوچ کا سماجی نظام متشکل و استوار ہے۔ قدیم سیاہ آف کا ذریعہ تو کاریز رہا ہے۔ اسی کاریز کی بدولت بلوچ کے ہاں بام رنگ، گوئل، نیمروش، پیشین، دیگر، روش ٹپ، نماشام، کُپتن، زہریں وہاو، اور پذی شف کے علاوہ بھی 24 گھنٹوں کو تقسیم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

یوں ''پاس'' ہمارا سٹینڈرڈ ٹائم بنا۔ کاریز ہو یا کچ، مشترکہ ٹیوب ویل ہو یا نہری نظام، ''پاس'' گویا پانی کی تقسیم کی علامت بن گیا۔ لفظ ''پاس'' سیاہ آف کا اپنا لفظ نہیں ہے۔ یہ تو پندرہویں سولہویں صدی میں بیورغ کی شاعری میں بھی استعمال ہوا تھا۔ مگر یہاں کاشتکاری میں یہ باقاعدہ وقت کا یونٹ بن کر سامنے آیا۔ چوبیس گھنٹے میں چار پاس تھے۔ یک پاس، دو پاس، سہ پاس، چیار پاس۔ ہمارے بڑے پیر ''یک پاسی'' اور ''دوپاسی'' مشہور ہیں۔

یہ جو گھنٹہ اور سیکنڈ والی بات ہے وہ تو انگریز اپنے ساتھ لایا۔ اس نے ہمارے پورے برصغیر کے لیے ایک ہی سٹینڈرڈ ٹائم مقرر کردیا۔ اُسے گرین وچ مین ٹائم سے پانچ گھنٹے آگے کردیا۔ پھر جب اگست 1947ء کو چار ملکوں یعنی ہندوستان، پاکستان، نیپال اور بلوچستان کی آزادی کا اعلان ہوا تو ہمارا اور ہندوستان کا وقت آدھ گھنٹے کے فرق والا بنا۔ اُن کا آدھ گھنٹہ پہلے اور ہمارا بعد میں۔

کاریز

ہماری روایتی زراعت میں کہن (کاریز) کا اہم کردار رہا ہے۔ یہ بلوچستان میں آبپاشی کا ایک قدیم ذریعہ تھا۔ کاریزوں کے انتظام اور بندوبست اور دیگر معاملات حل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک عہدے دار مقرر ہوتا تھا۔ دیکھ بھال بہت ہی نازک ہوتی ہے، آبپاشی کے خصوصی منیجر مقرر کیے جاتے ہیں۔ ان افسروں کو رئیس، ارباب، سرشتہ، یا کئو ہدا کہتے ہیں۔ ان کا تقرر موروثی ہوسکتا ہے مگر اس کا انحصار کارکردگی پر ہوتا ہے اور ان کا معاوضہ پانی میں حصہ کی صورت میں دیا جاتا

ہے، یا پھر نقدی کی صورت میں، یا آبپاشی کے نظام کو صفائی کے لیے کام کرنے سے مستثنیٰ کرکے۔

کاریز کا پانی ہنگام، نیم ہنگام، تنسو، نیم تنسو کی بنیاد پر شریک لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ پانی کے سماجی انتظام میں یہ بات شامل ہے کہ پانی کی تقسیم بہتر اور مؤثر ہو۔ پانی چوری کی روک تھام ہو اور پانی کے نالوں کو صاف کرنے اور مرمت کرنے میں تعاون ہو۔ جہاں پانی کے حصے چھوٹے ہوں، وہاں پانی کی تقسیم پیچیدہ ہوتی ہے۔

کاریز کا نظام بہت دلچسپ ہے۔ معلوم نہیں ہے کہ کاریز کا نظام سب سے پہلے کہاں اور کس نے شروع کیا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کاریز کس زبان کا لفظ ہے اور مہرگڑھ جیسے قدیم بلوچ سے کس کس قوم نے یہ نظام سیکھا؟ کاریز نظامِ آبپاشی سارے مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں اور نیز چین اور جاپان میں پایا جاتا ہے۔ مگر یہ بات پکی ہے کہ بلوچستان میں کاریز بہت زمانے سے مروج رہے ہیں۔

کاریز موتیوں کا پرویا ہوا ہار ہوتا ہے۔ پانی، دھاگے کی طرح کنوؤں کے منکوں کو باہم پروتا ہوا، اپنے سرچشمے سے لے کر فصل تک چُھپے ہوئے یا دشمن دار جوانوں کی طرح خفیہ خفیہ، چپ چاپ، پاؤں کے بل چلتا ہوا مہر و محبت، آبادی اور خوشحالی کا پیغام جا کر پہنچاتا ہے۔ کھڈوں کی دوستی کے یہ نشاں، انسانی فکر کے جادو کا یہ کرشمہ، اور حیاتِ نو کا یہ پیمبر زیادہ تحقیق، زیادہ ریسرچ، چھان بین اور زیادہ صفائی وخدمت کا متقاضی ہے اس لیے کہ یہ ہماری کم آبی کا درمان ہے، اس کی مٹھاس کھارے جوہڑوں کو شرمندہ کرنے والی ہے اور یہ اناج وطعام کے خرمنوں کا سبب ہے۔

ٹیوب ویلوں نے کاریز کا نظام تقریباً تقریباً مکمل ناک آؤٹ کردیا۔ محض اِکادُکا کاریز ابھی تک باقی ہیں۔ مستنگ جو کاریزوں کا علاقہ تھا اور یہاں 360 کاریز تھے، اب ناپید ہوگئے ہیں اور جو اکادکا موجود ہیں، جاں بلب ہیں۔

رھٹ یا اَرٹ

ایک زمانے تک دولتمند کاشتکار یہ طریقۂ آبپاشی بھی استعمال کرتے رہے۔ مگر اونٹوں پر لاد کر اس کے پرزہ جات دور دراز تک لائے لے جائے نہ جاسکتے تھے۔ نیز خرابی کی صورت میں

مستری علاقے سے بہت دور شہری مراکز میں ہوتے تھے۔ اس لیے یہ طریقہ نہ مقبول ہوا اور نہ دیر پا۔

ٹیوب ویل اور مشینی زراعت

ٹیوب ویلوں کا رواج ابھی بڑھتا جا رہا ہے اور آباد اور مستقل رہائش پذیر لوگوں کی توجہ ابھی حال ہی میں سائنسی زراعت کی طرف مبذول ہو رہی ہے۔ البتہ ایک بحرانی صورت یہ پیدا ہو چکی ہے کہ بہت قریب قریب ٹیوب ویل لگائے جا رہے ہیں۔ اور یہ ٹیوب ویل تعداد میں بہت زیادہ لگائے جا رہے ہیں۔ جیسے بکری کی تھن پہ بے شمار لیلوں کے منہ لگائے جائیں۔ Capacity سے بہت زیادہ ٹیوب ویل۔ جس سے زراعت کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس صورتحال سے نمٹنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ریاست موجود نہیں اس لیے اُس کے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔

البتہ کچھ علاقوں میں پانی کے حقوق رکھنے والے لوگ، کاریز کے قریب ٹیوب ویل لگانے نہیں دیتے۔ مستنگ ضلع کے حصوں میں ایسے علاقے بھی مخصوص کر دیے گئے ہیں جہاں کنویں یا ٹیوب ویل نہیں کھودے جا سکتے۔

ٹیوب ویلز میں ایک بحران یہ آ گیا کہ ڈیزل کا خرچہ اتنا زیادہ ہے کہ زمیندار کی کمر ٹوٹ جاتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گوشت سے چھیچھڑے مہنگے پڑتے ہیں۔ گرڈ والی بجلی بھی محض کشادہ پیشانی والے علاقے کی بھی قسمت والے عوام تک پہنچ گئی۔ زمینداری میں اس کی برکتیں یہ ہوتی ہیں کہ پہلے سے لگے ہوئے ٹیوب ویلوں کا خرچ کم ہو جاتا ہے۔

مگر بجلی کے شدید بحران نے ساری زراعت برباد کر ڈالی۔ اس لیے کہ ڈیزل والے ٹیوب ویل پہلے اکھاڑ دیے گئے تھے اور اُن کی جگہ بجلی والے ٹیوب ویل لگائے گئے تھے۔ بجلی چوں کہ ہے نہیں، اس لیے ہم زراعت میں نہ تو تین کے رہے نہ تیرہ کے۔ مشینیں یعنی ٹکنالوجی بدلنے کا کام دیوالیہ کر دیتا ہے۔

چین کیپٹلزم میں لپٹے اپنے سوشلزم کے ساتھ ایک لحاظ سے دنیا بھر میں ایک رحمت

ثابت ہوا ہے۔ اس نے استعمال کی تقریباً ساری چیزیں سستے داموں پر گاؤں تک پہنچا دی ہیں۔ اِن ساری نعمتوں میں سولر سسٹم کی ٹکنالوجی سرِ فہرست ہے۔ بلوچستان میں سولر نظام اب توانائی کی ایک بہت بڑی صورت ہے۔ موبائل چارج کرنے سے لے کر ٹیوب ویل چلانے تک اس سولر سسٹم کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

اس سے زراعت، بالخصوص کپاس کی زراعت کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ گدھے پہ دو تین پلیٹیں لادیں اور سڑکوں شاہراہوں کی محتاجی سے آزاد کہیں پہ بھی یہ سسٹم نصب کر دیا۔ اور زمین کی زرخیزی اور verginity سے زبردست پیداوار حاصل کی۔

زراعت میں ایک اور نیا آبپاشی نظام آیا ہے جسے Drip Irrigation کہتے ہیں اور اس طریقہِ سیراب میں ڈرپ ہی کی طرح پودے کو ضرورت کے مطابق قطرہ قطرہ پانی دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ طریقہ مؤثر ہونے کے باوجود بلوچستان کے تمام علاقوں میں استعمال نہیں ہو پا رہا کیونکہ مہنگا ہونے کے باعث ایک عام کسان اسے افورڈ نہیں کر سکتا۔

ٹریکٹروں کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ لوگ بارانی و آبی دونوں زمینوں کو ہموار اور آباد کر رہے ہیں۔ بنجر اور پتھریلے علاقے اب قابلِ کاشت ہوتے جا رہے ہیں۔ ٹریکٹر ہمارے لیے بہت مفید چیز ہے۔ اسے بار برداری کے لیے استعمال کریں یا سواری کریں، چاہے تو اس سے ہل چلائیں، چاہے زمین ہموار کریں، خواہ نالے، کیاریاں اور لٹ باندھیں یا اس سے ٹیوب ویل چلائیں۔ یہ ہمارے گدھے کی طرح ہرفن مولا ہے اور لوگ روز بروز اس کی کرامتوں سے واقف ہوتے جا رہے ہیں اور اس کی گرویدگی بڑھتی جا رہی ہے۔

مگر عمومی طور پر ہمارے ہاں ابھی حال تک کاشت کاری کی تکنیک بہت ابتدائی اور فرسودہ ہوا کرتی تھی۔ ہل لکڑی کا ہوتا تھا اور ہل چلانے کے لیے کبھی کبھی اونٹ، گائے اور گدھا استعمال ہوتے تھے۔ مالہ دو بیلوں کے پیچھے بچھا ہوا درخت کا تنا ہوتا تھا جس سے ہم کھیت میں مٹی کے ڈھیلے توڑتے تھے۔ اور ''کھرپڈ'' نامی کسّی جیسے آلے سے ہم مٹی کے ڈھیلے بھی توڑتے تھے اور چھوٹی موٹی جھاڑیاں بھی اکھاڑتے تھے۔

فصل کی کٹائی ہر جگہ درانتی سے ہوتی تھی۔ ریپر ابھی تک مقبول نہیں ہوا۔ تھریشر اور ٹریکٹر بھی گاہنے کے لیے استعمال ہونے لگے ہیں۔ مگر بیلوں سے فصل گاہنے کا رواج اب بھی کہیں کہیں موجود ہے۔

ادویات

آبی زمینوں پر اب کرم کش ادویات بھی استعمال ہو رہی ہیں۔ اسی طرح سائنس کی تیار کردہ کھاد سے بھی مستفید ہوا جا رہا ہے۔

شعور، ادراک کم ہے، اور ہمیں کسی نے بتایا بھی نہیں کہ یورپ و امریکہ کے ایڈوانس لوگ کرم کش زہر کے استعمال سے ہاتھ کانوں کو لگا کر توبہ کر رہے ہیں۔ اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ''ہم سے عبرت پکڑو۔ ہمارے پانی میں بھی زہر ہے، اپنی فصل اور خوراک ہر چیز میں ہم نے خود زہر ڈال دیا ہے۔ ہم نے اپنی سانسوں میں بھی زہر بھر دیا ہے کہ ساری ہوا زہر آلود ہوگئی ہے۔ خدا کو مانو تم زہر کا دھندا چھوڑ دو۔۔۔۔''۔ مگر کپٹلزم کامن سینس کی بات بھی سننے نہیں دیتا۔ دوا ساز کمپنیاں پیسہ دے دے کر، اشتہارات نشر اور چھاپ چھاپ کر انسانی فلاح کی ہر آواز کو کامیابی سے دبا لیتی ہیں۔ انہی کمپنیوں کی بدولت تو حکومتیں چلتی ہیں۔ یہ چاہیں تو بادشاہ بنوا دیں چاہیں تو آلندے والا حشر بنا دیں۔

نہریں آنے سے پہلے بلوچستان کے میدانی (صحرائی) علاقے کو ''پٹ'' کہا جاتا تھا۔ یہاں بارشیں نہیں ہوتی تھیں اور سیلابی پانی کے سرچشموں سے یہ علاقہ بہت دور واقع تھا۔ اس لیے اسے ''دشتِ اموات'' کہتے تھے۔ یہاں اہم سیلابی دریا ناڑی، بولان، سکلیجی، مُولا، لہڑی اور چھتر ہیں۔ کچھی میں داخل ہو کر ان دریاؤں کے بے شمار چھوٹے چھوٹے نالے بن جاتے تھے۔ ان سیلابی دریاؤں پر آب پاشی کے لیے بڑے بڑے بند یا ڈیم بنائے جاتے تھے۔ جنھیں ''گنڈھو'' کہا جاتا تھا۔

کئور، دریا

سیاہ آف وہ مبارک نعمت ہے جس سے جاندار مخلوق اور شہروں کی زندگانی وابستہ ہے۔ مصر دریائے نیل کا تحفہ ہے۔ میسوپوٹیمیا کے دو دریاؤں دجلہ وفرات کے درمیان اور اس کے ساتھ ساتھ

ہمیشہ بے شمار کلچر پھلے پھولے ہیں۔ آسٹریا کی ترقی و خوش حالی دریائے ڈینیوب کے سبب ہے۔ جرمنی کی تجارت اور صنعت ایلبے اور رہائین دریاؤں کے وسیلے سے ہوئی ہے اور فرانس کے کلچر اور ترقی کو لائر، رھون اور سین دریاؤں نے بالغ کر دیا ہے۔ روس میں دریائے والگا اور ڈان کئی کلچروں کا منبع ہیں۔ چین میں یلو ریور ہے۔ ہندوستان پہ گنگا اور برہم پترا کے احسانات ہیں۔ بلوچستان میں آبادی، کلچر اور سولائزیشن دریائے بولان، دریائے بیجی (ناڑی)، دریائے ہنگول اور، دریائے سندھ کی برکت سے ہیں۔

ہمارے قصبے اور شہر بھی پانی کی مستقل ندیوں نالوں کے دم سے آباد ہیں۔ مگر پورے بلوچستان میں دریاؤں میں دائمی پانی بہت کم ہے۔ یہاں بہت سے سیاہ آف کھارے پانی والے ہیں۔ بولان کی طرح دیگر بھی بہت سے دریا ایسے ہیں جن میں کچھ دیر تک دیکھیں تو بہتا پانی موجود ہے، پھر یہ پانی دوبارہ زمین کے نیچے گم ہو جاتا ہے، ایک دو میل کے بعد پھر پانی کی دھاری نمودار ہوتی ہے۔ ہمارے خطے میں مارشل لا کے تحت سیاست کرنے والے سیاسی ورکروں کی طرح پانی کی یہ آنکھ مچولی پورے رَو تک چلتی ہے۔ پہاڑوں کے موڑوں کونوں میں جہاں پانی نمودار ہوتا ہے، وہاں اس کی گہرائی دو انچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ہاں جب بارش برستی ہے تو ان دریاؤں میں شتر بُرد سیلاب آتا ہے۔ موجیں مارتا یہ سیلابی پانی آدھے گھنٹے کے اندر اندر اتر جاتا ہے۔ پانی کا یہ سیلاب بڑی بڑی جھیلیں (کمب) بناتا ہے۔

ان دریاؤں سے لوگ چھوٹی نالیوں کے ذریعے آس پاس کی زمین سیراب کرتے ہیں جنھیں ''کچ'' کہتے ہیں۔

بیجی

دریائے ناڑی مری علاقے سے گزرتا ہے تو اس کا نام بیجی ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ دریا، سپیرا راغہ سے چار میل مشرق کی طرف سے نکلتا ہے۔ جہاں سے یہ 23 میل مشرق میں جا کر درگئی دریا سے مل جاتا ہے۔ وہاں سے یہ جنوب مشرق کو مڑتا ہے اور یہاں سے 48 میل پر شمال سے آنے والے ''ماڑءکور'' کے ساتھ مل جاتا ہے۔ ماڑءکور ژوب اور لورالائی کی وادیوں

سے آتا ہے اور مارتنگی سے ہوتے ہوئے ''نوے اوبو'' کے قریب لورالائی دریا میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے ڈھائی میل آگے مشرق کی طرف شمال مشرق سے آنے والے سینٹرھ اور وتگان دریا لورالائی دریا سے مل جاتے ہیں۔ سینٹرھ اور وتگان جاری اور مستقل دریا ہیں۔ سینٹرھ کے مل جانے کے بعد آگے جا کر نڑ یچی سے اس کا سنگم ہو جاتا ہے اور ذرا نیچے چوٹیالی سے چار میل کے فاصلے پر گھاٹی پل نامی ایک پل بنا ہوا ہے۔ اس پل سے آگے دریا کو ''بیجی'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ پوادی مری کے علاقے سے ہوتے ہوئے کلوانی مری کے علاقے سے گزرتا ہے۔ بابر کچھ کے قریب شمال سے آنے والا ''ڈاڈا کوز'' اور ''سانگان کوز'' اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ سبی کے میدان سے اتر کر آگے اِس کا نام ناڑی ہو جاتا ہے۔

سیبوی میں داخل ہو کر اس پر ایک گارج قائم کیا گیا۔ ناڑی گورکا پانی اس میں جمع کیا جاتا ہے اور اس کا پانی سبی میں زراعت کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ وہاں سے پھر کچھی میں داخل ہو جاتا ہے۔ بالا ناڑی اور بھاگ کے علاقے میں اس کی گزرگاہ خمدارسی ہو جاتی ہے۔ بھاگ کے علاقے کے بعد یہ بہت سی شاخوں میں منقسم ہو جاتا ہے اور مکسی علاقے سے ہوتا ہوا سندھ پہنچتا ہے۔ کچھی میں اس کے سیلابی پانیوں پر بند باندھ کر آبپاشی کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ بڑے بڑے گنڈھو ہیں۔ یہ گنڈھو مٹھڑی کے علاوہ اریی ،گاڈی' حاجی، ٹاکری، گلاب اور گاموں میں ہیں۔ کچھی کا گاڈی گنڈھو سب سے اہم ہے۔ اس لئے کہ سارا بھاگ اور نصیر آباد کا علاقہ اس پر انحصار کرتے ہیں۔ سب سے آخری ''صاحب ڈنہ گنڈھو'' ہوا کرتا تھا۔ بھاگ کے قریب ناڑی سے ایک شاخ نکالی گئی جسے ''بشک واہ'' کہتے تھے، اور اس پر نَو بند تھے۔ گنڈھو سے زراعت کے بارے میں ہم آگے بحث کریں گے۔ دریائے بیجی کے سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اس کی لمبائی تین سو تین میل ہے۔

ایک دلچسپ بات اور!! مختلف دریائی تہذیبوں میں پانی کی پوجا کا رواج بھی ہے۔ مصر میں نیل، ہندوستان میں گنگا، جمنا، چین میں زرد دریا اور سندھ میں سندھو سے بہت سی ایسی روایات منسوب ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ کسی زمانے میں ان دریاؤں کو اَن داتا اور دیوتا سمجھ کر اُن کی

پوجا ہوتی تھی۔ بلوچستان میں بیجی دریا کو متبرک تصور کیا جاتا ہے۔

ناڑی، جس کا کہ ہم بیجی دریا کے بطور پہلے ذکر کر چکے ہیں، سبی کے لیے روزی رساں ہے۔ ضلع کی 90 فیصد نہری کاشتکاری اسی دریا سے ہوتی ہے۔ دریائے بیجی کے آبی حقوق سبی میں یوں تقسیم ہیں؛

تخجک............	16.5 پاؤ
دھپال......	7.0 پاؤ
صافی............	8.0 پاؤ
مرغزانی............	7.0 پاؤ
کڑک............	7.0 پاؤ
سبی ٹاؤن............	6.0 پاؤ
خدائیدادمرغزانی......	1.0 پاؤ
موسیانی......	1.0 پاؤ
لونی............	3.0 پاؤ
بکھڑا............	2.0 پاؤ
کوٹ باروزئی......	2.0 پاؤ
محکمہ فارسٹ......	1.5 پاؤ
مندوانی............	1.0 پاؤ
نودھانی............	1.0 پاؤ

کل.................64.0 پاؤ یعنی 115.2 کیوسک (4)

بولان

بولان دریا کوپلور کے قریب شروع ہوتا ہے جس میں ''سرِ بولان'' پر پانی نظر آتا ہے اور

''آبِ گم'' میں غائب ہو جاتا ہے۔ ڈھاڈر پر پہنچ کر اس پر آبپاشی کے لیے ایک بند باندھا گیا۔ بولان ویئر میں بولان کا پانی تقسیم ہوتا ہے: تین حصے رئیسانڑیں کے اور پانچ حصے باقی ڈھاڈر کو۔ اس دریا پر اہم بندوں (گنڈھوؤں) کے نام ہیں؛ مھیسر، خان پور نوٹھل والا، باگائی، رستم اور ہانبی۔ اس کا پانی کبھی کبھی بھاگ اور گنداواہ تک پہنچ جاتا ہے۔

اس کی لمبائی 83 میل ہے۔

لہڑی

لہڑی کور مری علاقے میں مخ ماڑ کے گردونواح سے ہو کر کاہان کو چھوتے ہوئے، مری علاقے سے ہوتا ہوا لہڑی شہر سے آٹھ میل شمال مشرق میں داخل ہوتا ہے۔ لہڑی شہر سے ڈیڑھ میل شمال مشرق میں مرادواہ اور خان واہ نامی دو شاخیں اس سے نکلتی ہیں اور مغرب کی طرف جاتی ہیں۔ خان واہ ڈومبکی کے چیف فیوڈل کی زمینیں سیراب کرتا ہے، جہاں سے یہ بالا ناڑی کی طرف مڑ جاتا ہے اور اُدھر جنوب میں ٹُمپل ڈیرہ کی جانب رخ اختیار کرتا ہے۔

چاکر کئور

چاکر کور ماوند کے مشرق میں کُوہی وڈ سے شروع ہو جاتا ہے اور ماوند سے ہوتے ہوئے پہاڑوں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے تلی سے گزرتا ہے اور سبی کے میدانوں میں جا کر آگے بیجی سے ملتا ہے۔ لہڑی بھی چاکر اور بیجی کے سیلابی پانی سے جاتا ہے۔ آگے اِس کی مرضی تباہی مچادے یا علاقے کو سیراب کردے۔

چھتر کئور

چھتر، بگٹی پہاڑوں سے نکلتا ہے اور کہیری علاقے میں داخل ہوتا ہے۔ چھتر اور شاہ پور کے درمیان بہت بڑی زمین اس سے سیراب ہوتی ہے۔(5)

دریائے بمپور

یہ ایرانی بلوچستان کا اہم دریا ہے۔ اس سے علاقے میں خوشحال زرعی سرگرمی جاری و

ساری ہے۔ زیرِ زمین پانی کی سطح اسی کی برکت سے برقرار ہے۔ یہ دریا ایران شہر کے جنوب سے گزرتا ہے۔

حب کئور

ضلع لسبیلہ سے ہوتے ہوئے بحیرہ بلوچ میں جا گرتا ہے۔ یہ برسات کے موسم میں تیز سیلابی دریاؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس پہ ایک بند باندھا گیا ہے جہاں سے یہ پانی کراچی کی ابدی اور کبھی نہ بجھنے والی پیاس بجھانے کی چاکری کرتا ہے۔

ماشخیل

ایران سے آنے والے دریا، ماشخیل خاران کے صحرائی علاقے سے گزرتے ہوئے ایک وسیع وعریض نشیب میں ختم ہو جاتے ہیں۔

رخشان کئور

یہ سیلابی دریا پنجگور اور آس پاس کے پہاڑوں سے پانی مانگتا ہے۔ اس کا سرچشمہ ناگ میں آتا ہے۔ اس کی لمبائی 260 میل ہے۔

کیچ کئور

مہربان ہو تو مکران کو آباد، اور قہر میں ہو تو اُسے برباد کرتا ہے۔ اسے نہنگ کور کی ماں کہتے ہیں جو کہ ایران سے نکلتا ہے۔ اور ناصر آباد کے قریب کیچ کور سے آ ملتا ہے۔ جہاں سے ان کا مشترکہ نام دشت کور ہو جاتا ہے۔ دشت کئور مکران میں واقع بہت طویل دریا ہے۔ ذرا سی بارش اور مکران آباد۔ اس کی لمبائی 255 میل ہے۔

بلوچستان بھر کے دیگر سیلابی دریاؤں کی طرح دشت کئور بھی بارشوں کے موسم میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے، مکمل پاگل، تیز رفتار، کان پھاڑ ڈالنے والا شور، گائے بیل اور دیگر جانوروں، اور جڑوں سے اکھاڑ کر گرا دینے والے دیوہیکل درختوں کو اپنی رو میں بےعزتی سے ہانکتا ہوا چلا جاتا ہے۔ کناروں تک بھرا ہوا دشت کئور اپنے اڑوس پڑوس کی مفلس و بے آب زمینوں کی برسوں کی

پیاس کو بجھا جاتا ہے، جہاں محنتی بلوچ کسان یک دم کاشتکاری کے فراموش کردہ فریضے پر دوبارہ لگ جاتا ہے۔

سکلینجی

سکلینجی، سراوان میں ہر بوئی کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور ہوتے ہوئے کچھی کے میدانوں کو سیراب کرتا ہے۔شوران کے جنوب سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔ یہ دوحصوں میں تقسیم ہوتا ہے ؛ایک گاجان کو جاتا ہے اور دوسرا شوران کو۔

مُولا

مُولا، ہربوئی پہاڑوں سے شروع ہوتا ہے اور جہلاوان میں چلتا جاتا ہے،اور جاکر کچھی میں داخل ہوتا ہے۔ایک حصہ گاجان کو جاتا ہے اور دوسرا سندھ کو جاتا ہے۔اس کی لمبائی 83 میل ہے۔

دریائے پُورالی

دریائے حب اور ہنگول کے درمیان بحرِ بلوچ میں گرنے والا تیسرا قابل ذکر دریا ہے۔
اس کی لمبائی 102 میل ہے۔ضلع لس بیلہ کی زراعت میں منفرد بات یہ ہے کہ یہاں ہماری روایتی فصلوں کے بجائے نقد آور سبزیاں اور پھل کاشت کیے جاتے ہیں۔ چیکو، کیلا، ناریل، پپیتا، املی ، کپاس...... یہ کاشت کاری مقامی لوگ بھی کرتے ہیں اور قبضہ کنندگان بھی۔ واضح رہے کہ بہت بااثر اور قبائلی سرداروں نے بقیہ بلوچستان سے یہاں آ کر زمین کسی نہ کسی صورت اپنی کر لی اور یہاں کی زمینداری میں لگ گئے۔

ہنگول

یہ کوہ مکران کے میدانوں میں بہتا ہے اور جا کر بحیرۂ بلوچ میں شامل ہوتا ہے۔ جب بارش زیادہ ہوتی ہے تو اس دریا میں زبردست سیلاب آتا ہے۔
دراصل اوپر بہت دُور کہیں پرشکوہ پہاڑوں کے بیچ پانچ دریا مل جاتے ہیں،تب ہنگول بنتا ہے۔اور اِس دریا کا ''کوالی ٹیٹو'' روپ اُس وقت ہوتا ہے جب یہ تین سو پچاس میل چل کر بحیرہِ بلوچ میں اتر جاتا ہے۔

انڈس دریا

ڈیرہ غازی خان سے لے کر جیکب آباد تک دریاؤں کا باپ ''اباسین'' یعنی ''سندھو دریا'' بلوچ وطن کی رگوں میں نمی انڈیلتا جاتا ہے۔ جب ہم اپنا مکمل حصہ لینے کے قابل ہوں گے تو سچی بات ہے کہ یہی پانی بلوچ کو اناج میں خود کفیل بنائے گا۔

نہریں

مغربی بلوچستان (پاکستان) 134,051 مربع میل یا 34.94 ملین ہیکٹر کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں صرف 12 ملین ہیکٹرز پر کاشت کاری ہوتی ہے۔ صوبے میں 5.22 ملین ہیکٹر قابل کاشت زمین ہے جب کہ باقی زمین پانی اور انفراسٹرکچر نہ ہونے کی وجہ سے غیر آباد پڑی ہوئی ہے۔ پانی صرف 0.34 ملین ہیکٹر کو نصیب ہے۔تقریباً 0.18 ملین ہیکٹرز کو مستقل طور پر نہروں ،ٹیوب ویلوں اور کاریزوں سے پانی ملتا ہے۔ بقیہ 0.16 ملین ہیکٹرز بارشوں کے رحم و کرم پر ہے۔
بلوچستان میں نہری نظام کے ذریعے تقریباً نولاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے جس میں سے پٹ فیڈر نہر سے 4 لاکھ ساٹھ ہزار ایکڑ، کیرتھر سے 2 لاکھ 55 ہزار ایکڑ، اوچ کینال سے 85 ہزار، مانجھوٹی سے 28 ہزار ایکڑ، خان واہ سے 25 ہزار ایکڑ۔
بلوچستان کو صرف 4200 کیوسک پانی سکھر اور گڈو بیراج سے ملتا ہے۔ یہی اس کا حصہ ہے۔

نصیر آباد کے علاقے کی نہریں ''بیگاری'' اور ''شاہی واہ'' ہیں۔ یہ دونوں نہریں دریائے سندھ سے نکلتی ہیں۔ اول الذکر کی دو شاخیں ہوتی ہیں؛ نور واہ اور سیر واہ۔ بیگاری شاید نور محمد کلہوڑا کے زمانے سے شروع ہوئی تھی۔ بیگاری نام اس لیے پڑا کہ مزدور بیگار پر لیے گئے تھے۔(6)۔اس سے زرعی پیداوار خوب بڑھی۔لوگ خانہ بدوشی کے بجائے آباد ہو کر زراعت کرنے لگے۔ ریل اور سڑک نے زراعت کو مزید ترقی بخشی۔
انگریزوں نے 1932ء میں کیرتھر نہر بنائی تھی۔ یہ سکھر بیراج سسٹم کی شمال مغربی نہر کی

شاخ ہے۔

پاکستان نے کشمور کے مقام سے دریائے سندھ سے ایک نہر نکالی جسے پٹ فیڈر کہتے ہیں۔ پٹ فیڈر بلوچستان میں نہری آبپاشی کا سب سے بڑا نظام ہے۔ جس کی لمبائی 112 میل ہے۔ اس طرح یہ نہر، نہر سویز سے لمبی ہے جو سرخ سمندر کو میڈیٹرن سے ملاتی ہے۔

پٹ فیڈر نے شروع شروع میں 6700 کیوسک پانی لینا تھا مگر جب 1962ء میں اس کی تعمیر شروع ہوئی تو اس کا ڈیزائن تبدیل کر دیا گیا اور اسے صرف تین ہزار کیوسک رہنے دیا گیا۔ یہ نہر سندھ اور بلوچستان دونوں صوبوں سے گزرتی ہے۔ سندھ میں یہ 35 میل کا سفر طے کرنے کے بعد بلوچستان میں داخل ہوتی ہے اور کچھی کے میدانوں کے علاوہ بگٹی قبیلہ کی کچھ زمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ پٹ فیڈر نصف ملین ایکڑ کو سیراب کر سکتی ہے۔ نہر میں ضروری حفاظتی کام نہ ہونے کی وجہ سے تین سے چار سو کیوسک پانی رس رس کر نیچے کے علاقے بالخصوص مشرقی نصیر آباد کو تباہ کر دیتا ہے۔ اور اس طرح یہ سارا علاقہ ایک عظیم جھیل بن چکا ہے جس نے زرخیز ترین زمین کا ایک لاکھ ایکڑ سے زائد علاقہ سیم اور تھور کے حوالے کر دیا۔ اور یہ ہر سال تقریباً دس ہزار ایکڑ مزید زرخیز زمین کو ناکارہ بنا رہا ہے۔

نہری پانی سے زیادہ تر نصیر آباد کا علاقہ سیراب ہوتا ہے۔ یہاں فی ایکٹر پیداوار پورے علاقے سے زیادہ ہے۔ نصیر آباد ڈویژن کے علاقے میں بہت ساری زراعت نہری زمین پہ کی جاتی ہے۔ اس علاقے میں گندم، چاول، دالیں، کاٹن اور تل جیسی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔

کپاس کی خوب کاشت ہوتی تھی۔ پچھلی صدی کی تیسری دہائی میں شائع شدہ مشہورِ عالم پمفلٹ ''شمس گردی'' میں کچھی کے اندر کپاس کی کاشت اور اس پر ظالمانہ سرکاری ٹیکس کا ذکر موجود ہے۔

یہ نہری زمین تقریباً چار بڑے فیوڈل خانوادوں کی ملکیت ہے: کھوسہ، جمالی، مگسی اور عمرانی۔ یہاں بھی سرف یعنی رعیتی کسان ہیں۔ اور کسان پابند ہوتا ہے کہ بیوی بچوں سمیت فیوڈل کا کام کرے۔ تقسیم پیداوار بارانی علاقوں کی طرح ہوتی ہے۔

مگر یہاں مخصوص بات یہ ہے کہ فیوڈل کے مراثی، ترکھان، لوہار، ملا اور نائب (رئیس) کا متعین معاوضہ کسان اور مالک کی مشترکہ پیداوار سے دیا جاتا ہے۔

نہر آنے سے پہلے نصیر آباد ''بٹائی'' کے نام سے خان کو ٹیکس دیتا تھا۔ اس کی شرح مکمل پیداوار کے چھٹے حصے سے لے کر چوتھائی تک ہوا کرتی تھی۔ کلات کی ریاست کچھ دیگر ٹیکسوں کے علاوہ تجارت پر بھی ٹیکس لیتی تھی۔ جب نہر آئی تو جان جیکب اور نصیر خان دوئم میں یہ معاہدہ طے پایا کہ ٹیکس دونوں آدھوآدھ کریں گے۔ یہ معاہدہ 1843ء میں ہوا تھا۔

میرانی ڈیم

بلوچستان کے مقام تربت سے 30 میل مغرب میں میرانی کے مقام پر میرانی ڈیم تعمیر ہو چکا ہے۔ یہ دو بڑے سیلابی دریاؤں، کیچ اور نہنگ کے سنگم پر ہے۔ یہاں سے آگے بہاؤ سمندر تک جاتا ہے جسے دشت کور کہتے ہیں۔

دشت کو سیلابی دریا ''دشت کور'' سیراب کرتا ہے۔ یہ دریا تربت کے قریب ناصر آباد کے مقام پر بنتا ہے جہاں دو سرکش دریا، نہنگ اور کیچ کور مل کر اس کی تشکیل کرتے ہیں۔ دریائے نہنگ، مند اور تمپ کو سیراب کرتا ہے اور کیچ کور بلیدہ، سامی اور کیچ کو پانی پلاتا ہے۔ مشترکہ کور پھر جنوب کی طرف دشت وادی میں بہتا ہوا سمندر میں اتر جاتا ہے۔ سمندر تک اس کی کل لمبائی 408 کلومیٹر ہے۔

منصوبے کے مطابق میرانی ڈیم پہ 200 کلوواٹ کے تین جنریٹر لگا کر چھ سو کلوواٹ بجلی پیدا کی جائے گی۔ میرانی ڈیم سے دائیں اور بائیں جانب نہریں نکالی گئیں۔ اس منصوبہ کے تحت اس ڈیم سے 32 ہزار ایکڑ زرخیز ترین زمین کو سیراب کیا جا سکے گا۔ اس ڈیم سے سالانہ ٹوٹل ڈسچارج 125000 ایکڑ فٹ پانی ہے اور اس میں چار سال تک کا پانی سٹور کیا جا سکے گا۔

اب کے میرانی ڈیم نے غربت کو گڑھے میں پھینکنے کے بوجھ کو شیئر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

زمین کی تقسیم میں تبدیلیاں

انگریز نے منظم طور پر فیوڈلوں کو لالچ کے نہ ختم ہونے والے نرغے میں ڈال دیا تھا۔ اُس نے انھیں اپنے ساتھ رکھنے اور وطن اور عوام کو ترک کر دینے کے لیے انھیں زمینیں دیں اور اُن

کی خوب مالی مدد کی۔

انگریز نے پورے علاقے میں مالیہ کا نیا نظام نافذ کیا جو کہ ہند کے دوسرے علاقوں میں بھی موجود تھا۔ سرکاری زمین کے ساتھ ساتھ یہاں فیوڈل نجی ملکیت کی مضبوطی کے لیے بھی قوانین بنائے گئے۔ پانی پر ''آبیانہ'' لگایا گیا مگر فیوڈل طبقہ کے لوگوں سے کسی طرح کا مالیہ نہیں لیا جاتا تھا۔

بلوچوں میں زمین ایک معین وقت کے لیے تقسیم ہوتی تھی۔ مری قبیلے میں زمینوں کی پہلی تقسیم 1840ء میں سردار دوداخان کے دور میں ہوئی۔ پھر دوسرے قبائل سے قبضہ کردہ یا بنجر زمینوں کو آباد کرنے کے سبب علاقے میں وسعت آنے کی وجہ سے اُن کے درمیان ہر دس پندرہ برسوں کے بعد زمین مشترکہ بن جاتی اور از سرِ نو نرینہ افراد کے حساب سے تقسیم ہوتی تھی۔ بگٹی میں تقسیم شدہ زمین ایک معین عرصہ بعد پھر اجتماعی بنا دی جاتی۔ اور اُسے زندہ نرینہ انسانوں کی تعداد کے حساب سے دوبارہ بانٹ دیا جاتا۔ پانچ سے دس سالوں بعد ایک بار پھر زمین قبیلے کی مشترکہ ملکیت بن جاتی اور پھر زندہ نرینہ لوگوں کی تعداد کے مطابق دوبارہ تقسیم ہوتی تھی۔

بلوچوں کے علاوہ، یہ باری باری والی تقسیم ساری پڑوسی قوموں میں موجود تھی۔ پشتونوں، ازبک، ترکمن اور وسطی ایشیاء کی ساری قوموں میں یہ نظام مروج تھا۔(7)

بہت بعد میں کچھ قبیلوں نے زمین کو مستقل طور پر تقسیم کر دیا۔ مثلاً بگٹی میں ایک دو قبیلے رہ گئے جو مری کی طرح ہر دس سال بعد زمین تقسیم کیا کرتے تھے۔ جبکہ بگٹی کی باقی زمین مستقل طور پر سات حصوں میں تقسیم ہے۔ جھل مگسی کے علاقے ''کنارا'' میں بھی اجتماعی زمین 1980ء کی دہائی میں مستقل تقسیم ہوئی۔ خاشک دریا سے آنے والا پانی ابھی حال تک ہر سال نئے سرے سے تقسیم کیا جاتا تھا۔

کانک، مستنگ اور جاغی میں ''بوتار'' نظام رائج ہے جس میں زمین مشترکہ ملکیت ہے۔ اُسے کاشت کرنے کی خاطر موروثی بزگروں کو دیا جاتا ہے۔ بوتار نظام میں بزگر کو زمین کی جزوی ملکیت کے حقوق حاصل ہیں۔ وہ پانچویں حصے سے لے کر آدھے حصہ تک زمین کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ مستقل پانی رکھنے والی زمینوں کے قبیلے پابند تھے کہ پانی کے نالے کی صفائی کرتے رہیں۔

آبی زمینوں میں پانی بہر حال زمین سے زیادہ اہم اور قیمتی ہوتا ہے۔ اسی لیے پانی والے علاقوں میں اجتماعی طور پر کاشت کی جانے والی زمین کی پیداوار طائفے کے ارکان کے مابین زمین کے حصوں کے بجائے پانی کے حصوں کو اہم گردانا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ پانی کے حصوں کو رہن رکھنے اور فروخت کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس طرح پانی کے حصے قبیلے کے وڈیروں اور پیسے والوں کے ہاتھوں مرکوز ہوتے گئے۔

ملاّ، سید، اور اسی طرح کے دیگر کام نہ کرنے والے لوگوں کے اخراجات کسان برداشت کرتے تھے۔ انہیں زکواۃ اور نذرانہ کے بطور اناج دیا جاتا تھا۔ ہل اور دیگر اوزاروں کی مرمت کرنے والے کو بھی فصل تیار ہونے پر پیداوار سے مخصوص حصہ ملتا تھا۔

ایک بڑی تبدیلی بلوچ کی زرعی معیشت میں اُس وقت آئی جب 1885ء میں ریل کی لائن ہرک تک، اور 1886ء میں کوئٹہ تک بچھا دی گئی۔ اور 1905ء میں کوئٹہ نوشکی ریلوے لائن کے افتتاح کے ساتھ بلوچستان ریلوے لائن کی لمبائی 481 میل ہوگئی۔ 1906ء میں نوشکی سے زاہدان تک ریلوے لائن کی تعمیر شروع ہوئی۔

یہ ریلوے لائن بلوچستان کے زرعی علاقوں میں سے گزرتی تھی جس سے معیشت میں بہت بہتری آئی۔ مگر چوں کہ زراعت کی ملکیت فیوڈلوں کے ہاتھ میں تھی اس لیے اس ریلوے لائن سے فیوڈل طبقے کو ہی فائدہ پہنچا۔ اُن کے ساتھ ساتھ تاجروں کی لوٹ کھسوٹ کو بھی تقویت ملی جس سے کسانوں کی غریبی اور مفلسی بڑھتی گئی۔ مثلاً مری علاقے میں گہنڑیجی (سپین تنگی) نامی ریلوے سٹیشن ہے جو دکی، ماوند، کوہلو، میختر، بارکھان اور مری کے شمال مغربی حصے کی گویا فارورڈنگ مارکیٹ تھی۔ تصور سے بھی بڑھ کر زیادہ مال یہاں اتارا لادا جاتا تھا۔ 1906ء میں یہاں درآمدات 17,240 من تھے۔ (چاول، چینی وغیرہ) اور 18,500 کے برآمدات (گندم اور پشم) تھے۔(8)

انگریز کا مضبوط کردہ فیوڈل یہاں سے محنت کش کسانوں کا استحصال بہت سخت شکل میں کرتا تھا۔ 1891ء سے 1901ء تک کسانوں سے جو مالیہ لیا جاتا تھا۔ وہ فی ایکڑ دو روپے سے لے کر 2.5 روپوں تک بڑھا دیا گیا۔ ان پیسوں سے 1.5 روپیہ انگریز لے جاتا تھا اور ایک روپیہ خان

کی جیب میں چلا جاتا تھا۔ خانہ بدوشوں سے چراگاہ کے استفادہ کے عوض لیا جانے والا مالیہ بھی ناقابل برداشت حد تک بڑھ چکا تھا۔ مثال کے طور پر تل چوٹیالی کے علاقے کا دس سالوں (1891ء تا 1901ء) کا مجموعی مالیہ ایک لاکھ ننانوے ہزار روپے سے لے کر دو لاکھ ستاسٹھ ہزار روپے تک بڑھ گیا۔

جہاں جاگیرداری ہوگی تو وہاں کسان بغاوتیں بھی ہوں گی۔ اور یہاں بلوچستان میں کسان بغاوتیں انگریز کی غلامی سے آزادی کا مقصد بھی ساتھ لیے ہوئے تھیں۔ عوام جاگیرداروں اور انگریزوں کی طرف سے مسلط مسائل اور مشکلات پہ ہر وقت ردِعمل دکھاتے رہے، کبھی خود رو انداز میں کسی انفرادی پرخاش کی بنا پر، اور کبھی اجتماعی اور منظّم انداز میں۔

انگریز کے خلاف بلوچ خانہ بدوش قبیلوں اور کسانوں کی بغاوتیں 1901ء تک، اور بعد میں بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری رہیں۔ انگریز اور دیگر ساری حکومتیں بلوچوں پر حملوں اور جنگوں کے مسلط کرنے کا جواز یہ پیش کرتی رہیں کہ یہ بہت جاہل، اَن پڑھ اور پسماندہ لوگ ہیں (اور وہ خود گویا ترقی، امن، انصاف کے علمبردار ہیں)۔ مضحکہ یہ کہ اِن کے تمام حملوں اور جنگوں تباہیوں کے باوجود بھی، آج تک بلوچ کو نہ تو ترقی نصیب ہوئی، اور نہ ترقی کے نام پر اُسے گولی سے نجات میسر آئی۔ انگریزوں کے اخبار کا یہ فقرہ پڑھیں اور پھر راجہ احمد خان کی سرکار کے بیانات پڑھیں، آپ حیران رہ جائیں گے کہ صدیوں کے فرق کے باوجود تمام غاصب یکساں فقرے استعمال کرتے ہیں: ''یہاں لوگوں کی زندگی کے حالات بہتر ہوئے جہاں لوگ پہلے خانہ بدوش اور بدّو کی سی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے''۔ (ارے بابا جس وقت ہم خانہ بدوش تھے، انگریز بھائی صاحب، آپ خود سمندری قزاق تھے، لٹیرے تھے!!)۔ انگریز صحافیوں نے نہ تو یہ لکھا کہ اُن کی قوم ہم خانہ بدوشوں کی مویشی اور زمین پر ناروا ٹیکس لیتی ہے' نہ انھوں نے فیوڈل مظالم کا تذکرہ کیا اور نہ ہی اجارے والی زمینوں سے غلامانہ شرائط کی بات کی۔

انگریز نے گو کہ، ادارے کے بطور سر قبیلوی نظام کو مضبوط کیا' مگر ساتھ ساتھ بائی پراڈکٹ کے بطور غیر محسوس انداز میں سماجی معاشی حالات میں بنیادی تبدیلیاں ہوئیں۔ یوں اُس

نے بلوچستان میں مجموعی طور پر بڑی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔

انگریز نے چاغی، بولان اور کوئٹہ، خان قلات سے لیز پر لے لیے۔ اسی طرح ژوب اور لورالائی کا کچھ حصہ انگریز کے ہاتھ آیا۔ پھر، کوہلو اور بارکھان رضا کارانہ طور پر برطانوی حفاظت میں آئے۔

1887ء میں انگریزوں نے اپنے قبضے کے علاقے میں فصل پر جا کر تخمینہ لگا کر ٹیکس وصول کرنا شروع کیا۔ بعد میں وہ مغل حکمرانوں کی طرف سے لاگو ٹیکس کے نظام پر چلے جو کہ عموماً فصل کا چھٹا حصہ ہوا کرتا تھا۔ اپنے زیرِ تسلط بلوچستان میں انگریز خود ٹیکس جمع کرتے تھے مگر ایجنسی کے علاقوں میں انہوں نے قبائلی سرداروں کو یہ اختیار دے رکھا تھا۔ یہ سردار اپنے ذیلی فرقوں اور طائفوں کے بڑوں کو یہ ذمہ سونپ دیتے تھے۔

ٹیکس کے نظام کی ترقی کے لیے 1908ء کی ایک تحریر یوں بتاتی ہے: ''موجودہ طریقوں کو بنیاد بنا کر بہتر نظام متعارف کرایا گیا ہے۔ لینڈ ریونیو کے موجودہ طریقے یہ ہیں:

1۔ سالوں کے ایک دورانیہ کے لیے نقد تخمینہ (جمع بست)

2۔ عارضی نقد تخمینے (اجارہ)

3۔ پیداوار کی تقسیم (بٹائی)

4۔ کھڑی فصلوں کا تخمینہ (تشخیص، دانہ بندی)

5۔ فصلات کے حصے کی پیمائش کے بعد حکومتی حصے کی نقد تشخیص (تشخیصِ نقدی)۔

نمبر شمار 4 اور 5 کی حالتوں میں حکومت کا حصہ آٹھویں سے تہائی تک تھا۔ ان تمام آبادیوں میں جن کا نظامِ آبپاشی انگریزوں نے بنایا تھا، فصل کی تہائی لی جاتی تھی۔ 1887ء میں ایجنسی کے علاقوں کے لیے ٹیکس جمع کرنے کو ایک جیسا کیا گیا۔ ٹیکس کی شرح چھٹا حصہ مقرر کیا گیا۔

انگریز نے ٹیکس، دوروں اور دیگر امور کی آسانی کے لیے ڈاک بنگلے، انسپیکشن بنگلے، اور سرکٹ ہاؤس بنائے۔

******

جیسے کہ ہم نے دیکھا،نہری زمین کے علاوہ بلوچستان میں آبی زمین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں قدرتی چشمے،رہٹ، ٹیوب ویل یا کاریزیں آبیاری کرتی ہیں۔ان زمینوں پر دوروایتی فصلوں کے علاوہ نقد آور فصلیں (یعنی سبزیاں اور پھل) بھی کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں رعیتی کسانوں (سرفوں) کے علاوہ یومیہ اجرت والے کھیت مزدور بھی کام کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ فیوڈل اپنی زرعی پیداوار کے حوالے سے منڈی سے وابستہ ہیں۔اس لیے ٹرانسپورٹ کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔

کھیت مزدور گو کہ رعیتی کسانوں کی طرح پوری زندگی فیوڈل کے غلام نہیں رہتے مگر انہیں بھی کوئی آئینی وقانونی تحفظ حاصل نہیں ہے۔

زرعی پیداوار

بلوچستان میں ایک لاکھ ٹن فروٹ پیدا ہوتا ہے۔1985-86ء میں 38,524 ہیکٹر زیر پھلوں کی کاشت ہوتی تھی۔(9) اس کی مارکیٹنگ بہت فرسودہ ہوتی ہے،اور پیکنگ بھی تھرڈ کلاس۔ گریڈنگ اچھی طرح کرنی ہوگی۔ عموماً پھلوں کے درخت کراچی، بالائی سندھ اور پنجاب کے تاجروں کو پیشگی فروخت کیے جاتے ہیں۔اگر یہ پھل والے درخت ایڈوانس میں بیچنے کے بجائے وہ پھل ہی فروخت کریں تو انہیں کافی فائدہ ہوگا۔اس کے لیے فروٹ کی ہول سیل مارکیٹ قائم کرنا ہوگی۔

پھلوں میں سیب کی پیداوار سب سے زیادہ ہے۔ 85-1984ء میں سیب کی پیداوار 79400 ٹن تھی۔ پاکستان کے سیب کی کل پیداوار کا 56 فیصدی بلوچستان پیدا کرتا ہے۔(10) سیب کو Dehydrate کر کے بھی بہت پیسہ کمایا جاسکتا ہے۔سیب کے علاوہ ہم دوسرے میووں اور سبزیوں کو بھی Dehydrate کر سکتے ہیں،جن کی پیداوار بلوچستان میں بہت ہوتی ہے،مثلاً:

زرد آلو (39000ٹن)

آڑو (26000ٹن)

Plums (12500ٹن)

دھنیا (1100ٹن)

مرچیں (2700ٹن)

لہسن (800ٹن) (11)

ہم کھجور، چیری، سیب اور انگور کے لیے پراسیسنگ اور پیکنگ یونٹس قائم کر کے جام، جیلی، مربہ، اچار، چٹنی اور لیمن سکواش بنا سکتے ہیں۔

شمالی بلوچستان جو باغات کا علاقہ ہے، وہاں 43 فیصد رقبے پر گندم کاشت کی جاتی ہے۔ میوے 31 فیصد پر اور بقیہ رقبہ پر خربوزے، تربوز، سبزیاں اور تمباکو کی کاشت ہوتی ہے۔ خاران میں بھی گندم ہی بڑی فصل ہے۔ میووں میں سیب، انگور اور انار ہوتے ہیں۔

کھجور

مکران میں 30 ہزار ٹن پیدا ہونے والی کھجور بہترین کھجوروں میں تصور کیا جاتا ہے۔ جن علاقوں میں کھجور پیدا ہوتا ہے، وہاں یہ صدیوں سے بنیادی خوراک رہا ہے۔ مکران تقریباً 40 قسم کی کھجوریں پیدا کرتا ہے۔ جن میں سے بیگم جنگی، آبے دندان، خنزن باد، شکر، کلونٹ، ہُشکلینچ، کلوت، محمد حسنی، کہروا، زرد، چپ شانک، چینی، شنگشکان، پشپاگ، شکری، پیشنا، سبزو، کنگن، سنٹ گورگ، روغنی، کروچ، شکاش، مکلی، موزاوتی، الینی، ربائی، جواں سُہر اور ڈنڈالی موزاتی، شکری، ھیلنی، دِشتاری، پیش نا، روگنی، گونزلی، چرپان، ماکلی، جدگالی، پیشپاگ، مشوری، پٹولی، گوک ناہ، سبزو۔لنگو، کہربا، ڈنڈاری، برنی، شریفہ، گُش، وش کلونٹ، ریدگ شامل ہیں۔(12)

مکران کے کھجور میں شکر کی مقدار کافی زیادہ ہوتی ہے، اس لیے یہ خوراک کے علاوہ صنعتی پراسیسنگ کے کام بھی آتا ہے۔ اس میں تقریباً انسانی ضروریات کے سارے اجزا شامل ہوتے ہیں۔ جتنی توانائی ایک درمیانے سائز کا سیب دیتا ہے، پانچ، چھ دانے کھجور اس سے دگنی توانائی دیتے ہیں۔

کھجور کی فارمنگ برآمدات کے لیے ڈویلپ کی جاسکتی ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کی طرح غیر معمولی لمبی کھجور بلوچستان میں بھی کاشت کی جاسکتی ہے۔ جس کی بالخصوص بہت برآمدی قیمت مل سکتی ہے اور جس کی عرب ممالک میں بہت مانگ ہے۔

کھجور سے جام، مٹھائیاں، جوس وغیرہ بنتے ہیں۔ ہمارا کھجور کراچی میں پراسیس ہو

کر وہاں سے برآمد ہوتا ہے۔

کھجور سے وابستہ پوری معیشت قابلِ مطالعہ ہے۔

تربت کا ''ہامین'' جون کے ماہ میں پنجگور کے ہامین سے ذرا جلدی آجاتا ہے اور اگست کے ماہ تک چلتا ہے۔ ہامین گندم، گنے، اور کپاس کی فصل پکنے جیسا اہم موقع ہوتا ہے۔ قرض خواہوں کے قرضے ادا کیے جاتے ہیں۔ بچوں کی شادیوں وغیرہ کے لیے چار پیسے مل جاتے ہیں۔ اور اہل وعیال کے لیے کپڑا لتا خریدنے کا بندوبست ہوتا ہے۔

پنجگور کا ہامین اگست میں شروع ہوتا ہے۔ تین ماہ تک چلتا ہے، اور اکتوبر میں ختم ہوتا ہے۔ یہاں کسان عموماً یومیہ اجرت کے حساب سے یا پھر پیداوار کے حساب سے اپنا حصہ لے لیتا ہے۔ چونکہ کھجور کو ڈبوں میں بند کرنے یا سرد خانوں میں رکھنے کا رواج نہیں پڑا ہے اور نہ ہی کھجور سے وابستہ کوئی صنعت موجود ہے۔ کوئی پیکنگ نہیں، کوئی مربع اچار کی فیکٹریاں نہیں، کوئی dehydration پلانٹس نہیں۔ اس لیے یہ بڑی پیداوار سمجھو منڈی کے لیے ہے ہی نہیں۔ ضیاع..... وسائل کا بے دریغ ضیاع۔ اس لیے کسان اور مالک دونوں ہی ناگفتہ بہ زندگی گزارتے ہیں۔ اب تو ایرانی کھجور خوبصورت انداز میں پیکٹ شدہ اور محفوظ شدہ اور سستی قیمت پر دستیاب ہے۔ لہٰذا مکران اور خاران کے کاشتکار مزید تباہ حال ہیں۔ نیز یہ باغبانی بھی بارشوں پر انحصار کرتی ہے اور مکران وخاران بارشوں کے خانوادے سے نہیں ہیں۔ بالخصوص یہ علاقہ مون سون کی رینج سے دور ہے۔ اس لیے کھجور کی پیداوار سے متعلق ہر شخص گھسٹ گھسٹ کر زندگی گزارتا ہے۔

آم

میں حیران ہوا جب بتایا گیا کہ تربت کے علاقے نلینٹ کے آم بہت مشہور ہیں۔ تمپ میں بھی اچھا آم ہوتا ہے۔

مکران کے آم کی بات دو سو سال قبل بلوچستان کے انتہائی مشرقی کونے کے مست توکلی کی شاعری میں موجود تھی۔ حالاں کہ نہ سڑک موجود تھی اور نہ انفارمیشن ٹکنالوجی کی سہولتیں نہ ہی اُس زمانے میں وہاں آم اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ مارکیٹ لے جایا جا سکے۔ اور واقعی نلینٹ اور تمپ کے آم

کی شیرینی کی تشبیہ محبوبہ سے دی جاسکتی ہے۔

آلو

بلوچستان میں آلو کی پیداوار 85-1984ء میں 79.4 ٹن تھی۔ آلو کو پراسیس کر کے Dehydrated Potato Granules , Potato Flour اور Potato Rice بنائے جاسکتے ہیں۔

زیرہ

زیرہ قلات جیسے علاقوں میں بڑے پیمانے پر کاشت کیا جاتا ہے۔

زعفران

مستنگ کے علاوہ بھی اب کہیں کہیں زعفران کی کاشت ہوتی ہے۔ زعفران کی پیداوار کو بڑھایا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ مقامی مارکیٹ کے علاوہ اس کی برآمد کے بھی کافی اچھے امکانات موجود ہیں۔

******

نہری زراعت میں پیداواری رشتے

صورت حال یہ ہے کہ بلوچستان کے نہری زرعی علاقے میں کھیت مزدور یعنی کسان کی حالت انتہائی خراب ہے۔ وہ ہر لحاظ سے پسماندہ ہے۔ قرض اور مرض دونوں کسان کے پکے اور گہرے دوست ہیں۔ یہاں ہر چیز موروثی ہے۔ جاگیردار بھی موروثی، کسان بھی موروثی، قرض بھی موروثی، مرض بھی موروثی یہ سب خود بخود اگلی نسلوں کو منتقل ہوتی جاتی ہیں۔ اُنڑ، ٹانوری، بمبل، پیچوہو، ودیگر لوگ چار نسلوں سے کھیت مزدور کے طور پر کام کرتے آرہے ہیں۔

زمیندار ایک مخصوص رقم بطورِ قرض ضرورتمند کسان کو دیکر نصف پیداوار کی شرط پر زمین آباد کرنے کا معاہدہ کرتا ہے۔ یہ رقم کسان کو خاندان سمیت گروی رکھنے کا گویا ضمانت ہوتی ہے۔ اِس رقم میں ہر سال مزید قرضہ کی صورت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس زمیندار سے جان چھڑانے کا

فی الحال ایک ہی طریقہ رائج الوقت ہے۔ وہ یہ کہ کسی دوسرے زمیندار سے مطلوبہ رقم بطور قرض لے کر پہلے والے زمیندار کو ادا کرے اور خود اب اِس دوسری جگہ پہ گروی ہو جائے۔ یعنی مالک بدلتا رہے۔ اس طرح یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ (ایسے کسان کو انگریزی میں ''سرف'' کہتے ہیں۔ اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں)

زمین زمیندار کا، بیج کسان کا ہل، کھاد، سپرے و دیگر اخراجات نصف نصف، تھریشر کسان کے ذمے اور کسان کی محنت کا کوئی حساب کتاب نہیں۔ بیج کا اختیار کسان کے ہاتھوں سے نکل کر زمیندار کی سہولت کاری میں دلالوں کے معرفت ملٹی نیشنل ہائبرڈ کمپنیوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ اجارہ دار کمپنیاں ایک ہی قسم کے بیج کو مختلف ناموں اور مختلف قیمتوں سے مارکیٹ میں لاتے ہیں۔ زمیندار بہتر پیداوار کی لالچ میں دلالوں کے ہتھے چڑھ کر اُدھار پر مہنگے داموں خرید کر بیج کسان کے سر تھوپتا ہے۔ یہی حال کھاد اور زرعی ادویات کا ہے۔ مقابلے کی اس دوڑ میں دو نمبر چیز بھی چل جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ فصل اور کسان کی تباہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہل میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔ زمیندار کے کارندے اپنے مرضی سے کسان پہ مشین (ٹریکٹر وغیرہ) کے گھنٹے لکھتے ہیں۔ ہل، بیج اور کھاد کے سلسلے میں کسان کو مشورے سے باہر رکھا جاتا ہے۔ اُسے خاموشی سے حکم پہ عمل کرنا ہوتا ہے۔

زراعت میں اب ہر کام مشینری کا محتاج ہو گیا ہے۔ اور مشینری زمیندار کی مہربانیوں سے کسان کو مزید مقروض کرنے کا سبب بن رہی ہے۔ فصل کٹائی کے اپنے ریٹ، تھریشر کے اپنے ریٹ۔ اب وہیپر، ہارویسٹر (علاقائی نام چوٹی پٹ) سب کام کر رہے ہیں۔

زرعی پیداوار کا زیادہ تر حصہ زمیندار کی مہربانیوں سے دلال کے معرفت سرمایہ داروں کے پاس چلا جاتا ہے۔ کسان کو کھانے کے لیے بھی مشکل سے اناج میسر آتا ہے۔ خوشی غمی اور دیگر ضروریات زندگی کے لیے کسان کو مارکیٹ سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اور مارکیٹ تو بے رحم ہے اسے منافع سے غرض ہے۔ مارکیٹ اپنا مال اور رقم سود کی صورت میں نکال لیتا ہے۔ اس لیے کسان ہمیشہ قرضوں تلے دبا رہتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اکثر زمینداروں نے اپنی دکانیں اور مارکیٹ بنا

رکھے ہیں۔ وہ ضرورت کی ہر چیز حتیٰ کہ موٹر سائیکل تک کسانوں کو مہنگے داموں اُدھار پر دیتے ہیں۔

کسان گھرانے کے تمام افراد صبح سویرے سے رات گئے تک کھیتوں میں کام کرتے رہتے ہیں۔ سردی گرمی اور موسمی سختیوں سے بے نیاز کسان مرد، عورتیں، بچے ننگے پاؤں کام میں جُتے رہتے ہیں۔ اور کمائی زمیندار و ساہوکار کے جیب میں چلا جاتا ہے۔

فیوڈل علاقوں میں کسان کے حصے کا اناج بھی زمیندار اپنے گوداموں میں رکھتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر کسان بوری لے کر زمیندار اور کمدار کی منتیں کرتا رہتا ہے۔ یعنی اپنی کمائی تک پہ بھی کسان کی رسائی نہیں۔

کسان کے لیے کوئی ہسپتال نہیں، سکول نہیں۔ زمیندار بھوتار بھی ہے۔ وزیر بھی ہے مشیر بھی ہے، آفیسر ہے سب کچھ ہے اور کسان محض کسان ہی ہے نسل در نسل کسان۔

کسان صرف زمین آباد نہیں کرتا ہے اُسے زمیندار کے لیے کچھ اضافی کام بھی مفت میں کرنے پڑتے ہیں جو زمیندار کا بیگار ہوتا ہے۔ اس کے گھر اور بیٹھک کے کام، جانوروں کے لیے چارہ وغیرہ، گھر و بیٹھک کے لیے لکڑیاں وغیرہ۔

ریفرنسز

1۔عطائی،ابراہیم،''خیل اوویش''1981۔افغانستان اکیڈمی آف سائنسز،کابل۔صفحہ 32
2۔اخوندصالح محمد/عبداللہ جان،اورنادرقمبرانی۔''گوردگال نامک''۔1994،بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔صفحہ 26
3۔ول ڈورانٹ/ظفرالحسن،''تاریخ کیا سکھاتی ہے''۔1990۔صفحہ 20
4۔ڈسٹرکٹ پروفائل،سبی۔صفحہ 29
5۔گزٹیئرز آف بلوچستان۔کچھی۔دوسرا ایڈیشن،1986۔گوشۂ ادب کوئٹہ۔صفحہ نمبر 93۔
6۔سبی گزٹیئر،صفحہ 111
7۔پیکولین۔بلوچ۔صفحہ 147
8۔سبی گزیٹیئر۔صفحہ 228
9۔سیدمجیب رضا،Investment Opportunities in Balochistan۔الوہاب پرنٹرز کراچی،صفحہ 34
10۔سیدمجیب رضا۔صفحہ 34
11۔سید،مجیب رضا۔صفحہ 118
12۔کیچ پروفائل،صفحہ 37

تیسرا چیپٹر

کسان تحریکیں

مزدکی تحریک

اس تحریک کا تذکرہ ہم گذشتہ جلد میں بھی کر پائے آئے ہیں۔اس پر مزید تفصیل میری کتاب''مزدک' میں بھی موجود ہے۔ یہاں اس بڑی کسان تحریک کا صرف ایک تعارف دیا جارہا ہے۔

مزدک ایک زرتشتی مذہبی پیشوا تھا مگر اُسے عوام الناس کی بے پناہ غربت نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ بادشاہوں اور ملاؤں کے جبری ٹیکسوں نذرانوں نے آبادی کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

مزدک نے اس حرص اور ظلم سے نجات کے لیے''جائیداد'' کے خاتمے کو اولین اور اہم ترین قدم قرار دیا۔اسے معلوم تاریخ میں اولین سوشلسٹ ہونے کی شہرت حاصل ہے۔

شہزادہ خسرو(انوشیروان) مزدکیت کا دشمن تھا۔اس لیے درباری اشرافیہ اور موبد اُسے ولی عہد بنانے پر متفق ہوئے۔ اِس حکمرانی میں بادشاہ اور شہزادوں کے بعد سب سے بڑے مذہبی راہنما موبد موبدان (ملاؤں کا ملا) کا نمبر آتا تھا، پھر ملا یعنی موبدان تھے۔اس طرح حاکمیت میں خودغرض اشرافیہ طبقہ بھی (وزرگان) ملاؤں کے ساتھ شامل تھا۔

ان سب سرداروں،اور ملاؤں کو پالنے والے کسان (دہقانان) تھے۔اِن دہقانوں کو ایک لحاظ سے غلام کی حد تک پست رکھا گیا تھا۔وہی جنھیں آج کل''کھیت مزدور'' کہتے ہیں۔وہ اُن زمینوں پہ کام کرتے تھے، جو مالکان کی طرف سے اُن میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ یہ لوگ مالکان کو زمین کا مالیہ(خراگ،یعنی خراج)ادا کرتے تھے۔(1)

اشرافیہ طبقہ بے حساب دولت رکھتا تھا۔ امیر لوگ کھانے پینے کی اشیا بڑے پیمانے پر ذخیرہ کرتے تھے۔ اِس حد تک کہ مصنوعی قحط پڑ جاتا تھا۔

اہل کار دندناتے ہوئے رعایا کے گھروں میں گھس کر تلاشیاں لیتے۔ غریب غربا اور کمزوروں کی بہو بیٹیاں گھسیٹ کر اپنے آقاؤں تک پہنچا دیتے۔ امرا کی عیاشیاں زوروں پہ تھیں۔

مزدک نے لوگوں سے کہا: ''جس جگہ بھی غلے کا ذخیرہ موجود ہو اُسے لوٹ لیا جائے۔ (2)......اور قیامت آ گئی۔ کسانوں، مزدوروں اور کان کنوں کے غول امرا کے آراستہ و پیراستہ مہمان خانوں کا اسباب لوٹتے رہے۔

بادشاہ نے مزدک کو ایرانی شہنشاہیت کا دشمن قرار دیا۔ چنانچہ مزدکیوں کا قتلِ عام شروع کیا گیا۔ اس قتلِ عام کی قیادت کباد کے ولی عہد شہزادہ انوشیرواں نے کی۔

کہتے ہیں کہ انوشیروان نے شام کے وقت ایک جشن منعقد کرنے کی تاریخ مقرر کر دی جس میں اس نے جھوٹ موٹ میں علی الاعلان طور پر باقاعدہ مزدکیت قبول کرنا تھی۔ اس نے شاہی باغ میں یہ جشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس کے دعوت نامے مزدکیوں کو جاری کیے۔

مقررہ دن پر جب مزدکیوں کا ہر گروپ باغ میں داخل ہوتا تو پہلے سے چھپے ہوئے فوجی انھیں پکڑ لیتے' اور انھیں سر کے بل زمین پر اس طرح گاڑ دیتے کہ اُن کی ٹانگیں زمین کے اوپر ہوا میں ایک درخت کی طرح نظر آتیں۔

جب سب قتل کر دیے گئے اور جب مزدک آ گیا تو پھر خون آشام انوشیروان کے اندر جا کر فوجیوں نے مزدک کو قابو کر لیا۔ باغ کے وسط میں اسی مقصد کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ بلند مقام پر اسے زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا اور بے شمار تیروں سے اسے چھلنی کر دیا۔ یہ واقعہ 528ء کے اواخر یا 529ء کے اوائل میں پیش آیا۔

انوشیروان اپنی بے پناہ جلالت وقوت سے مزدکی بلوچ کاشتکاروں اور مویشی بانوں پر ٹوٹ پڑا۔ مگر ظاہر ہے اتنے بڑے اور منصفانہ نظریے کو ختم تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انوشیروان نے 531ء میں مزدکیوں کے قتل عام کا ایک اور دور چلایا۔ کہتے ہیں کہ اس چنگیز کے ہاتھوں تیس ہزار

مزدکی مارے گئے۔ (اندھے دانش وروں نے قاتل کو ''عادل'' بنا ڈالا)۔

اُس نے بہ ظاہر مزدک کی تعلیمات کو مکمل طور پر تباہ کر دیا مگر یہ فلسفہ تو مزدک کی شہادت سے بعد بھی کئی صدیوں تک جاری رہا۔ بلاشبہ مزدک کی تحریک ہمارے خطے کی تاریخ میں سب سے بڑی طبقاتی تحریک تھی۔ (3)

مزدکیت کا دورا اسلام آنے سے بہت پہلے کا دور تھا۔ غالب خیال ہے کہ اسلام سے قبل بلوچوں کی اکثریت اسی انقلابی مسلک ''مزدکیت'' سے وابستہ تھی۔ اور یہی بات دُشمنی اور نفرت کی اُس گہرائی اور شدت کا باعث تھی جو انوشیروان کو بلوچوں سے تھی۔

نفرت و دشمنی کی اور بھی چھوٹی موٹی وجوہات ہوں گی مگر اس قدر راتھاہ نفرت تو طبقاتی نفرت ہی ہوا کرتی ہے۔ ایک قوم نچلا طبقہ بن چکی تھی اور بادشاہی نظام سے ٹکرا گئی تھی۔

جھالار و کسان بغاوت

ہم اُس بڑی کسان تحریک کے بارے میں بھی ابھی جان سکے ہیں جو آج سے پانچ صدی قبل 1574ء میں خضدار کرخ کے علاقے جھالارو میں چلی تھی۔ اتنی بڑی کسان بغاوت کہ اسے کچلنے کے لیے خان قلات امیر سنجر کو ایک بڑا لشکر ''جھالارو'' بھیجنا پڑا تھا۔ سخت لڑائی ہوئی تھی۔ کسانوں کا لیڈر رسو مآر جنگ میں مارا گیا اور کسان تحریک کچل دی گئی تھی۔

1717ء کی کسان بغاوت

یہ تحریک شاہ عنایت شہید لنگاہ کی قیادت میں سب سے اولین نرالی تحریک ہے۔ نرالی اس لیے کہ یہ صرف کسانوں کی تحریک، اُن کی جنگ اور بالآخر اُن کی شکست نہ تھی بلکہ اس لیے کہ یہ دنیا کا اولین کسان کمیون بھی تھا۔ دنیا میں کمیون بعد میں بھی بہت قائم ہوئے، مگر یہ اولین معلوم کمیون تھا۔ اسی طرح یہ بھی دیکھیے کہ کارل مارکس اس تحریک کے 100 سال بعد پیدا ہوا (1818-83ء)۔ پیرس کمیون (1871ء) اس کے 154 سال بعد میں ہوا۔ اور لینن کے سوشلسٹ انقلاب کو 200 سال بعد میں آنا تھا۔ (4)

یہ اس لیے بھی نرالی تحریک تھی کہ اس میں دشمن نے سبی سے لے کر مکران تک کی اپنی

فوجوں اور اتحادیوں کو اس کے خلاف موبلائز کر دیا تھا۔

اور یہ بھی پہلی بار تھا جب بہت صاف، بہت واضح بات کی گئی ''زمین اُس کی جو اُس پہ ہل چلاتا ہے''۔

ششک تحریک

بلوچستان میں سردار زرعی ٹیکس کی صورت میں پیداوار کا چھٹا حصہ لیتا تھا جسے ''ششک'' کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ چونکہ بلوچستان کی زرعی معیشت نیم خودمختار سرداریوں اور جاگیرداریوں میں بٹی ہوئی تھی اور ہر سردار اور فیوڈل، اپنے علاقے میں کسانوں پر ٹیکس ریٹ فکس کرنے کا اختیار رکھتا تھا اس لیے بلوچستان میں کبھی بھی ایک جیسے ٹیکس کا نظام مروج نہ ہوا۔

ہم آپ کو یاد دلائیں کہ 1970ء کی انتخابی مہم کے دوران نیشنل عوامی پارٹی نے عوام کے لیے بہت پرکشش انتخابی نعرے دیے تھے جن میں سے ایک یقین دہانی یہ تھی کہ کاشتکاروں کو ششک کی لعنت سے نجات دلائی جائے گی۔ لیکن جب یہ پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو بجائے ششک ختم کرنے کے اس کے سردار ششک کی وصولی کے لئے کاشتکاروں کے خرمنوں پر آن موجود ہوئے۔ کاشتکاروں نے اُنھیں اُن کے انتخابی وعدے یاد دلائے، فریادیں کیں، وفود بھیجے، پریس کانفرنسیں کیں مگر سردار اب سب کچھ بھول چکے تھے۔

1972ء کی ربیع کی فصل اٹھانے کے موقع پر جھلاوان بالخصوص جھل جھاؤ، کولواہ اور گریشہ کے کاشتکاروں نے ششک کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ حکومت غصہ سے آگ بگولہ ہو گئی اور 4 جون 1972ء کو کاشتکاروں پر مسلح حملہ کر دیا۔ گولیاں چلیں، کھلیان جلے مگر کاشتکاروں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ایک کاشتکار کرم داد چنال حملہ آوروں کی گولیوں سے شہید ہو گیا۔

یہ تحریک ڈبل ٹیکسوں کے خلاف تھی جس سے فطری طور پر ملکیت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دراصل، یہ زمین ایک زمانے میں ریاست قلات کی تھی جس نے سرداروں کو ایک معین وقت کے لیے ریونیو اکٹھا کرنے کا حق دیا تھا۔ اب وہ ریاست ختم ہو چکی تھی اور ٹیکس جمع کرنے کا سابقہ اختیار بھی معدوم ہو چکا تھا۔ اب یہ زمین یا تو نئی ریاست یعنی پاکستان کے صوبہ بلوچستان کی تھی، جسے

زمین پر ٹیکس لینا چاہیے تھا، یا یہ زمین اُن لوگوں کی تھی جو درحقیقت اُسے کاشت کرتے تھے۔ کسانوں نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ بہ یک وقت حکومت کو بھی ٹیکس دیں اور سردار کو بھی ششک دیں۔ چنانچہ کسانوں نے سرداری ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔

صوبائی حکومت کی جوابی کارروائی بہت تیز تھی۔ چنانچہ صوبائی ملیشیا، پولیس اور فیوڈلوں کے باڈی گارڈ جون کے مہینے میں فل ایکشن میں آئے۔

سرداروں کے باڈی گارڈ دراصل دہشت کے سکواڈ ہوتے تھے۔ سردار انھیں عام لوگوں کو ''سیدھا'' رکھنے اور مڈل کلاس کو ڈرانے کے لیے رکھتے تھے۔ وہ سردار کی خاطر ریونیو اور ٹیکس وصول کرتے تھے اور فیوڈل نظام کے استبدادی قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دیتے تھے۔

چنانچہ جھل جھاؤ میں بزنجو، مینگل اور محمد حسنی قبیلوں سے ایک ہزار مسلح افراد نے کسانوں پہ حملہ کر دیا۔ ایسا حملہ کہ دہشت و وحشت کی تمام حدود کو پھلانگ دیا گیا۔ پہلے ہی ہلے میں جھل جھاؤ کے 400 سے زائد کسان گرفتار کر لیے گئے۔ ہزاروں کو جھاؤ، آواران اور دوسری جگہوں سے نکال باہر کر دیا گیا۔

جھل جھاؤ کے مظلوموں کی جدوجہد پورے بلوچستان میں اثر دکھانے لگی۔ اور جگہ جگہ سے کسان بغاوتیں ابھرنے لگیں۔ مکران، کچھی، راڑہ شم، اور چاغی سے ''کسان ابھار'' کی خبریں آنے لگیں۔

کچھی تو بالخصوص جاگیرداروں کی نارروائیوں کی آماجگاہ تھا۔ ٹیکسوں کی جبری وصولی کے سلسلے میں وہاں کی کسان آبادی پر جو مظالم روا رکھے گئے، ان پر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ انھیں قتل کرنا، ان کے گھروں کو جلانا اور انھیں بےعزت کرنا عام باتیں تھیں۔ بالآخر وہاں کے کسانوں نے غازی خان بنگل زئی کی قیادت میں جاگیرداروں کے خلاف مدافعت کا مظاہرہ کیا۔ اس جدوجہد میں غازی خان کو قتل کر دیا گیا۔

اسی طرح راڑہ شم میں غرشین سردار، لونی سردار اور سرکار کی ملی بھگت سے کسانوں پہ ناروا

شِشک مسلط تھی۔اُس کی وصول یابی کے خلاف زبردست آواز بلند ہوئی۔

منگوچر میں بھی اس ظالمانہ ٹیکس کا ہولناک کرشمہ رونما ہوا۔جہاں سرکاری روایت کے مطابق 9 مظلوموں کو ہلاک اور بچوں عورتوں سمیت 40 افراد کو زخمی کر دیا گیا۔

اسی دوران ایک مرتبہ پھر جھل جھاؤ میں جاگیرداروں کے مسلح جتھے کے ہاتھوں ایک کاشتکار دل مراد، اس کے بیٹے محمد حسین اور بہو کے شہید ہونے کے علاوہ کاشتکاروں کی تیار فصل کے کھلیان اور گھروندوں کو نذرِ آتش کرنے کی سفاکانہ واردات ہوئی۔

پیپلز پارٹی کی بدنیت مرکزی حکومت، بلوچستان کے کسانوں کی عارضی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے تگ ودو کرنے لگی۔چنانچہ شِشک کے خاتمے کے لیے ایک غیر واضح اور مبہم آرڈیننس کا اعلان کیا گیا۔اعلان کر کے اُس کا ڈھنڈورا پیٹا گیا۔اور جس وقت یہ شِشک آرڈیننس اسمبلی میں پیش ہوا تو پیپلز پارٹی ہی کے لیڈر غوث بخش رئیسانڑیں نے بہت کوشش کی کہ آرڈیننس سرے سے پیش ہی نہ ہو مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔البتہ وہ اس میں ترمیم لانے میں کامیاب ہوا۔اس کا مطمع نظر یہ تھا کہ:

1۔شِشک کو سرداری ٹیکس کے نام سے نہ پکارا جائے......اور

2۔شِشک کو حقِ مالکانہ سے جدا کیا جائے۔

نیپ کے دانش وروں نے بھی حسبِ معمول کوئی اچھا کردار ادا نہ کیا۔انھوں نے سیدھا سیدھا کسانوں کی اس تحریک کو امریکی سامراج کے اشارے اور بھٹو کی پشت پناہی کا نتیجہ قرار دیا۔

چنانچہ کسانوں اور ان کی لیڈر شپ کے خلاف وطن کے غدار، ''بلوچ قوم کے غدار'' جیسے فتوے عائد کیے۔وہی ''بلوچ قوم کے غدار'' والا فتویٰ اب اُن کی اپنی اولاد بھگت رہی ہے۔

بہر حال پیپلز پارٹی نے ترمیمات بھرے اپنے مبہم آرڈیننس کو صوبائی اسمبلی سے پاس کروایا۔گرفتار کسانوں کو رہا کر دیا اور ہی صوبہ بدر کسانوں کو واپس بلا کر، انھیں غیر ملکی ''دوروں'' پر بھیج دیا۔اس طرح پیپلز پارٹی اپنی روایت کے عین مطابق اس کسان تحریک کو بھی سبوتاژ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔شِشک کی زبردست تحریک بڑی کامیابی کے ساتھ، بڑی عمدگی سے، اور بڑی

کلاکلاری کے ساتھ تخریب کر دی گئی۔

لیکن اِس دوران یہ مختصر مگر بہت موثر کسان تحریک بڑا ادب پیدا کر گئی، جسے اکٹھا کر کے منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ہم کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے بطور صرف مشہور شاعر مراد ساحر کی نظم ''شِشک'' ہی نقل کر پا رہے ہیں جو ''نوائے وطن'' کے 25 اگست 1973 کے ''شِشک ایڈیشن'' میں شائع ہوئی تھی۔

پٹ فیڈر اور اُس کی کسان تحریک

انیسویں صدی کے نامور شاعر تاج محمد تاجل نے کسانوں کی بدحالی کو دیکھ کر جاگیرداروں کو یوں کوسا تھا:

تم اگر انسان ہوتے
صاحبِ ایمان ہوتے
پاک پرودگار کی قسم
ہرگز نہ کرتے یہ ستم
وہ بھی تو انسان ہیں
تو یہ حیوانی سلوک
اس پر ستم فاقہ و بھوک
حیران ہوں کہ روزِ جزا
تم کو ملے گی کیا سزا؟

بلوچستان بھر کی طرح نصیر آباد کے میدانی بارانی زمینیں بھی قدرتی طور پر زرخیز تھیں۔صرف پانی کی کمی تھی۔

انگریز جب آیا تو اُس نے کشمور کے مقام سے زرعی مقاصد کے لیے بیگاری کے نام سے ایک نہر کھدوائی۔اس نہر کی ٹیل سے نورواہ کے ذریعے نصیر آباد کے کچھ علاقے بھی سیراب ہونا شروع ہوئے۔

اس کے بعد گڈو ہی سے شاہی واہ نکالی گئی۔شاہی واہ اوراس کی ذیلی شاخوں اوچ اور مانجوٹھی شاخ سے نصیر آباد کے علاقے ملگزار سے جھٹ پٹ تک آباد ہونا شروع ہوئے۔چٹن پٹی سے لیکر جھل مگسی تک برٹش سرکار نے اسے توسیع دی۔دوسری طرف بیگاری واہ سے مغرب کی طرف گنداخہ اور گوٹھ غلام محمد جمالی کے علاقے آباد ہوئے۔

بیگاری واہ اور شاہی واہ غیر دائمی نہریں تھیں۔خریف کے سیزن میں جب بارشوں اور سیلاب کی وجہ سے دریا میں پانی زیادہ ہوتا تھا تو ان نہروں میں بھی کچھ مقدار میں پانی آتا تھا۔ چنانچہ پانی کی اِس دستیابی سے پہلے تالابوں کو بھرا جاتا تھا۔اس کے بعد انسانی خوراک کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ فصلیں کاشت کی جاتیں جنہیں کم پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ان میں جو، جوار، تل، باجرہ اور سرسوں وغیرہ شامل تھے۔

انگریز نے 1857ء کی جنگ آزادی میں شامل یہاں کے لیڈروں دل مراد خان کھوسہ، دریا خان جکھرانڑیں اور سید عنایت شاہ کو گرفتار کر کے کالا پانی بھیجا۔اور ان تینوں قبائل کے ایک لاکھ ایکڑ سے زیادہ زرعی زمین اپنے قبضے میں لے کر اپنے وفاداروں میں تقسیم کی۔

اسی طرح انگریز نے اپنے بے شمار وفاداروں کو خطاب اور ٹائٹل عطا کر دیے۔نام نہیں لوں گا، کسی کو ''خانصاحب''، کسی کو ''ممبر آف برٹش ایمپائر'' MBE، اور کسی کو ''خان بہادر'' کا خطاب عطا کیا۔یوں بہت بڑی زمینیں ان بااثر قبائلی چیفس کے پاس چلی گئیں۔

1932ء میں سکھر بیراج کی تکمیل کے بعد دریائے سندھ کے دائیں کنارے دادو اور رائیس کینال کے ساتھ کیرتھر کینال بھی نکالی گئی۔جیکب آباد کے قریب مولا داد کے مقام پر کیرتھر کینال بلوچستان میں داخل ہوتی ہے۔اسی نہر سے اوستہ محمد کا اندرون کا سارا علاقہ طور پر آباد ہونا شروع ہوا۔

اسی طرح 1967ء کو ایوب دور میں گڈو بیراج سے ''پٹ فیڈر'' نہر نکالی گئی۔یہ ون یونٹ کا زمانہ تھا۔اعلیٰ عہدوں پر سارے افسر پنجاب سے تھے۔پٹ فیڈر کی زمینوں کو آباد کرنے کے نام پر پنجابی آباد کاروں کو آباد کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔چونکہ لاہور ون یونٹ دارالحکومت

تھا۔اس لیے پنجابی آبادکاروں کو پٹ فیڈر میں زمینیں اپنے نام کروانے میں آسانی تھی۔

اوچ کینال 1901ء میں اور مانجوٹھی کینال کی تکمیل 1909ء میں ہوئی۔

زرخیزی اور بہترین پیداوار دینے کی وجہ سے پٹ فیڈر کی زمینوں پر جھگڑے شروع ہوئے۔مقامی کسانوں اور پنجابی آبادکاروں میں مختلف مقامات پر مسلح لڑائیاں ہوئیں۔فیصلہ کن لڑائی موضع بیدار میں ہوئی۔جہاں پنجابی آبادکاروں کا بہت نقصان ہوا۔پنجابیوں کا قائد تاج محمد پنجابی قتل ہوا۔جس کے بعد پنجابی آبادکار بیدار اور بالان شاخ سے نقل مکانی کرنے لگے۔

غیر مقامی آبادکاروں کی بیدخلی کی جدوجہد تک تو سردار، میر، اور معتبر قومی حقوق کی مشترکہ جدوجہد کے نام پر ساتھ ساتھ تھے مگر پنجابی آبادکاروں کی بیدخلی کے بعد نصیر آباد میں طبقاتی کشمکش کا آغاز ہوا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو جب اقتدار میں آیا تو اس نے 20 مارچ 1972ء کو مارشل لا ریگولیشن 115 کے ذریعے ملک میں زرعی اصلاحات کا اعلان کیا۔جس میں اراضی کی حدِ ملکیت خاندان کے بجائے فرد کی بنیاد پر مقرر کی گئی۔

''اب کوئی فرد 150 ایکڑ نہری یا 200 ایکڑ بارانی، یا 15000، پی آئی یو سے زائد زرعی اراضی نہیں رکھ سکے گا''۔یعنی اراضی کی حدملکیت خاندان کے بجائے فرد کی بنیاد پر مقرر کی گئی۔ بڑے زمینداروں سے واگزار ہونے والی زمین بے زمین کاشتکاروں میں مفت تقسیم ہونی تھی۔ آبیانہ، مالیانہ، بیج کی قیمت اور دیگر ٹیکس مزارع یا ہاری کے بجائے زمیندار نے ادا کرنے تھے۔ مزارعین سے بلا معاوضہ خدمت اور جبری لگان کی وصولی پر پابندی لگادی گئی۔ٹریکٹر یا ٹیوب ویل کے مالک زمینداروں کو حدملکیت میں 20000 پی آئی یو کی چھوٹ دی گئی۔تمام شکارگاہیں واپس لے کر کسانوں میں تقسیم کی جانی تھیں۔کسانوں کی یک طرفہ اور ظالمانہ بے دخلیوں پر پابندی لگی۔ بیراجوں کے زیر کاشت آنے والی جو اراضی سرکاری افسروں میں تقسیم ہوئی تھی وہ 100 ایکڑ کو چھوڑ کر باقی واپس لے لی جانی تھی۔

سرکاری یہ زمین کسانوں اور بے زمین مقامی لوگوں کو 32 ایکڑ کے حساب سے دی جانی

تھی۔ مشترکہ خاندان میں کسان اوران کے ایک بالغ بیٹے کی صورت میں 164 ایکڑ سے زائد زمین نہیں دی جائے گی۔ خاندان میں کسان اوران کے دو بالغ بیٹوں کی صورت میں 196 ایکڑ سے زائد زمین نہیں دی جائے گی۔ یہ زمین پہلے سے آباد تصدیق شدہ بے زمین کسان کو دی جائے گی۔ اس کے بعد تحصیل اوراس کے ضلع کے بے زمین کسان کا حق ہوگا۔ اگر زمین حاصل کرنے کے لیے موجودہ زمین سے زیادہ درخواست گزار ہوں گے تو پھر اسی موضع کے لوگوں کے سامنے قرعہ اندازی کی جائے گی۔ زمین کی مقررکردہ قیمت حکومت کے دیئے گئے شیڈول کے مطابق ادا کرنی ہوگی۔

واضح رہے کہ گڈو بیراج کے دائیں طرف دریا کے اوپر کی طرف سے نکلنے والی نہر کا نام ''ڈیزرٹ پٹ فیڈر'' ہے۔ گڈو بیراج سے آخری ہیڈ ریگولیٹر تک پٹ فیڈر کی لمبائی R-D 558 (180 کلومیٹر) ہے۔ (ایک RD ایک ہزار فٹ کے فاصلے کو کہتے ہیں۔ یوں RD 558 کا فاصلہ 180 کلومیٹر بنتا ہے)۔ ہیڈ ریگولیٹر اس مقام کو کہتے ہیں جہاں نہر پر دروازے لگا کر پانی کو شاخوں میں چھوڑا جاتا ہے۔ پٹ فیڈر پر پہلا ہیڈ ریگولیٹر RD/418 پر واقع ''میر حسن ریگولیٹر'' ہے جہاں سے تین شاخیں نصیر شاخ، جھڈیر شاخ اور ٹمپل شاخ نکلتی ہیں۔ ڈیرہ مراد جمالی سے بائیں طرف بیدار ریگولیٹر ہے جس سے قیدی شاخ، محبت شاخ اور بالا شاخ (باری شاخ) نکلتی ہیں۔ اس کے بعد RD/558 کے مقام پر روپا شاخ، عمرانی شاخ اور مگسی شاخ نکلتی ہیں۔

زرعی اصلاحات کے لیے مارشل لاء ریگولیشن 1972,117 اورا یکٹ 1973 کے نفاذ کے فوری بعد پٹ فیڈر کے جاگیردار خاندانوں نے پٹ فیڈر کی زمینوں پر آباد مقامی ہاری خاندانوں کو بے دخل کرنے کی کاروائیاں شروع کردیں۔ قبائلی طور پر کمزور برادریوں کو دھونس ودھمکی اور جھوٹے کیسوں میں پھنسا کر مجبور کیا جانے لگا۔ ان کے گھروں کو آگ لگا کر، گاؤں کے قریب کی نہر میں اپنے آدمیوں کے ذریعے شگاف ڈلوا کر مصنوعی سیلاب کے ذریعے ہاریوں کی زمینوں اور ان کے گھروں کو نہری پانی میں ڈبو کر، نیز قبائلی لشکر کشی کرکے، انہیں زمینوں سے بے دخل کیا جانے لگا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ زمینیں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔

طاقت ورلوگ چاہتے تھے کہ پٹ فیڈر کی وہ زمینیں جن پر کسانوں نے اپنی فصلیں اگائی

ہوئی تھیں اور جو زرعی اصلاحات کے تحت ہاریوں کے نام ہونی تھیں کسانوں سے چھین لی جائیں، اور جھوٹے ناموں سے انہیں ہی الاٹ کی جائیں۔ ایسا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ پٹ فیڈر کی نہری زمینوں پر قبضہ کسانوں کا نہ ہو بلکہ سرداروں، جاگیرداروں اوران کے بٹھائے ہوئے لوگوں کا ہو۔

پیپلز پارٹی کے دورِحکومت میں پٹ فیڈر کے اکثر زمیندار نہ صرف پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے تھے بلکہ وہ پیپلز پارٹی کے رہنما بھی بن گئے تھے۔ اس لئے پٹ فیڈر کے جاگیرداروں کا پارٹی (اور حکومت) کے اندر بھی اثر قائم ہو چکا تھا۔

آیئے ایک کتاب سے ایک ٹکڑا پڑھتے ہیں: ''شیر محمد چانڈیو کی درخواست پر لینڈ ریفارم انچارج جاوید اشرف اوراس کے ساتھی چنیسر خان بروہی اور جاوید اختر لیویز فورس کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے۔ نہر کی شاخ پر ایک پل تھا۔ پل کے پار ایک چھوٹا گاؤں تھا۔ ڈپٹی کمشنر جاوید اشرف نے گاؤں کے لوگوں کو بلوایا۔ دہشت کی فضا تھی۔ لوگ آنے سے کترا رہے تھے، کچھ لوگ آئے۔ ڈی سی نے شیر محمد کی طرف اشارہ کرکے پوچھا اسے پہچانتے ہو؟ لوگوں نے نظریں چرا کراُسے پہچاننے سے انکار کردیا تھا۔ شیر محمد چانڈیو اوراس کے ساتھی اس صورت حال سے بہت پریشان ہوئے۔ شیر محمد چانڈیو نے جاوید اشرف ڈی سی کو کہا کہ یہ سب جاگیرداروں سے ڈرتے ہیں اس لیے یہاں کوئی حق سچ کی گواہی نہیں دے گا۔ ڈی سی نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ یہ زمین تمہاری ہے۔ تم یہاں زرعی پیداوار کرتے تھے۔ لیکن مجھے قانونی طور پر دو گواہوں کی ضرورت ہے۔ چلو میں تم سے یہ رعایت کرتا ہوں کوئی ایک آدمی تو گواہی دے کہ تم یہاں رہتے تھے۔ اس پر شیر محمد نے زور زور سے چلا کر لوگوں کو خدا کے واسطے دیے۔ وہ کھڑے ہوئے لوگوں کا نام لے لے کر ان کی منت سماجت کرتا رہا۔ لیکن لوگوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے بعد شیر محمد نے کہا ڈی سی صاحب ان انسانوں میں سے کوئی میری گواہی دینے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ تب اس نے زور زور سے پکارنا شروع کردیا۔ تھوڑی دیر بعد شیر محمد چانڈیو کا کتا پل کی دوسرے طرف سے دوڑتا ہوا آیا اور شیر محمد چانڈیو کے پیروں میں لوٹنے لگا۔ ڈپٹی کمشنر جاوید اشرف نے کہا افسوس کی بات ہے کہ کوئی انسان

گواہی دینے کے لیے آگے نہیں بڑھا لیکن اس واقعہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تم واقعی یہاں رہتے تھے ۔ میں اس کتے کی گواہی قبول کرتا ہوں اور یہاں کے پلاٹ تمہارے خاندان کے نام کرتا ہوں۔ پھر جاوید اشرف نے لوگوں سے مخاطب ہو کے کہا کہ خدا سے ڈرو، خدا کے واسطے دینے پر بھی تم نے سچ نہیں بولا، آج جو کچھ شیر محمد کے ساتھ ہوا ہے وہ کل تمہارے ساتھ بھی ہوسکتا ہے'' ۔(5)

پیپلز پارٹی میں چونکہ جاگیرداروں اور زمینداروں کی اکثریت تھی انہوں نے اپنی جاگیروں کو بچانے کے نہایت صفائی سے ایک چال چلی۔ اپنی زمینیں اپنے ملازمین، موروثی کسانوں، نوکر چاکروں کے نام الاٹ کرادیں۔ ان کی اکثریت کو اس بات کا پتہ بھی نہ چلا کہ وہ زمین کے مالک ہو گئے ہیں۔ وہ پہلے ہی کی طرح محنت کے بدلے آدھی بٹائی دیتے رہے۔ اصل حق دار اس اصلاحاتی مرحلے میں بھی زمینوں سے محروم رہ گئے۔ زمین انھی جاگیرداروں کے پاس ہی رہی۔

ابھی پٹ فیڈر کے کچھ باشعور کسانوں نے زرعی اصلاحات کے تحت ملنے والی زرعی زمینوں پر اپنا قبضہ مستحکم نہیں کیا تھا اور پہلی فصل کی آمدنی ہی حاصل کی تھی کہ جنرل ضیاء الحق کا مارشل لا لگ گیا۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُن کسانوں کا کیا بنا ہوگا۔

پٹ فیڈر نہر کی جھٹ پٹ شاخ کا مشہور نام قیدی شاخ ہے۔ یہاں موضع جھڈیر کے گاؤں نور محمد جمالی (موجودہ نام میر گل موسیانی) ہے۔ اس کے کسانوں نے جمالی جاگیردار خاندان کو آدھی بٹائی دینے یا زمینوں کا قبضہ چھوڑنے کے بجائے اپنی بہتر قانونی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جدوجہد کا عدالتی راستہ اختیار کرنا شروع کردیا جس کی وجہ سے وہاں کے کسانوں کو فائدہ ہونے لگا۔

پٹ فیڈر کے جاگیرداروں نے بھٹو حکومت کے خاتمے اور ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری کے بعد زرعی زمینوں پر اپنا مالکانہ دعویٰ، اسسٹنٹ کمشنر ٹمپل ڈیرہ کے پاس پرانے ریکارڈ کے مطابق دائر کر کے زرعی اصلاحات میں کسانوں کو حاصل شدہ زرعی زمینوں سے اپنے مالک ہونے کی وجہ سے آدھی بٹائی دلوانے کی درخواستیں دے دیں۔

اسسٹنٹ کمشنر جاگیرداروں کے حق میں فیصلہ کر رہا تھا جس میں یہ حکم ہوتا کہ آدھی بٹائی جاگیردار کو ادا کیے بغیر کسان اپنی فصل نہیں اٹھا سکتا اور اکثر کسانوں کی فصلوں کے ڈیرے متنازعہ قرار دیکر لیویز کے پہرے میں دے دیے گئے۔

اسسٹنٹ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے کسان دشمن غیر قانونی فیصلے کے خلاف درخواست گزار بلوچستان ہائی کورٹ میں اپنی پٹیشن ڈپٹی کمشنر، جاگیردار کے خلاف دائر کرتے رہے جس کے نتیجے میں بلوچستان ہائی کورٹ کے جسٹس جناب ایم اے راشد اور جسٹس جناب عبدالقادر کسانوں کے حق میں آرڈر جاری کرتے رہے۔(6)

ظفر اللہ جمالی نے گاؤں کے بڑے اور کسانوں کی نمائندگی کرنے والے سفید ریشوں کو پیش کش کی کہ وہ علاقے کے کسانوں کی سرپرستی اور نمائندگی چھوڑ دیں اور وہاں سے منتقل ہوجائیں۔ گاؤں میں ان کے خاندان کو جو زمینیں ملیں اس کے بدلے میں اُن کے خاندانوں کو کسی اور علاقے میں زمینیں دی جائیں گی اور اس کے علاوہ گھر وغیرہ بنانے کے لیے نقد رقم بھی دی جائے گی ۔مگر راہنماؤں نے یہ پیش کش ٹھکرا دی اور فیصلہ کن انداز میں کہا کہ جب حکومت زرعی اصلاحات کا قانون ختم کر کے ہمارے نام الاٹ زمینوں کے بلاک منسوخ کرے گی تو پھر جرگے میں فیصلہ کریں گے۔

سب سے پہلے جمالی فیوڈل کے لشکر نے ٹریکٹر ٹرالیوں، موٹر سائیکلوں، جیپوں اور 200 مسلح افراد کے ساتھ پر حملہ کیا اور کسانوں کی کٹی ہوئی فصل ٹریکٹر ٹرالیوں میں بھرنے لگے۔ گاؤں کے لوگ مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوگئے جس کی وجہ سے جمالیوں کا لشکر بغیر فصل اٹھائے چلا گیا۔

جمالی جاگیردار اپنے چند مسلح لوگوں کے ساتھ ایک پیر و مرشد کو لے کر آ گیا۔ پیر نے کسانوں کو سمجھایا کہ وہ زمینوں کا قبضہ ختم کردیں کیوں کہ یہ زمینیں کئی نسلوں سے جمالی خاندان کی ہیں' خدا نے ان کو دی ہیں۔ ہمارے فیصلے عدالتوں اور قانون کے ذریعے نہیں ہوتے بلکہ بلوچی رسم و رواج کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہم لوگ خون کے فیصلے بھی آپس میں بیٹھ کر کرتے ہیں ۔تم لوگ زمینوں کے فیصلے عدالتوں سے کروا کر عدالتوں کو بلوچی رسم و رواج کے فیصلے سے زیادہ اہمیت دے

رہے ہو۔ مجھے پتہ ہے کہ یہ زمینیں خاندانی طور پر جمالی قبیلے کی ہیں ۔ ان کو سنبھالنے والے ہاری ہمیشہ جمالی جاگیردار کے بھائی رہے ہیں ۔ آپ بھٹو کے کہنے پر جس کی حکومت ختم ہوچکی ہے اور جو خود ابھی جیل میں ہے اپنے بھائیوں سے لڑرہے ہو، ایک کاغذ کے ٹکڑے کی بنیاد پر اپنے بڑوں سے بغاوت کررہے ہو۔ یہی تمہارے اپنے لوگ ہیں ان کے ساتھ جرگے میں فیصلہ کرو۔ میں اور ظفر اللہ جمالی تمہارے پاس میٹر لے کر آئے ہیں۔

پیر صاحب کی تجویز کو بھی کسانوں نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ حکومت نے زمینیں ہمارے نام کی ہیں ، بلوچستان ہائی کورٹ نے بھی ہمارے حق میں فیصلہ دیا ہے ۔ اس لیے زمینیں واپس جمالیوں کو دینے کے لیے ہم جرگہ نہیں کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد کسانوں اور آنے والے جمالیوں کے مسلح لوگوں کے درمیان تکرار تیز ہوگئی، دونوں طرف سے اسلحہ نکل آیا۔ ظفر اللہ جمالی اور اس کا گروہ مع پیر صاحب کسانوں کے نرغے میں آگئے اور فائرنگ شروع کردی ۔ فوراً ڈپٹی کمشنر ٹمپل ڈیرہ ملک سرور ریزرو پولیس کا دستہ لے کر کسانوں کے گاؤں میں سفید جھنڈے اٹھا کر داخل ہوا۔ اس کے بعد پیر صاحب فائرنگ روکنے کے لیے نرغے سے باہر آیا۔ یوں ڈپٹی کمشنر ظفر اللہ جمالی اور اس کے مسلح گروہ کو کسانوں کے نرغے سے بحفاظت نکال کرلے گیا۔(7)

اس واقعہ کے تقریباً 15 دن بعد 20 دسمبر 1977ء کو مختلف راستوں اور سمتوں سے جمالی جاگیرداروں کے جمع کردہ تین چار سو افراد پر مشتمل لشکر نے گاؤں میر گل موسیانی کے گرد جمع ہوکر گاؤں کو گھیرے میں لے لیا۔ اور مورچہ بندی کرکے فائرنگ شروع کردی۔ واضح رہے کہ 20 اور 21 دسمبر 1977ء کو محرم الحرام کی 9 اور 10 تاریخ تھی ۔ گاؤں کے سربراہ میر گل موسیانی شہداد کوٹ اپنے رشتہ داروں سے ملنے گیا ہوا تھا اس لئے وہ گاؤں سے باہر ہی رہا۔ گاؤں کے اور کئی لوگ اپنے دکانوں یا ملازمتوں کی وجہ سے ٹمپل ڈیرہ یا دیگر علاقوں میں ہونے کی وجہ سے گاؤں سے باہر ہی رہ گئے۔ جمالیوں کے لشکر کا مقابلہ صرف گاؤں کے اندر موجود لوگوں نے کیا۔ لوگوں نے اپنے گھروں کو مورچہ بنالیا۔ گاؤں والے جس تالاب سے پینے کا پانی لیتے تھے وہ کچھ فاصلے پر گاؤں

سے باہر تھا اس لیے پینے کے پانی کا تالاب جاگیرداروں کے فائرنگ کی زد میں آ گیا۔ گاؤں کے اندر موجود پانی اور خوراک بچا بچا کر گاؤں والے مقابلہ کرتے رہے۔ جب کہ جاگیرداروں کے کھانے کے لیے باقاعدہ دیگیں پک رہی تھیں ۔ گاؤں کے اندر عورتیں اور بچے خوراک اور پانی کے لیے ترس رہے تھے۔

21 دسمبر 1977ء کے دن بھی گاؤں میر گل موسیانی، جاگیرداروں کے لشکر کے نرغے میں رہا۔ گاؤں سے باہر میر گل موسیانی صدر پاکستان جنرل ضیاءالحق سمیت پورے ملک، صوبے اور ضلع کی انتظامیہ کو ٹیلیگرام اور فون کے ذریعے گاؤں کے کسانوں پر جاگیرداروں کی مسلح لشکر کشی بند کرنے کے لئے درخواستیں اور اپیلیں کرتا رہا لیکن کوئی گاؤں والوں کو بچانے نہیں آیا۔

پھر 21 دسمبر کی شام میر گل موسیانی اور گاؤں سے باہر رہ جانے والے دوسرے لوگ جاگیرداروں کے لشکر سے بچتے بچاتے چھپ چھپا کر اپنے گاؤں کے قریب کے دوسرے گاؤں میں چلے گئے اور دوسرے گاؤں کے کسانوں سے اپیلیں کیں، لوگوں کو بتایا کہ ہمارے گاؤں پر اگر جمالی جاگیرداروں کا قبضہ ہوگیا تو ہماری زمینیں اور عزتیں دونوں محفوظ نہیں رہیں گی، مگر اس کے بعد آپ لوگ بھی محفوظ نہیں رہ سکیں گے، ہمارے بعد آپ کی بھی باری آسکتی ہے۔

رفتہ رفتہ اردگرد کے دوسرے گاؤں کے بہت سارے لوگ اپنا اسلحہ لے کر میدان میں آگئے ۔ انھوں نے جاگیرداروں کے لشکر پر گاؤں کے باہر سے میدان میں مورچے بنا کر فائرنگ شروع کردی ۔ اب جب کہ جاگیرداروں کے لشکر پر میر گل موسیانی گاؤں کے اندر سے اور باہر کے مختلف علاقوں سے فائرنگ ہونے لگی تو جاگیرداروں کا لشکر سخت مصیبت میں پھنس گیا، میدانِ جنگ کا نقشہ تبدیل ہوگیا۔ گاؤں میر گل موسیانی کے کسان، ان کی عورتیں اور بچے پانی اور خوراک کے بغیر جاگیرداروں کے مسلح لشکر اور فائرنگ کے نرغے میں پھنس گئے تھے تو گاؤں سے باہر گاؤں والوں پر فائرنگ کرنے والا جاگیرداروں کا مسلح لشکر قرب و جوار کے دیگر گاؤں کے کسانوں کے فائرنگ کی زد میں آ گیا۔ یعنی گاؤں میر گل موسیانی کے کسانوں کو نرغے میں لینے والے جاگیرداروں کا لشکر اب دوسرے گاؤں کے کسانوں کے نرغے میں آ گیا۔

21اور 22دسمبر 1977ء کی درمیانی شب سارا علاقہ میدانِ جنگ بن گیا۔

جاگیرداروں کے لشکر کو رات کے اندھیرے میں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔مختلف سمتوں سے اندھا دھند گولیاں چل رہی تھیں۔

کسانوں کی جانب سے رحمت اللہ،عبدالحق،زرق جان اور عبدالکریم شہید ہوگئے۔

جاگیرداروں کے ہاتھوں دس سے زائد کسان قتل ہوئے۔

اس جنگ کے دوران زخمی ہونے والوں میں بارہ سالہ بچہ خیر محمد اور جوانوں میں خدابخش اور حمدان شامل تھے۔اس وقت لاپتہ ہونے والوں میں امیر حمزہ عبدالرزاق غلام رسول،اللہ ڈنو،اور دیگر تین افراد شامل تھے۔(8)

بعدازاں خان آف قلات داؤد خان کی سربراہی میں منعقد ہونے والے جرگے میں فیوڈلوں نے اپنے لشکر کے صرف ایک زخمی کا اعلان کیا۔

نیمروز کسان

ستر ہی کی دہائی میں افغانستان میں زرعی اصلاحات کے تحت 44ہزار بے زمین بلوچ' زمین کے مالک بنادیا دیے گئے۔7فروری1979ء کے ہفت روزہ ''سوب'' کابل' میں اس کا ذکر اِن خوبصورت الفاظ میں کیا گیا ہے:

''نیمروز ایک زمانے میں بڑے شہری مراکز کا علاقہ ہوا کرتا تھا۔اور یہ مدنیت عہدِ وسطیٰ سے قائم تھی۔اس کی ساری آبادی زراعت سے وابستہ رہی ہے۔یہ علاقہ فیوڈلوں نے اپنے قبضے میں کررکھا تھا۔نیمروز میں ایک ملین جریب زرعی زمین 40ہزار خاندانوں کے ہاتھ لگ گئی۔ایسے ایسے جاگیردار بھی تھے جن کے پاس اکیاون ہزار جریب زمین تھی اور ہزاروں بزگر اُن کی خدمت کیا کرتے تھے۔پھر بھی ان جاگیرداروں سے اس زمین کی کاشت مکمل نہ ہوسکتی تھی اور ہر سال ہزاروں جریب کاشت سے رہ جاتے تھے۔

''علاقہ کے کسان اپنے بال بچوں کی کفالت کے لیے بیرونی ممالک جاکر محنت مزدوری پر مجبور تھے۔چونکہ سرداری نظام کی مشینری پرانی ہوچکی ہے۔یہ سردار لوگ بہت مقروض ہوتے

گئے۔پھر کسانوں کے بیرون ملک جانے سے بھی ان کی زرعی پیداوار کم ہوتی گئی۔

''افغان انقلابی حکومت نے زمین کی جمہوری اصلاحات کیں اور بے زمین کسانوں میں زمین مفت بانٹ دی۔اسی آٹھویں فرمان کے ذریعے نیمروز کے 44ہزار خاندان زمین کے مالک بن گئے''۔

******

بہتری کی راہیں

1۔بھرپور کاشت کاری کے لیے آبادی و آبادکاری بہت ضروری ہے۔خانہ بدوش اور ''کاشروڑی'' لوگ کبھی بھی زراعت نہیں کرسکتے۔اس لیے لوگوں کی مستقل آبادکاری،ان کے خیموں کو کمروں میں تبدیل کرنے اور الگ تھلگ رہنے والوں کو شہر اور قصبوں کی صورت میں اکٹھا اور مستقل آباد کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

2۔ انفراسٹرکچر مہیا کرنا۔منڈی قائم کرنے اور ان منڈیوں کو کھیتوں کے ساتھ سڑکوں کے ذریعے پرودیے بغیر زراعت کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔صرف یہی نہیں بلکہ ناترس منڈی کے اندر کاشتکار کا خیال رکھنا ضروری ہے۔اس لیے کہ قلعہ نما پہاڑ تو ہمارے باپ دادا کی میراث ہیں۔مگر منڈی تو شیطانی جگہ ہوتی ہے اور وہاں شیطان کے چیلوں کا قبضہ ہے۔مال کی اچھائی اور کمتری کی بات ہے۔ارزانی اور گرانی دیکھنی ہوتی ہے۔موسم اور بے موسمی تفریقات ہیں اور مانگ اور رسد کا کالا قانون ہے۔اس لیے منڈی میں ہمارے کسان کے مفادات کا تحفظ بہت ضروری ہے۔

3۔کاشتکاروں کو زراعت کے متعلق بنیادی معلومات مہیا کرنے ضروری ہیں۔یہ کہ وہ کون سی فصل کس وقت کس طرح کاشت کریں۔کس کس وقت پانی لگائیں،کون سی کھاد اور اُسے کب استعمال کریں۔کون سی فصل کی قیمت زیادہ ہے اور کہاں قیمت زیادہ ہے۔

4۔اچھا بیج،کھاد،کرم کش ادویات کی سپلائی کے ایسے مراکز بنانے کی ضرورت ہے جو نزدیک بھی ہوں،سستے بھی اور بے رشوت وسفارش وجنجال بھی۔

5۔فرٹیلائزراورزرعی ادویات کی قیمت میں 50 فیصد کمی کرنا۔

6۔ پانی کا بندوبست کرنا۔اس سلسلے میں کاریز، کنواں، ٹیوب ویل، چشمہ اورندیوں کو ڈویلپ کرنا۔۔یوں آبی زراعت کوفروغ دینا۔

7۔دریاؤں اورندیوں پر بند باندھنا، ٹیوب ویل کے علاقوں میں ڈیلےایکشن ڈیم بنانا۔

8۔ٹریکٹر، تھریشر، بلڈوزریعنی مشینی کاشت کاری کورواج دینا۔

9۔زرعی اجناس کی قیمت بڑھانا۔

10۔ بڑے پیمانے کی زرعی اصلاحات کرنا۔جس میں بڑے جاگیرداروں اورغیر حاضر زمینداروں کی زمین ضبط کرنااورکسانوں کے درمیان مفت تقسیم کرنا۔

11۔کاشتکاروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے جمہوری اصولوں پر کسان کمیٹیاں بنانا۔

12۔معاشی اصولوں پر چلتے ہوئے زراعت کوآپریٹو قائم کرنا۔مشینی کاشت کی ترقی کے لیے تحقیقی مراکز کھولنا، موجود زرعی فارموں کی کارکردگی بہتر بنانا، اورکسانوں کونئی ٹیکنالوجی سے واقف کرنے کے لیے پروگرام بنانا۔

13۔ دیہی علاقوں میں زراعت کے ساتھ بندھی صنعتوں کا قیام اورلوگوں کوروزگار دینا۔ڈبہ بندی پیکنگ کی صنعت کوصوبے میں ترقی دینا ہوگا۔ضروری کولڈسٹوریج اورمربہ، اچار کی سہولتیں موجود ہوں۔

ریفرنسز

1۔امروہوی، خیال۔مزدک۔کلاسیک دی مال۔لاہور۔صفحہ 41

2۔امروہوی، خیال۔مزدک۔کلاسیک دی مال۔لاہور۔صفحہ 16

3۔براؤن، ایڈورڈگرین ولی۔اےلٹریری ہسٹری آف پرشیا۔1902۔صفحہ 171

4۔انورپیرزادو۔کلچرہیریٹیج آف سندھ۔2015ء۔پیکاک پبلشرکراچی۔صفحہ 154

5۔محمدرمضان۔پٹ فیڈرکسان تحریک۔2009۔بھنڈاراہاری سنگت۔صفحہ 28

6۔محمدرمضان۔پٹ فیڈرکسان تحریک۔2009۔بھنڈاراہاری سنگت۔صفحہ 35

7۔محمدرمضان۔پٹ فیڈرکسان تحریک۔2009۔بھنڈاراہاری سنگت۔صفحہ 39

8۔محمدرمضان۔پٹ فیڈرکسان تحریک۔2009۔بھنڈاراہاری سنگت۔صفحہ 48